

دارالمطالعہ
تحریک اسلامی مرفاع

اسلامی تہذیب

اور

اُس کے اصول و مبادی

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۳۱-سی، شاہ عالم مارکیٹ لاہور (پاکستان)

(جلد حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

- طالع ۱۔ _____ پر وقیر محمد امین جلدید رنگ ڈانکٹر
 ناشر ۱۔ _____ اسٹاک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
 ۱۳، سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور
 مطبع ۱۔ _____ مازن پرنٹرز لاہور

اشاعت:

۲۰۰۰	اکتوبر ۱۹۹۶ رنگ	۲۰۰۱
۱۱۰۰	نومبر ۱۹۹۷ جلد	۲۱
۱۱۰۰	پیر پیک	۲۲

قیمت: عبدالعلی پبلیکیشن ۱۲۰/- روپے

پیر پیک پبلیکیشن ۶۳/- روپے

فہرست

۴	۱۔ عرض ناشر
۶	۲۔ مقدمہ
۱۳	۳۔ باب اول
۱۳	دنیوی زندگی کا اسلامی تصور
۶۰	۴۔ باب دوم
۶۱	زندگی کا نسب الہی
۱۰۱	۵۔ باب سوم
۱۰۳	انسانی افکار و عقائد
۱۰۴	۱۔ ایمان کی حقیقت و اہمیت
۱۱۸	۲۔ اسلام کے ایمانیات
۱۴۸	۳۔ ایمان باللہ
۱۷۱	۴۔ ایمان بالرسول
۱۸۰	۵۔ ایمان بالکتاب
۲۱۶	۶۔ ایمان بالیوم الآخر
۲۳۷	۷۔ ختم
۳۲۳	زندگی بعد موت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرض ناشر

ہدیہ تعلیم یافتہ حضرات کی ایک بڑی تعداد اسلامی تہذیب کے بارے میں بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ کچھ اس کو اسلامی ثقافت کے ہم مستحق سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کو مسلمانوں کی عادات و رسومات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ بہت کم ایسے حضرات ہیں جو لفظ تہذیب کا صحیح مفہوم سمجھتے ہیں اور اس سے بھی کم وہ حضرات ہیں جو اسلامی تہذیب کا صحیح مفہوم سمجھتے ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس دیوبند کے ہدیہ تعلیم یافتہ ذہن کو سامنے رکھ کر اپنے مخصوص علمی اور تحقیقی انداز میں اس موضوع پر قلم اٹھا یا ہے۔ آپ نے نہ صرف ان تمام غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے جو ان ذہنوں میں موجود ہیں بلکہ اچانک طور پر اسلامی تہذیب کو نہایت واضح اور متقن صورت میں پیش کیا ہے۔

اپنے بلند پایہ مضامین کی وجہ سے یہ کتاب ملک و بیرون ملک کے علمی حلقوں سے خواہجہ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف یونیورسٹیوں کے طلباء خصوصاً ایم۔ اے اسلامیات و فلسفہ کے طلباء اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مولانا موصوف کے دوسرے دور امیری (۱۹۵۷ء) میں نظر ثانی کے بغیر شائع کیا گیا تھا۔ آپ کی رہائی کے بعد ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۲ء میں دوسرا اور تیسرا نظر ثانی شدہ ایڈیشن شائع کیا گیا۔ اب اس کتاب کا یہ ایڈیشن آفسٹ کی نفیس طباعت

کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔
 ہمیں امید ہے کہ بلند پایہ کتب کے شائقین اس کو پسند فرمائیں

ۛ

اردو کی مشہور
 مطابق ہر پریس

میں بک ڈال کر

اسلامک پبلیکیشنز، لاہور۔

بَیِّنَاتُ التَّحْرِجِ مِنَ التَّحْقِیْقِ

مقدمہ

مغربی مصنفین، اور ان کے اثر سے مشرقی اہل علم کا بھی ایک بڑا گروہ یہ رائے رکھتا ہے کہ اسلام کی تہذیب اپنے ماقبل کی تہذیبوں اور خصوصاً یونانی و رومی تہذیب سے ماخوذ ہے، اور وہ ایک جداگانہ تہذیب صرف اس وجہ سے بن گئی ہے کہ عربی ذہنیت نے اس پر اپنے مواد کو ایک نئے اسلوب سے ترکیب دے کر اس کی ظاہری شکل و صورت بدل دی ہے۔ یہی نظریہ ہے جس کی بنا پر یہ لوگ اسلامی تہذیب کے عناصر ترکیبی، ایرانی، بائبل، سریانی، فیثقی، مصری، یونانی اور رومی تہذیبوں میں تلاش کرتے ہیں، اور پھر عربی خاصاً جس میں اس ذہنی عامل کا سراغ ملتا ہے۔ جس نے ان تہذیبوں سے اپنے ڈھنگ کا مسالہ لے کر اسے اپنے ڈھنگ پر ترتیب دیا۔

غلط فہمی

لیکن یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے۔ میں اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ ہر زمانہ میں انسان کا حال اس کے ماضی سے متاثر ہوتا ہے، اور ہر نئی تعمیر میں کچھ تعمیروں کے مواد سے کام لیا جاتا ہے، مگر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی تہذیب اپنی ذات و جوہر میں خالص اسلامی ہے اور کسی غیر اسلامی موثر کے اثر کا اس میں قوت برابر دخل نہیں ہے، البتہ عرضی امور میں عربی ذہنیت، عربی روایات اور ماقبل اور مابعد

کی تہذیبوں کے اثرات ضرور داخل ہو گئے ہیں۔ عمارت میں ایک چیز تو اس کا نقشہ، اس کا مخصوص طرز تعمیر، اس کا مقصد اور اس مقصد کے لئے اس کا مناسب و مطابق ہونا ہے، اور یہی اصل و اساس ہے دوسری چیز اس کا رنگ و روغن، اس کے نقش و نگار، اس کی زینت و آرائش ہے، اور یہ ایک جزوی و فروغی چیز ہے۔ پس جہاں تک اصل و اساس کا تعلق ہے۔ اسلامی تہذیب کا قصر کلیۃً اسلام کی اپنی تعمیر کا نتیجہ ہے۔ اس کا نقشہ اس کا اپنا ہے، کسی دوسرے نقشے کی مدد اس میں نہیں لی گئی ہے۔ اس کا طرز تعمیر خود اسی کا ایجاد کردہ ہے، کس دوسرے نمود کی نقل اس میں نہیں کی گئی ہے۔ اس کا مقصد تعمیرِ رُحانی ہے، کوئی دوسری عمارت اس مقصد کے لئے نہ اس سے پہلے تعمیر کی گئی اور نہ اس کے بعد۔ اسی طرح اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جس قسم کی تعمیر ہونی چاہیے تھی اسلامی تہذیب ٹھیک ویسی ہی ہے اس مقصد کے لئے جو کہ اس نے تعمیر کر دیا اس میں کوئی بیرونی جہد و ترمیم کی قدرت رکھتا ہے اور نہ اضافہ کی۔ باقی رہے جزئیات و فروع تو اسلام نے ان میں بھی دوسروں سے بہت کم استفادہ کیا ہے حتیٰ کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی بیشتر اسلام کے اپنے ہیں۔ البتہ مسلمانوں نے دوسروں سے رنگ و روغن، نقش و نگار اور زینت و آرائش کے سامان لے کر اس میں اضافہ کر دیئے اور وہی دیکھنے والوں کو اتنے نمایاں نظر آئے کہ انہوں نے پوری عمارت پر نقل کا حکم لگا دیا۔

تہذیب کا مفہوم

اس بحث کا فیصلہ کرنے کے لئے سب سے پہلے اس سوال کا تہذیب ہونا ضروری ہے کہ تہذیب کس چیز کو کہتے ہیں؟ لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کی تہذیب نام ہے۔ اس کے علوم و آداب، فنون لطیفہ، صنائع

وہدائے اطوار معاشرت، اندازِ تمدن اور طرزِ ریاست کا۔ مگر حقیقت میں یہ نفسِ تہذیب نہیں ہیں، تہذیب کے تنازع و مظاہر ہیں۔ تہذیب کی اصل نہیں ہیں، شجرِ تہذیب کے بلکہ بارہوں۔ کسی تہذیب کی قدردانی و قیمت ان ظاہری صورتوں اور فائشی مہوسات کی بنیاد پر متعین نہیں کی جاسکتی۔ ان سب کو چھوڑ کر ہمیں اس کی روح نکال کر چھپنا چاہیئے اور اس کے اساسی اصول کا تجسس کرنا چاہیئے۔

تہذیب کے عناصر ترکیبی

اس نقطہ نظر سے سب سے پہلی چیز جس کا کسی تہذیب میں کھوج لگانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی کے متعلق اس کا تصور کیا ہے؟ وہ اس دنیا میں انسان کی کیا حیثیت قرار دیتی ہے؟ اس کی نگاہ میں دنیا کیا ہے؟ انسان کا اس دنیا سے کیا تعلق ہے؟ اور انسان اس دنیا کو کیسے سمجھتا ہے؟ یہ تصور حیات کا سوال ایسا اہم سوال ہے کہ انسانی زندگی کے تمام اعمال پر اس کا نہایت گہرا اثر ہوتا ہے، اور اس تصور کے بدل جانے سے تہذیب کی نوعیت بڑا بڑا طور پر بدل جاتی ہے۔

دوسرا سوال جو تصور حیات کے سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ زندگی کے نصب العین کا سوال ہے۔ دنیا میں انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ ساری تلک و دو، یہ تمام کشمکش، یہ سب جدوجہد اور فحش و مشقت آخر کیسے لیتے ہیں؟ وہ کیا چیز مطلوب ہے جس کی طرف آدمی کو دوڑنا چاہیئے؟ وہ کونسا معیار ہے جس تک پہنچنے کے لئے ایہ کوشش کرنی چاہیئے؟ وہ کونسا غنیمت ہے جسے انسان کو اپنی ہر سعی اور اپنے ہر عمل میں ہمیشہ نظر رکھنا چاہیئے؟ یہی مقصود و مطلوب کا سوال انسان کی عملی زندگی کا نڈھ اور اس کی رفتار متعین کرتا

ہے، اور اسی کے مطابق عمل کے طریقے اور کامیابی کے وسائل اختیار کئے جاتے ہیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ زیر بحث تہذیب میں انسانی سیرت کی تعمیر کن بنیادی عقائد و افکار پر مبنی ہے؟ انسان کی ذہنیت کو وہ کس طرح سنبھالنے میں ڈھالتی ہے؟ انسان کے دل و دماغ میں کس قسم کے خیالات جاگزیں کرتی ہے؟ اور اس میں وہ کون سے محرکات ہیں جو اس کے نسب، ایمان کے مطابق انسان کو ایک مخصوص قسم کی عملی زندگی کیلئے آمادہ کرتے ہیں؟ بہت سی بحث کی غلج نہیں ہے کہ انسان کے قوتِ عمل کے قوائے فکر کے تابع ہیں۔ اس کے دست و پا کو جو روح حرکت دیتی ہے وہ اس کے دل و دماغ سے آتی ہے۔ دل و دماغ پر جو عقیدہ، جو تخیل، جو مشکورہ و پوری قوت کے ساتھ مسلط ہوگا، عملی قوتیں اسی کے اندازِ حرکت کریں گی۔ ذہن جس سانچہ میں ڈھلا ہوگا اسی کے مطابق ہڈیاں، مہلات اور داعیات پیدا ہوں گے، اور انہی کے اجتماع میں اعضاء جماعت کام کریں گے۔ پس دنیا کی کوئی تہذیب ایک ایسا ہی عقیدہ اور ایک بنیادی تخیل کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی، اور اس بنا پر تہذیب کو سمجھنے اور اس کی قدر و قیمت جانچنے کے لئے اس عقیدہ اور تخیل کو سمجھنا اور اس کے حسن و قبح کو جانچنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی عمارت کی مضبوطی و پائیداری کا حال معلوم کرنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کی بنیادی کتنی گہری اور کتنی مضبوط ہیں۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ وہ تہذیب انسان کو بحیثیت ایک انسان کے کس طرح کا آدمی بناتی ہے؟ یعنی وہ کس قسم کی اخلاقی تربیت ہے جس سے وہ انسان کو اپنے فکر و عمل کے مطابق کامیاب زندگی بسر کرنے کیلئے تیار کرتی ہے؟ وہ کون سے خصائص، اوصاف اور نفسی خصوصیات ہیں جن

وہ انسان میں پیدا کرنے اور نشوونما دینے کی کوشش کرتی ہے۔ اور اسکی مخصوص اخلاقی تربیت سے انسان کیسا انسان بنتا ہے؟ گو تہذیب کا اصل مقصد نظام اجتماعی کی تعمیر ہوا کرتا ہے، لیکن غریب ہی وہ مسالہ ہوتے ہیں جن سے جماعت کا تصرف بنتا ہے اور اس تصرف کا احکام اس پر مخصوص ہوتا ہے کہ اس کا ہر فقر اچھا تر شا ہوا ہو، ہر اینٹ خوب ہلکی ہوئی ہو، ہر شہیر مضبوط و پائیدار ہو، کوئی سڑکی گھن گھائی ہوئی نہ ہو، اور کسی صفہ میں ناکارہ، کچا اور بے جان مسالہ استعمال نہ کیا جائے۔

پچھواں سوال یہ ہے کہ اس تہذیب میں انسان اور انسان کا تعلق اس کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے کس طرح قائم کیا گیا ہے؟ اس کے تعلقات اس کے حامیان سے، اس کے ہمسایوں سے، اس کے دوستوں سے، اس کے ساتھ رہنے والوں سے، اس کے مانتوں سے، اس کے باا دستوں سے، خود اس کی اپنی تہذیب کے پیروں سے، اور اس کی تہذیب کی پیروی نہ کرنے والوں سے کس قسم کے رکے گئے ہیں؟ اس کے حقوق دوسروں پر اور دوسروں کے حقوق اس پر کیا قرار دیئے گئے ہیں؟ اس کو کن حدود کا پابند کیا گیا ہے؟ اس کو آزادی دی گئی ہے تو کس حد تک، اور مقید کیا گیا ہے تو کس حد تک؟ اس سوال کے ضمن میں اخلاق، معاشرت، قانون، سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کے تمام مسائل آجاتے ہیں۔ اور اسی سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ زیر بحث تہذیب خاندان، سوسائٹی اور حکومت کی تنظیم کس ڈھنگ پر کرتی ہے۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ تہذیب جس چیز کا نام ہے۔ اس کی سکھوں پانچ عناصر سے ہوتی ہے۔
۱۔ دنیوی زندگی کا تصور۔

۱۔ زندگی کا نصب العین۔

۲۔ اسامی عقائد و افکار۔

۳۔ تربیت افراد۔

۴۔ نظام اجتماعی۔

دنیا کی ہر تہذیب انہی پانچ عناصر سے بنی ہے، اور اسی طرح اسلامی تہذیب کی تکوین بھی انہی سے ہوئی ہے۔ اس کتاب میں میں نے اسلامی تہذیب کے پہلے تین عناصر کا جائزہ لے کر بتایا ہے کہ یہ تہذیب زندگی کے کس جنسوس تصور، کس خاص مقصد حیات، اور کس اسامی عقائد و افکار پر قائم کی گئی ہے، اور انہوں نے کس طرح اسے دنیا کی تمام تہذیبوں سے الگ ایک امتیازی شکل دے دی ہے۔ اس کے بعد آخری دو عناصر باقی رہ جاتے ہیں۔ جن سے اس کتاب میں بحث نہیں کی گئی ہے۔ ان میں سے ”تربیت افراد“ کے موضوع پر تو میری کتاب ”اسلامی برادرات پر ایک تحقیقی نظر“ اور ”خطبات“ (خطبہ نمبر ۲ تا ۲۸) کا مطالعہ مفید ہوگا۔ دہا ”نظام اجتماعی“ کا عنوان، تو اس کا ایک اجمالی نقشہ میری ان تقریروں میں مل جائے گا جو ”اسلام کا نظام حیات“ کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

لے مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لیمیٹڈ لاہور۔

• • • • •
• • • • •

باب اول

دنیوی زندگی کا اسلامی تصور

- ۱۔ انسان کی حقیقت۔
- ۲۔ کائنات میں انسان کا درجہ۔
- ۳۔ انسان نائپ خدا ہے۔
- ۴۔ منصبِ نبیاء کی تشریح۔
- ۵۔ زندگی کا اسلامی تصور۔
- ۶۔ انسان نائپ خدا ہے ذکرِ ملک۔
- ۷۔ دنیا میں کامیابی کی اولین شرط۔
- ۸۔ دنیا پرستی کے لئے ہے۔
- ۹۔ دنیوی زندگی کا مآل۔
- ۱۰۔ اعمال کی ذمہ داری اور جواب دہی۔
- ۱۱۔ انفرادی ذمہ داری۔
- ۱۲۔ زندگی کا فطری تصور۔
- ۱۳۔ مختلف مذاہب کے تصورات۔
- ۱۴۔ اسلامی تصور کی خصوصیت۔

دُنوی زندگی کا اسلامی تصور

انسان کو ابتداء سے اپنے متعلق بڑی غلط فہمی رہی ہے اور اب تک اس کی یہ غلط فہمی ہے۔ کبھی وہ افراط پر اُترتا ہے تو اپنے آپ کو دُنیا کی سب سے زیادہ بلند ہستی سمجھ لیتا ہے۔ غرور و تکبر اور سرکشی کی ہوا اس کے دماغ میں بھر جاتی ہے۔ کسی طاقت کو اپنے سے بالاتر کیا معنی اپنا مد مقابل بھی نہیں سمجھتا۔ مَنَ اَشَدَّ مِنَّا قُوَّةً اور اَنَا رَبُّكُمْ اِلَّا ظَنُّی کی سدا بلند کرتا ہے اور اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور طرہ جواب دہ سمجھ کر جبر و قہر کا دیوتا، ظلم و جور اور شر و فساد کا بھڑکنا ہوا ہے کبھی تفریط کی جانب مائل ہوتا ہے تو اپنے آپ کو دُنیا کی سب سے زیادہ ذلیل ہستی سمجھ لیتا ہے۔ ددخت، پتھر، دریا، پہاڑ، جانور، ہوا، آگ، بادل، بکلی، چاند، سورج، تارے، طرغی ہر اس چیز کے سامنے گرد و خاک جھکا دیتا ہے جس کے اندر کسی قسم کی طاقت یا منفرت یا منفعت نظر آتی ہے، اور خود اپنے جیسے آدمیوں میں بھی کوئی قوت دیکھتا ہے تو ان کو بھی دیوتا اور معبود مان لینے میں تامل نہیں کرتا۔

انسان کی حقیقت

اسلام نے ان دونوں انتہائی تصورات کو باطل کر کے انسان کی اصلی حقیقت اس کے سامنے پیش کی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ خَلْقًا مِنْ مَّاءٍ

كَافٍ فَيُخْرِجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالذَّرَائِبِ (علاق)

”انسان اپنی حیثیت تو دیکھے کہ گھبراہٹ سے پیدا ہوا ہے؟ ایک
اچھے ہونے والے سے جو پشت اور سینہ کی ٹہریوں کے درمیان سے نکلتا
کر آتا ہے؟“

أَوَلَمْ يَرِ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ لُطْفَةٍ فَإِذَا
هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ وَخَرَّبْنَا مِثْلًا وَلِئِنْ خَلَقْنَا
(نقص علی/ ۷۷)

”کیا انسان یہ نہیں دیکھتا کہ ہم نے اس کو ایک لطیفہ سے
بنایا ہے، اور اب وہ کلمہ کلمہ حریف بناتا ہے اور ہمارے بچے بنائیں
دیجاتے اور اپنے اصل کو بھول گیا ہے؟“

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ
مِنْ سُلاَلَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَسَخَ
فِيهِ مِّنْ لَّحْمٍ وَجَبَدَ (اسماءہ - کدو ۱)

”انسان کی ابتدا مٹی سے ہوئی، پھر اس کو ایک چھڑی سے جو ایک چھڑی سے
ہے اس کی نسل بھائی، پھر اس کی بناوٹ درست کی اور اس میں لاش
دفع ہو گئی؟“

فَرَأَيْنَا خَلْقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ
مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَوَّاهُ مُخَلَّقَةً
يَكْبِيتُ لَكَ، وَكَفِّرْ فِي الْأَسْخَامِ مَا نَسَا إِلَى أَجَلٍ
مُّسَقًّى ثُمَّ نُخْرِجُكَ طِفْلاً ثُمَّ لِتَبْلُغَ أَشُدَّكَ كُمْ
وَمِنْكُمْ مَّنْ يَكُونُ وَمِنْكُمْ مَّنْ يَزِدُّ وَإِلَى أَشَدِّ
الْعُصْرِ يَكِيلُ لَا يَعْلَمُ مِنْ تَعْلَمُ وَلَمْ يَلْمِ شَيْئاً

”جمنے ام کو مٹی سے، پھر قلوا آب سے، پھر لڑوں کے اور لڑے سے، پھر پری اور ادمی کی مٹی ہوئی ہوئی سے پیدا کیا تا کہ تم کو اپنے قدرت و کمال کا اندازہ ہو سکتے ہو۔ اور ہم میں لطف کو چاہتے ہیں ایک نسبت مقربہ تک رحم مادر میں شیرائے سکتے ہیں، پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں، پھر تم کو شہر کا جوانی کر دیتے ہیں۔ تم میں سے کوئی وفات پا جاتا ہے اور کوئی ہزاروں عمر کو پہنچ جاتا ہے کہ سمجھو جو حاصل کرنے کے بعد پھر تائب ہو جائے۔“

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّبَكَ بِمَوْلَاكَ الْكَافِرِ الَّذِي
خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ فِي آتِي مَسْوَءٍ وَنَحَاشَاءَ
رَبِّكَ۔ (الانفطار: ۶/۸)

”اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے رب کی مٹی سے مخلوق کیا؟ اسے سب سے بھی سب سے تجھے پیدا کیا، تیرے اعزاء و دوست کیے و شریعت کوئی میں اعتدال پیدا کیا اور میں سورتوں چاہا تیرے عناصر کو ترکیب دی۔“

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ
شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ الشَّعْرَ وَالْأَيْصْنَ وَالْأَنفَ سِدًّا
لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ (النحل: ۱۵)

”اور اللہ ہی نے تم کو تہا دی میں کے بیٹوں سے نکالا۔ جب تم نکلے تو اس مال میں تھے کہ تم کو بھی نکالتے تھے۔ اس نے تم کو کالہ و سفید، آنکھیں وری، دل و صیغہ، شاید کہ تم شکر کرو۔“

أَفَرَأَيْتُمْ مَا كُفِّرُوا ۖ عَنْ أَشْرِكُمْ تَخْلُقُونَهُمْ
أَفَرَأَيْتُمُ الْغَالِبِينَ ۖ هَؤُلَاءِ قَدْ نَسُوا آيَاتِنَا لَعَلَّكُمْ
تَتَذَكَّرُونَ۔ (الغالب: ۱-۲)

وَنُفِثَكُمْ فِي مَالٍ تَعْلَمُونَ ۖ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ
الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَدَابُّرُنَا أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ
ۚ أَأَنْتُمْ مَرْسَلُونَ ۚ أَمْ رَحْمَةُ الرَّحْمَنِ ۚ أَأَنْتُمْ
لَجَعَلْتُمْ سُلْطَانًا فَأَمَّا أَفْلَكُمُ تَكْفُرُونَ ۚ إِنَّا لَنُظَرُّهُنَّ
بَلْ نَحْنُ مُحَرِّضُونَ ۚ أَفَرَأَيْتُمُ الْهَاءَ الَّتِي
تُشْرَبُونَ ۚ ؕ أَأَنْتُمْ أَتْرَفْتُمُوهَا ۚ سِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ
الْمُزْنُونَ ۚ نَوْشَكُمُ لَجَعَلْتُمْ أُجَابًا فَلَوْلَا تَتَذَكَّرُونَ
ۚ أَفَرَأَيْتُمُ الْكَاءَ الَّتِي تُشْرَبُونَ ۚ ؕ أَأَنْتُمْ أَكْثَرُ
شَجَرَتِهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنْشُونَ ۚ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَدَكُّرًا
وَمَنَاعًا لِّلْمُتَرَدِّينَ ۚ فَتَنَّبَحُوا بِسُورَةِكَ الْعُتُورِ ۚ

اٹل کو دکھا جسے تم شکلاتے ہو، وہ درختوں سے بھائی ہاتھ
 ہے، اس کو تم نے پیدا کیا ہے یا پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے
 اس کو ایک یاد دلانے والی چیز اور مسافروں کے لئے سلامتی
 زیت بنا دیا ہے۔ پس اے انسان اپنے خدائے بزرگ کی تسبیح کر
 ﴿وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ
 إِلَّا إِلَهُا، فَلَمَّا نَجَّيَاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ
 وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا ۚ أَفَأَمْسِكُمْ إِذَا فُتِّقْتُمْ
 بِكُمُ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا شَكُّ
 لَا تَجِدُوا لَكُمْ وَجْهًا ۚ أَمْ أَمْسِكُمْ أَنْ يُبْعِدَ كُفْرُ
 فِيهِ شَأْنًا ۚ أَمْ أُخْرِي فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ
 السَّيْحِ فَأُفْجِرَكُمْ بَيْنَ كَفْرِكُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ
 عَلَيْكُمْ شَيْعًا﴾ (جنی اسراء: ۶۷-۷۶)

مہربان سمندر میں تم پر طوفان کی مصیبت آئی تو تم اپنے سب
 معبودانِ باطل کو بھول گئے اور اس وقت خدایِ یاد آیا۔ پھر جب
 اس نے تم کو بہا کر خشکی پر پہنچا دیا تو تم پھر امراض کی تدبیر پر
 اتر گئے۔ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔ کیا تم اس سے بے خوف
 ہو گئے کہ خدا تم کو زمین میں دھنسا دے یا تم پر ہوا کا طوفان بھیج دے
 اور تم کوئی اپنا مددگار نہ پاؤ؟ کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے کہ خدا
 تم کو دوبارہ اس سمندر میں لے جائے اور تم پر ہوا کا ایسا ہلکا دھج
 دے جو تمہیں تہلہ لے کر آسمان کے بسے میں غرقاب کر دے اور پھر
 تم ہمارا بھیجا کسے والا کوئی حاکم نہ پائے۔

ان آیات میں انسان کے غرور و تکبر کو توڑا گیا ہے۔ اسے اس
 طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ خدا اپنی حیثیت کو دیکھ۔ ایک شخص اور حیرت

پانی کا قطرہ جو رجم مادر میں مختلف قسم کی کھاستوں سے پرورش پا کر گوشت کا ایک لو تھڑا بنتا ہے۔ خدا چاہے تو اس لو تھڑے میں جان ہی بٹھالے اور وہ یونہی غیر مشکل حالت میں خارج ہو جائے۔ خدا اپنی قدرت سے اس لو تھڑے میں جان ڈالتا ہے، اس میں حواس پیدا کرتا ہے اور ان آلات اور ان قوتوں سے اس کو مسلح کرتا ہے جن کی انسان کو دنیوی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح تو دُنیا میں آتا ہے۔ مگر تیری ابتداء اُٹھی حالت یہ ہوتی ہے کہ تو ایک بے بس بچہ ہوتا ہے جس میں اپنی کوئی ماحبت پوری کرنے کی قدرت نہیں ہوتی۔ خدا ہی نے اپنی قدرت سے ایسا سناٹا کیا ہے کہ تیری پرورش ہوتی ہے، توڑتا ہے، جو ان ہوتا ہے، طاقتور اور قادر ہوتا ہے۔ پھر تیری قوتوں میں انحطاط شروع ہوتا ہے۔ تو جوانی سے بڑھاپے کی طرف جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک وقت میں تجھ پر عمر دہی بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو بچپن میں تھی۔ تیرے حواس جواب دے دیتے ہیں۔ تیری قوتیں ضعیف ہو جاتی ہیں۔ تیرا جسم نیا مٹیا ہوا ہوتا ہے۔ اور آخر کار تیری شمع حیات بجھ جاتی ہے۔ ماں، اولاد، عزیز، دوست، اقارب سب کو چھوڑ کر قبر میں جا پہنچتا ہے۔ اس مختصر عرصہ حیات میں تو ایک لو کے لئے جس اپنے آپ کو زندہ رکھنے پر قادر نہیں ہے۔ تجھ سے بالاتر ایک قوت ہے جو تجھ کو زندہ رکھتی ہے اور جب چاہتی ہے تجھ کو دنیا چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پھر جتنی مدت تو زندہ رہتا ہے، قوانین قدرت سے جکڑا رہتا ہے۔ یہ ہوا اور پانی، یہ روشنی، یہ حرارت، یہ زمین کی پیداوار، یہ قدرتی ساز و سامان جن پر تیری زندگی کا انحصار ہے، ان میں سے کوئی بھی تیرے بس میں نہیں۔ نہ تو ان کو پیدا کرتا ہے، نہ یہ تیرے احکام کے تابع ہیں۔ یہی چیزیں جب تیرے خلاف آگاہ ہو کر ہوجاتی ہیں تو تو اپنے آپ کو

کے مقابلے میں بے بس پاتا ہے۔ ایک ہوا کا جھکڑ تیری بہتیوں کو ترو
 باد کرتا ہے۔ ایک پانی کا طوفان تجھے غرقاب کر دیتا ہے۔ ایک نلکے
 کا جھکا تجھے بیوقوف خاک کر دیتا ہے۔ تو خواہ کتنے ہی اکاوت سے مسلح ہو،
 اپنے علم سے (جو خود بھی تیرا اپنا پیدا کیا ہوا نہیں ہے) کیسی ہی تیرے کیا
 ایسا ہو کرے، اپنی عقل سے (جو خود بھی تیری اپنی حاصل کردہ نہیں ہے)
 کیسے ہی ساز و سامان مہیا کرے، قدرت کی طاقتوں کے سامنے یہ
 سب چیزیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اس بل بھرتے پر اکڑا ہے
 چھوڑ نہیں سکتا، کسی طاقت کو خاطر میں نہیں لاتا، فرعونیت اور خردیت
 کا دم بھرتا ہے، تیار و قہار بناتا ہے، ظالم و سرکش بناتا ہے، خدا کے
 مقابلے میں بغاوت کرتا ہے، خدا کے بندوں کا مہمود بناتا ہے اور خدا
 کی زمین میں فساد پھیلاتا ہے۔

کائنات میں انسان کا درجہ

یہ تو حق ٹھکر شکنی۔ دوسری طرف اسلام نوح بشر کو بتاتا ہے کہ وہ
 انما ذلیل ہیں نہیں ہے جتنا اس نے اپنے آپ کو سمجھ لیا ہے۔ وہ
 کہتا ہے:-

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَخَلَقْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ
 وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى
 كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (نہا سرائیل۔۔)

اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو نیک اور تری
 میں سواراں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت
 سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں ان کو ایک طرح کی فضیلت
 عطا کی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اٰمَلًا سَخِرَ لَعْنَةُ مَا فِي

الہامیہ (الحجۃ)

”اسے انسان کیا تو نہیں دیکھنا کہ اللہ نے ان سب چیزوں کو جو

زمین میں ہیں، تمہارے لئے مصلح بنا دیا ہے۔“

”اور جانوروں کو پیدا کیا جن میں تمہارے لئے سردی سے

حفاظت کا سامان ہے اور منفعتیں ہیں اور ان میں سے بعض

کو تم کھاتے ہو۔ ان میں تمہارے لئے ایک نشانِ جمال ہے

جب کہ تم صبح ان کو لے جاتے ہو اور شام واپس لاتے ہو۔

وہ تمہارے بوجھ ڈھو کر اس مقام تک لے جاتے ہیں جہاں

تک تم بغیر جانساکا ہی کے نہیں پہنچ سکتے۔ تمہارا رب بڑا مہربان

اور رحم کرنے والا ہے۔ گھوڑے اور غنہ اور گیسے تمہاری سواری

کے لئے ہیں اور سامانِ رست ہیں۔ خدا اور بہت سی چیزیں

پیدا کرتا ہے جن کا تم کو علم بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہی ہے

جس نے آسمان سے پانی اتارا، اس میں سے کچھ تمہارے پینے

کے لئے ہے، اور کچھ درختوں کی پودوں کی پودوں کے کام آتا ہے جن

سے تم اپنے جانوروں کا چارہ حاصل کرتے ہو۔ اس پانی

سے خدا تمہارے لئے کھیتی اور انگور اور طرح طرح کے پھل

اگاتا ہے، ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو

غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اسی نے تمہارے لئے رات

اور دن اور سورج اور چاند اور تلکے مسخر کئے ہیں۔ یہ سب

اسی خدا کے حکم سے مسخر ہیں۔ ان میں نشانیاں ہیں اسی

لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور بہت سی وہ

مختلف الالوان چیزیں جو اس نے زمین میں تمہارے لئے پیدا

کی ہیں، ان میں سبق حاصل کرنے والوں کے لئے نئی نشانی

ہے۔ اور وہ خدا ہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کیا کہ اس سے تم تازہ گوشت (پھل) نکال کر کھاؤ، اور زیت کا سامان (موتی و صدف) نکالو جن کو تم پہنتے ہو۔ اور تودیکھتا ہے کہ کشتیاں پانی کو جرتی ہوئی سمندر میں بہتی چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ سمندر کو اس نے بھی مسخر کیا ہے کہ تم لوگ اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی تجلست کرو) شاید کہ تم شکر بجا لاؤ۔ اس نے زمین میں پہاڑ لگا دیئے کہ زمین تم کو لے کر جھک نہ جائے اور دریا اور راستے بنا دیئے کہ تم منزل مقصود کی راہ پاؤ اور بہت سی علامات بنائیں، مگر ان کے بارے میں ہیں جن سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرو تو ان کو بے حساب پاؤ گے۔

(الفصل: ۵/۱۸)

ان آیات میں انسان کو یہ بتلایا گیا ہے کہ زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب قیری خدمت اور فائدہ کے لئے مسخر کی گئی ہیں اور آسمان کی بھی بہت سی چیزیں کا یہی حال ہے۔ یہ درخت، یہ دریا، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ جانور، یہ رات اور دن، یہ تاریکی اور روشنی، یہ چاند، یہ تلے، غرض یہ سب چیزیں جن کو تو دیکھ رہا ہے، قیری خادم ہیں، قیری منفعت کے لئے ہیں، اور قیرے لئے ان کو کارآمد بنایا گیا ہے۔ تو ان سب پر فضیلت رکھتا ہے۔ تجھ کو ان سب سے زیادہ عزت دی گئی ہے، تجھ کو ان کا خدمت بنایا گیا ہے۔ پھر کیا تو اپنے ان غلاموں کے سامنے سر جھکا ہے، ان کو اپنا ماحبت نہا سمجھتا ہے؟ ان کے آگے دست بول دے اور کہتا ہے؟ ان سے اپنی مدد کی التجائیں کرتا ہے؟ ان سے ڈرتا اور خوف کھاتا ہے؟ ان کی عظمت و بزرگی کے گیت گاتا ہے؟ اس طرح

تو اپنے آپ کو خود ذلیل کرتا ہے، اپنا مرتبہ آپ گراتا ہے، غلاموں کا غلام، غلاموں کا غلام خود بناتا ہے۔
انسان ناسپ خدا ہے

اس سے معلوم ہوا کہ انسان ذاتاً علی مرتبہ ہے جتنا وہ بزرگم خود اپنے آپ کو سمجھتا ہے اور نہ اتنا پست و ذلیل ہے جتنا اس نے خود اپنے آپ کو بنایا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر اس دنیا میں انسان کا صحیح مرتبہ کیا ہے؟ اس کا جواب اسلام ہی بتاتا ہے۔

”اور جب کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انہوں نے عرض کیا کہ کیا تو زمین میں اُس کو نائب بنالگے جو وہاں فساد پھیلا گا، اور خورجیناں کسے گا؟ مالا کہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تعظیمیں کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور اس نے آدمؑ کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے۔ پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا اگر تم چہ ہو تو ان چیزوں کے نام مجھے بتاؤ۔ انہوں نے کہا پاک ذات ہے تیری، ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھا دیا ہے، تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک ہے۔ خدا نے کہا اے آدمؑ ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتا۔ پس جب آدمؑ نے ان کو ان اشیاء کے نام بتائے تو خدا نے کہا، کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی سب خلق باتیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو اس سب کا علم رکھتا ہوں؟ اور جب ہم نے مالک سے

کہا کہ آدم کو مسجد کو تو ان سب نے مسجد کیا، بجز ابلیس کے کہ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا اور ہم نے آدم سے کہا کہ اسے آدمؑ تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں جہاں سے چاہو نافرمانت کھاؤ مگر اس درخت کے پاس بھی نہ چلکو کہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ مگر شیطان نے ان کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوشمال میں تھے اس سے ان کو نکلوا دیا ۵

(البقرہ ۳۶-۳۷)

”اور جب کہ قرے سب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک کلمے سڑے ہوئے ٹوکے لکڑے سے ایک بشر بنانے والا ہوں پھر جب میں اس میں اپنی روح میں سے کچھ بھونک دوں تو تم اس کے لئے سر بسجود گر جاؤ۔ چنانچہ تمام فرشتوں نے مسجد کیا بجز ابلیس کے کہ اس نے مسجد کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ خدا نے کہا ابلیس! تجھے کیا ہو گیا کہ تو مسجد کرنے والوں میں شامل نہیں ہوتا؟ ابلیس نے کہا میں ایسا نہیں ہوں کہ اس بشر کو مسجد کروں جسے تو نے کلمے سڑے ہوئے ٹوکے لکڑے سے بنایا ہے۔ خدا نے کہا تو جنت سے نکل جا کہ تو رافضی درگاہ ہے اور یوم الجوارح تک تجھ پر پھٹکا ہے ۵“ (الحجر ۳۵/۳۶)

اس مضمون کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے، اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا نائب بنایا، اس کو فرشتوں سے شہرہ کر عظم دیا، اس کے علم کو فرشتوں کی تصحیح و تصدیق پر ترجیح دی، فرشتوں کو حکم دیا کہ میرے اس نائب

کو سجدہ کرو، فرشتوں نے اس کو سجدہ کر لیا، اور اس طرح ملکوتیت اس کے آگے بھٹک گئی، مگر ابلیس نے انکار کیا اور اس طرح شیطانی قوتیں انسان کے آگے دھکیلیں۔ حقیقت میں تو وہ مٹی کا ایک حقیر چمکا تھا مگر خدا نے اس میں جو روح پھونکی تھی اور اس کو جو علم بخشا تھا اس نے اس کو نیابتِ خداوندی کا اہل بنا دیا۔ فرشتوں نے اس کی اس فضیلت کو تسلیم کر لیا، اور اس کے آگے بھٹک گئے، لیکن شیطان نے اس کو تسلیم نہ کیا۔ اس جرم میں شیطان پر لعنت بھیجی گئی، مگر اس نے قیامت تک کے لئے ہمت مانگ لی کہ انسان کو ہکانے کی کوشش کسے چاہیے؟ شیطان نے انسان کو بہکایا، جنت سے نکلوا دیا، اور اس وقت سے انسان اور شیطان میں کشمکش برپا ہے۔ خدا نے انسان سے کہہ دیا کہ جو ہدایت میں پڑے مجھوں اس کو مارنے کا تو جنت میں جانے کا اور اپنے اہل دشمن شیطان کا حکم ماننے کا تو دوزخ تیرا ٹھکانا ہوگا۔

منصبِ نیابت کی تشریح

اس بیان سے چند امور معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ انسان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے خلیفہ کی ہے۔ خلیفہ کتنی ہی نائب کو۔ نائب کا کام یہ ہے کہ جس کا وہ نائب ہے اس کی اطاعت کرے۔ وہ نہ تو اس کے سوا کسی اور کی اطاعت کر سکتا ہے کہ ایسا کرے تو باقی سمجھا جائے گا، اور نہ وہ اس کا پہلا ہے کہ اپنے آقا کی رعیت اور اس کے نوکروں اور غلاموں اور غلاموں کو خود اپنی رعیت، اپنا کوزہ، اپنا غلام، اپنا غلام بنائے کہ ایسا کرے گا تب بھی باقی قرار دیا جائے گا، اور دونوں حالتوں میں سزا کا مستحق ہوگا۔ اس کو جس جگہ بتایا گیا ہے وہیں وہ اپنے آقا کی اطاعت میں تعریف کر سکتا ہے، ان کو استغاثہ کر سکتا ہے، اس کی رعیت پر حکومت کر سکتا ہے، اس سے خدمت لے سکتا ہے،

ان کی نگرانی کر سکتا ہے۔ مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ خود آقا ہے ، اور نہ اس حیثیت سے کہ اس آقا کے سوا کہیں اور کا ماتحت ہے ؛ بلکہ صرف اس حیثیت سے کہ وہ اپنے آقا کا نائب ہے اور جتنی چیزیں اس کے زیرِ حکم میں ان پر اپنے آقا کا اٹن ہے۔ اس بنا پر وہ سچا اور پسندیدہ اور مستحقِ انعام نائب اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اپنے آقا کی امانت میں خیانت نہ کرے ، اس کی ہدایت پر عمل کرے ، اس کے احکام سے سرزبان نہ کرے۔ اس کی لڑاک ، اس کی رعبیت ، اس کے لوگوں ، اس کے حامیوں اور اس کے غلاموں پر حکومت کرنے ، ان سے خدمت لینے ، ان میں تصرف کرنے اور ان کی نگرانی کرنے میں اس کے بنائے ہوئے قوانین پر کاربند ہو۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو نائب نہیں باقی ہوگا ، پسندیدہ نہیں مردود ہوگا ، مستحقِ انعام نہیں مستوجبِ سزا ہوگا۔

فَلَمَّا شَهِدَ هَذَا جِئْنَا فُلَانًا خَوْفًا عَلَيْهِ يَوْمًا فَيَكُونُ لَا يَخْذُ

يَخْذُ كَوْنًا ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ

أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (البقرہ ۱۹۰ / ۱۸)

”تو ہم نے میری ہدایت کی پیروی کی ایسے لوگوں کے لئے ۔

کسی سزا کا خوف اور کسی نامرادی کا رنج نہیں ہے اور جنہوں نے

نامرادی کی اور ہمدی آیتوں کو جھٹلایا وہ آگ میں جا رہے ہوں گے

میں جہنم وہ ہمیشہ رہیں گے“

نائب اور امین خود قمار نہیں ہوتا کہ اپنی مرضی سے جو چاہے کرے ،

اپنے آقا کے مال اور اس کی رعیت میں جیسا چاہے تصرف کرے ، اور

اس سے کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ بلکہ وہ اپنے آقا کے سامنے جواب دہ

ہوتا ہے ، اس کو پائی پائی کا حساب دینا ہوتا ہے ، اس کا آقا اس کی

ہر حرکت کے متعلق سوال کر سکتا ہے ، اور اس کی امانت اس کے مال

اور اس کی رعیت میں اس نے جس طرح تصرف کیا ہے اس کے لئے اس کو ذمہ دار قرار دے کر جوار اور سزا دے سکتا ہے۔

نائب کا اولین فرض یہ ہے کہ جس کا وہ نائب ہے اسکی فرائض اس کی حکومت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو نہ اپنے نائب بھرنے کی حیثیت کو سمجھ سکے گا، نہ اپنے امین بھرنے کے منصب کا کوئی صحیح تصور اس کے ذہن میں پیدا ہوگا، نہ اپنے ذمہ دار اور جواب دہ بھرنے کا احساس کر سکے گا۔ اور نہ اس امانت میں جو اس کے سپرد کی گئی ہے اپنی ذمہ داریاں اور اپنے فرائض صحیح طور پر ادا کرنے کے قابل ہوگا۔ اقل تو یہ ممکن ہی نہیں کہ کبھی دوسرے تحلیل کے تحت انسان وہ طرز عمل اختیار کر سکے جو نیا بت و امانت کے تحلیل کے تحت وہ اختیار کرے گا۔ اور اگر بغرض محال اس کا طرز عمل ویسا ہو بھی تو اس کی کوئی قیمت نہیں کیونکہ آفاقی فرائض اسکی تسلیم کرنے سے انکار کرے گا تو وہ پہلے ہی باغی ہو چکا ہے، اب اگر اس نے اپنے نفس یا کسی اور کے اتباع میں اپنے عمل کیے بھی تو اس کا اجر اس سے طلب کرے جس کا اس نے اتباع کیا ہے، اس کے آفاقی ہاں اس کے وہ اعمال بیکار ہیں۔

انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک حقیر مخلوق ہے، مگر اس کو جو عزت حاصل ہوئی ہے وہ اس نیکو کی بنا پر ہے جو اس میں چھو لگھے گئی ہے اور اس نیابت الہی کی بنا پر ہے جو اسے اس زمین میں عطا کی گئی ہے۔ اب اس عزت کی حفاظت منحصر ہے اس پر کہ وہ شیطان کی بیروی کر کے اپنی نیکو کو گندہ نہ کر دے اور اپنے کپ کو نیابت کے درجے سے گرا کر بنیادوں کے مرتبہ میں نہ لے جائے۔ کیونکہ اسے حالت میں وہ بیروی ایک حقیر ہستی رہ جائے گا۔

ملکوتی طاقتیں انسان کے نائبِ خدا ہونے کو تسلیم کر چکی ہیں اور وہ اس کے آگے بحیثیت نائبِ خدا ہونے کے جھکی ہوئی ہیں مگر شیطانی طاقتیں اس کی نیابت کو تسلیم نہیں کرتیں اور وہ اسے اپنا برا بھلا بھانپتا رہتی ہیں۔ انسان اگر دنیا میں نیابتِ الہی کا حق ادا کرے گا اور خدا کی ہدایت پر چلے گا تو ملکوتی طاقتیں اس کا ساتھ دیں گی۔ ظالم کی فوجیں اس کے لئے اتریں گی۔ وہ عالم ملکوت کو کبھی اپنے سے منفرق نہ پائے گا۔ ان طاقتوں کی مدد سے وہ شیطان اور اس کے لشکروں کو مغلوب کرے گا۔ لیکن اگر وہ نیابت کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا اور خدا کی ہدایت پر نہ چلے گا تو ملکوتی طاقتیں اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی، کیونکہ اس طرح وہ خود اپنے منصبِ نیابت سے دست بردار ہو چکا ہوگا۔ اور جب اس کا ساتھ دیئے والی کوئی طاقت نہ رہے گی اور وہ محض مٹی کا ایک پسلا رہ جائے گا تو شیطانی قوتیں اس پر غالب آجائیں گی۔ پھر شیطان اور اس کے لشکر ہی اس کے جانچنے اور مددگار ہوں گے، انہی کے احکام کی وہ پیروی کرے گا اور انہی کا سامنا ہی اس کا بھی ہوگا۔

نائبِ خدا ہونے کی حیثیت سے انسان کا درجہ دنیا کی تمام چیزوں سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں اس کی ماتحت ہیں اور اس لئے ہیں کہ وہ ان کو استعمال کرے اور اپنے آتما کے بتائے ہوئے طریقہ پر ان سے خدمت لے۔ ان ماتحتوں کے آگے جھکتا اس کے لئے ذلت ہے اگر وہ جھکے گا تو اپنے اوپر آپ ظلم کرے گا اور گویا نیابتِ الہی کے منصب سے خود دست بردار ہو جائے گا۔ لیکن ایک ہستی ایسی ہے جس کے سامنے جھکتا اور جس کی اطاعت کرنا اس کا فرض ہے، اور جس کو سہڑ کرنے میں اس کے لئے عزت ہے۔ وہ ہستی کون ہے؟ خدا اس کا آتما،

وہ جس نے انسان کو اپنا نائب بنایا ہے۔

نوع انسانی کا کوئی مخصوص فرد یا مخصوص گروہ نائب خدا نہیں ہے، بلکہ پوری نوع انسانی نیابت الہی کے منصب پر سرفراز کی گئی ہے اور ہر انسان خلیفہ خدا ہونے کی حیثیت سے دوسرے انسان کے برابر ہے۔ اس لئے کسی انسان کو دوسرے انسان کے آگے جھکا چکا اور کسی کو یہ حق ہے کہ اپنے آگے جھکنے کا کسی دوسرے انسان سے مطالبہ کرے۔ ایک انسان دوسرے انسان سے صرف اس چیز کا مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ آقا کے حکم اور اس کی ہدایت کی پیروی کرے۔ اس معاملہ میں پیروی کرنے والا آمر ہوگا اور پیروی نہ کرنے والا مأمور، کیونکہ جو نیابت کا حق ادا کرتا ہے وہ حق نیابت ادا نہ کرنے والے سے افضل ہے۔ مگر فضیلت کے معنی یہ نہیں کہ وہ خود اس کا اقتدار ہے۔

نیابت اور امانت کا منصب ہر انسان کو خفياً خفياً حاصل ہے اس میں کوئی مشرک و مرداری نہیں ہے۔ اس لئے ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس منصب کی ذمہ داریوں کے بارے میں جوابدہ ہے۔ نہ ایک پر دوسرے کے فعل کی جواب دہی عائد ہوتی ہے، نہ ایک کو دوسرے کے فعل کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے، نہ کوئی کسی کو اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر سکتا ہے، اور نہ کسی کی غلط روی کا وہاں دوسرے پر اثر ہو سکتا ہے۔ انسان جب تک زمین میں ہے اور جب تک مٹی کے پتے (جسد انسانی) اور خدا کی چھوٹی بھٹی نور میں تعلق باقی ہے اس وقت تک وہ خدا کا نائب ہے۔ یہ تعلق منقطع ہوتے ہی وہ خلافت الہی کے منصب سے الگ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نیابت کے افعال و اعمال کی پانچ پرتوں میں پانچ ہیں، اس کے بعد جو امانت کی گئی تھی اس کا سائبان

ہونا چاہیئے، اس پر نائب ہونے کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں مالک کی
 مافی تھیں ان کی تحقیقات ہونی چاہیئے کہ اس نے ان کو کس طرح انجام دیا۔
 اگر اس نے نہیں، خیانت، نافرمانی، بغاوت اور نافرمانی شناسی کی ہے تو
 اس کو سزا مافی چاہیئے، اور اگر ایمان داری، فرض شناسی، اطاعت کوئی
 سے کام کیا ہے تو اس کا انجام بھی ملنا ضروری ہے۔

زندگی کا اسلامی تصور

اسی لفظ خلافت و نیابت سے ایک اور اہم نکتہ کی طرف بھی اشارہ
 نکلتا ہے۔ نائب کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کی اطاعت میں اس کی
 پابندی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے اور جہاں تک ممکن ہو ان میں اس
 شان کا تعریف کرے جس شان کا تعریف خود خالق مالک کرتا ہے۔ بادشاہ
 اگر اپنی رعیت پر کسی شخص کو اپنا نائب بنائے تو اس کیلئے اپنے منصب
 نیابت کے استعمال کا بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ رعیت کی خبر گیری، شفقت،
 مہربانی، حفاظت، عدل اور سب موقع مافی کرنے میں وہی سیرت
 اختیار کرے جو خود بادشاہ کی سیرت ہے اور بادشاہ کی اطاعت اور اس
 کے اموال میں ویسی ہی حکمت، تدبیر، داناائی اور احتیاط سے تعریف
 کرے جس سے خود بادشاہ ان میں تعریف کرتا ہے۔

پس جب انسان کو خدا کا عظیم اور نائب قرار دیا گیا تو اس کے
 معنی یہ ہوئے کہ انسان خدا کی نیابت و خلافت کا پورا حق اسی وقت
 ادا کر سکتا ہے جب خدا کی مخلوق کے ساتھ برتاؤ کرنے میں اس کے
 روش بھی ویسی ہی ہو جیسی خود خدا کی روش ہے۔ یعنی جس شان
 پر ہیبت کے ساتھ خدا اپنی مخلوق کی خبر گیری اور پرورش کرتا ہے ویسی
 ہی شان کے ساتھ انسان بھی اپنے محدود دائرہ عمل میں ان چیزوں پر
 خبر گیری اور پرورش کرے جو اللہ نے اہل کے قبضہ قدرت میں دی ہیں۔

اسی مرتبہ میں شانِ رحمانی و رحیمی کے ساتھ خدا اپنی ملکیت میں تعریف کرتا ہے، جس شانِ مدد کے ساتھ خدا اپنی مخلوقات میں نظم قائم کرتا ہے، جس شانِ رحم و کرم کے ساتھ خدا اپنی صفتِ قہر و جبر کا اظہار کرتا ہے۔ چھوٹے پیمانہ پر اسی شان کے ساتھ انسان بھی خدا کی اُس مخلوق کے ساتھ معاملہ کرے جس پر اللہ نے اس کو حکومت بخشی ہے اور جسے اس کے لئے مسخر کیا ہے۔ یہی مفہوم ہے جو تَخْلُقُوا بِالْخَلْقِ اَللّٰہِ کے حکیمانہ جملہ میں ادا کیا گیا ہے۔ مگر یہ اعلیٰ اخلاقی مرتبہ صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انسان اس بات کو اپنی طرف سے سمجھ لے کہ وہ اس دنیا میں کوئی خود مختار فرمانروا نہیں ہے بلکہ اس کے حقیقی فرماں روا کا نائب ہے، اور یہی نیابت کا منصب ہے جو دُنیا کی تمام اشیاء حقیقی خود اپنے جسم اور جسمانی و نفسانی قوتوں کے ساتھ اس کے تعلق کی حیثیت اور حدود حقیقیں کرتا ہے۔

منصبِ نیابت کی تشریح میں یہ جتنے نکات بیان ہوئے ہیں ان سب کی تفصیل قرآن مجید میں موجود ہے جس سے دُنیا اور انسان کے باہمی تعلق کا ہر پہلو روشن اور واضح ہوتا ہے۔

انسان نائب ہے نہ کہ مالک
کہا گیا ہے کہ۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَہٗ اَلَا تَرٰہُمْ فِیْ مَا
یَنْفَعُکُمْ فَوْقَ بَعْضِ مَا کُفِّرَتْ عَنْکُمْ فِیْ مَا
اَنْفَعُکُمْ۔ (الانعام، ۱۶۶)

”وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض سے اچھے سے دینے تاکہ اگر تم کو دینا ہے اس میں تمہاری کفایت نہ ہو۔“

قَالَ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنْهُمْ إِنَّكَ عَدُوٌّ لِّكَ وَكَرِهٌ لِّنَفْسِكَ
 فِي الْآخِرِينَ فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (الاحزاب: ۱۲۹)
 ”موتی گئے بنی اسرائیل سے کہا قریب ہے کہ خدا تمہارے
 دشمن کو ہلاک کرے اور تمہیں زمین کی خلافت دے بلکہ دیکھے تم
 کیسے عمل کرتے ہو“

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا خُذُوا زِينَتَكُمْ مَّا فِي الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّمَنِ
 يَحْتَسِبُ النَّاسُ بِأَلْعَنَىٰ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ
 سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الدَّوِينَ يَضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ
 لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ يَنَاسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ
 (مائدہ: ۴۶)

”اے مومنان! ہم نے تم کو زمین میں اپنا اثاب بنالیا ہے پس تم
 لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کرو اور اپنے خواہش غصے
 کی پیروی نہ کرو کہ تمہیں اللہ کے راستے سے ہٹا دے گی۔ جو لوگ
 اللہ کے راستے سے ہٹک جاتے ہیں۔ ان کے لئے اس بنا پر عذاب
 عذاب ہے کہ وہ حساب کے دن کو ٹھل گئے

أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَاكِمِينَ (البقرہ)
 ”کیا اللہ تمام مالکوں کا حاکم نہیں ہے؟“

إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ (الانعام: ۵۷)
 ”حکومت اللہ کے سوا کہیں کی نہیں ہے“

قُلْ لِّلَّهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ يُؤْتِي ٱلْمُلْكَ مَن يَشَآءُ
 وَيُؤْخِرُ ۚ إِنَّ الْمُلْكَ يَمَن يَشَآءُ وَيُؤْخِرُ مَن
 يَشَآءُ وَيُؤْخِرُ مَن يَشَآءُ (الاکاف: ۲۸)

”کہو کہ اللہ! ملک کے ملک انہیں کو چاہتا ہے ملک دیتا

ہے اور جس سے چاہتا ہے بھی دیکھ ہے اور جس کو چاہتا ہے معز کرنا
ہے اور جس کو چاہتا ہے ڈال کر دیتا ہے۔

إِشْعُرُوا مَا أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ قَوْمٌ يُبْكَرُوا وَلَا يُنْكَبُونَ
قَوْمٌ كَاذِبُونَ أُولَٰئِكَ أَوْلَىٰ أَعْيُنُكُمْ (الاحزاب: ۴)

”جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے ہدایت بھی
گئی ہے صرف اسی کی پیروی کرو اور اس کے سوا جو سب کادمانوں
کی پیروی نہ کرو۔“

قُلْ إِنِّي صَلَوَاتِي وَتُسْلُوبِي وَغِيَايَ وَمَسَائِي وَلِيَّ
مَدِينَةِ الْعَالَمِينَ۔ (الاحزاب: ۱۶۳)

”کہو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میری زندگی اور میری
سوت سب خلیفہ کے جو سب عالمین کے۔“

یہ آیات بتاتی ہیں کہ دنیا میں جتنی چیزیں انسان کے زیر تصرف اور
زیر علم ہیں سچی کہ خود اس کا نفس بھی اسکی ملک نہیں ہے۔ اصل مالک
اور حاکم اور فرماں روا خلیفہ ہے۔ انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان چیزوں
میں مالکانہ تصرف کرے اور من مانے طریقوں سے ان کو استعمال کرے
اس کی حیثیت دنیا میں صرف نائب کی ہے اور اس کے اختیار کی حد
بہت اتنی ہے کہ خدا کی ہدایت پر چلے اور اس کے بتائے ہوئے طریقوں
کے مطابق ان چیزوں میں تصرف کرے۔ اس حد سے تجاوز کر کے اپنے
نفس کی پیروی کرنا یا فرمانروائے حقیقی کے سوا کسی اور فرماں روا کے
پیروی کرنا بغاوت اور گمراہی ہے۔

دنیا میں کامیابی کی اولین شرط
کہا گیا کہ۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِآلِهَا طَلِبُوا الْبَاطِلَ وَكَفَرُوا بِآلِهَا طَلِبُوا الْبَاطِلَ

هَذَا الْخَيْرُ مِنَ - (الحکمت: ۵۲)

”اور جو کچھ باطل پر ایمان لائے اور اللہ سے کفر کیا۔ وہی

دراصل نقصان میں ہے۔“

وَمَنْ يُؤْتِهَا ذِكْرًا مِّنْ لَّدُنَّا مِنَّا وَنَبِيًّا يَمُوتُ وَهُوَ
كَافِرٌ فَكَوْنُكَ حَبِطْتَ أَغْمَالُكُمْ فِي الدُّنْيَا وَ
الْآخِرَةِ - (البقرہ: ۲۱۷)

”تم میں سے جو کوئی اپنے رب سے نبی کی اطاعت سے بھر گیا

اور اس حال میں مرا کہ وہ کافر تھا تو اسے تمام لوگوں کے اعمال
دنیا اور آخرت میں اکارت گئے۔“

وَمَنْ يُكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ
وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخُسِرَانِ - (التائہ: ۵)

”اور جو کوئی ایمان لانے سے انکار کرے اس کا عمل فنا ہو گیا۔

اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہے۔“

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نائبِ خدا ہونے کی حیثیت سے

فرضی زندگی میں انسان کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ جس کا وہ نائب

ہے اس کی غرواں روحانی تسلیم کرے۔ اور دنیا میں جو کچھ کرے یہ کچھ

کرے کہ میں خدا کا نائب اور اس کا زمین ہوں۔ اس حیثیت کو تسلیم

کئے بغیر خدا کی ملکیت میں وہ جس قدر تصرف کرے گا وہ محض اغیارہ

تصرف ہوگا۔ اور یہ قاعدے کی بات ہے کہ باغی اگر کسی ملک پر تصرف

ہو کر بہتر کارگزداری بھی دکھائے تب بھی ملک کی اصلی حکومت اسکے

میں عمل کو تسلیم نہ کرے گی۔ بادشاہ کی نگاہ میں باغی بہر حال باغی ہوگا،

خواہ اس کی ذاتی سیرت اچھی ہو یا بُری، خواہ بغاوت کر کے اس نے

ملک میں اچھی طرح تصرف کیا ہو یا بُری طرح۔

دنیا بدلتے کیلئے ہے کہا گیا کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِن ثَمَرِ هَٰذَا إِذَا جَاءَ رِجْسُ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمُ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۚ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَن تَقُولُوا خُلِ اللَّهُ بِمَا لَا تَعْلَمُونَ۔ (البقرہ: ۱۶۸/۱۶۹)

”اے لوگو! جو کچھ زمین میں حلال اور پاک ہے اس میں سے کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا دشمن و دشمن ہے۔ وہ تو تمہیں بھلائی اور نیکی کا اور تمہارے سامنے جس میں باتیں کہنے کا حکم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحْزَنُوا طَبَقَاتٍ مَّا آخَلُ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۚ وَكُلُوا مِن ثَمَرِ هَٰذَا إِذَا جَاءَ رِجْسُ الشَّيْطَانِ ۚ وَكُلُوا مِن ثَمَرِ هَٰذَا إِذَا جَاءَ رِجْسُ الشَّيْطَانِ ۚ وَكُلُوا مِن ثَمَرِ هَٰذَا إِذَا جَاءَ رِجْسُ الشَّيْطَانِ ۚ (البقرہ: ۸۸/۸۹)

”اے ایمان والے! غم نہ کرو اور نہ سوچو کہ اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں۔ ان کو اپنے اوپر حرام نہ کرو، اور جسے بھی نہ کرو کہ اللہ سے گھبرائے اور اس کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان پاک اور حلال چیزوں میں سے کھاؤ جو اللہ نے تمہیں عطا کی ہیں۔ اور اس خدا کے غضب سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔“

قُلْ مَن حَرَّمَ رِجْسُ الشَّيْطَانِ الَّذِي آخَرُ يَحْبُو ۚ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّجْسِ ۚ (الاعراف: ۳۲)
”کہو کہ کس نے اللہ کی اس نیت کو حرام کیا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے حلال ہے اور کس نے پاک رزق کو حرام کر دیا

ہے ۹۰

يَا مَعْزُومِي الْمَعْرُوفِ وَيَنْتَهِمُ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَيُجِلُّ لِقَاءَ الطَّيِّبِ وَيُخَوِّمُ عَلَيْهِ الْقَبَائِثَ
وَيَضَعُ غَضَبَهُ اسْتَرْهَمَهُ وَالْأَعْلَى أَلْفِي كَانَتْ
عَلَيْهِمْ (الاعراب - ۱۱۵)

”یہ مایوس و محروم کی کوئی کامیابی نہ ہو، اور بدی سے روکنا ہے۔
اور ان کے لیے پاک چیزیں طلال اور ناپاک چیزیں حرام کرنا ہے۔
اور ان پر سے اس بوجھ اور ان بدشگونوں کو دور کرنا ہے۔ جو ان پر
تھیں۔“

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْضُوا قَرْضًا قَصْداً
مَرَّةً بَعْدَ مَرَّةٍ (البقرہ - ۱۹۸)

”تمہارے لیے اس میں کوئی حرج نہیں کہ اپنے سب کا قرض
(یعنی کاروبار کے لیے) سے بدلی (کالاں کرو)۔“

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَأْتُمْ عَنِهَا مَا كَتَبْنَا عَلَيْهَا
إِلَّا ابْتِغَاءَ بِرِّكُمْ فِيهَا (المائدہ - ۲۰)

”اور رہبانیت کا طریقہ جو مسیح کے پیروؤں نے نمودار کیا
تھا۔ یہ انہوں نے محض تمہاری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیا تھا
وہ ہم نے ان پر نہیں رکھا تھا۔“

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ
وَإِلَاسٍ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ
لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا
أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلَّغُوا أَمْرًا أُولَٰئِكَ هُمُ
الْغَافِلُونَ (الاعراب - ۱۷)

”ہم نے جنم کے لئے جو چیزیں ہیں اور انسان پیدا کئے ہیں۔
 ان کے پاس مل رہی مگر ان سے سوچتے بگتے نہیں اور ان کے پاس
 آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے پاس کان ہیں مگر ان
 سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ
 گئے گورے۔ یہی لوگ غفلت میں ہیں۔“

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ انسان کا کام دُنیا کو چھوڑ دینا نہیں ہے،
 نہ دُنیا کوئی ایسی چیز ہے کہ اس سے پرہیز اور حذر کیا جائے، اس سے
 ڈر بھاگا جائے، اس کے کاروبار، اس کے معاملات اس کی نعمتوں
 اور اس کی لذتوں اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا جائے۔ یہ دُنیا انسان
 ہی کے لئے بنائی گئی ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ اس کو بچتے اور
 خوب رہتے مگر بے ادبیت، پاک اور ناپاک، مناسب اور نامناسب
 کے فرق کو ملحوظ رکھ کر بچتے بچاتے اس کو آنکھیں دیں اس لئے
 کہ وہ ان سے دیکھے۔ کان دیتے ہیں کہ ان سے سُنے۔ عقل دی ہے کہ
 اس سے کام لے۔ اگر وہ اپنے حواس، اپنے اعضاء اور اپنے قوائے
 ذہنی کو استعمال نہ کرے، یا استعمال کرے مگر غلط طریقے سے تو اس
 میں اور جانور میں کوئی فرق نہیں۔

وَلِيُؤْيِي زَنْدَقِي كَا مَالِ

کہا گیا۔

إِنَّا وَعَدَ اللّٰهَ حَقًّا قَلَّا نَعْزُرْكُمْ الْخَبِيرُ
 الدُّنْيَا وَلَا نَعْزُرْكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُورُ۔ (نہج، ۴)

”آخرت کے متعلق اللہ کا وعدہ یقیناً سچا ہے۔ پس دُنیا کی
 زندگی تم کو دھوکہ دیں۔ دُعاں سے اور دُعاؤں سے (شیطان) تم کو لٹا
 دے۔“

وَاتَّبِعُوا الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ عِلْمَهُمْ مَا أُنْزِلُوا بِهِ وَكَافُوا

مُخْطَرِيهِمْ۔ (مائدہ - ۱۰)

”میں لوگوں نے اپنے آپ کو علم کیا وہ ان دُنویٰ فرقوں کے
پیچھے نہ رہے جو ان کو دے گئی تھیں اور نہ جوڑے۔“

وَالضُّمَيْتِ أَهْلَهُ مَثَلِ الْخُلُوفِ الدُّنْيَا كَمَا أَنْزَلْنَاهُ
وَمِنَ السَّمَاءِ فَمَا تَخْلُطُ بِهِ إِنَّكَ الْأَمْرُؤُ فَاصْبِرْ
هَشِيئًا بَدَأْتُمُوهُ الْبَرِيَّاتُ وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ
مُقْتَدِرًا۔ الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
وَالْبَقِيَّةُ الصَّالِحَةُ خَيْرٌ مِنْهُ سَمِيعٌ قَوِيٌّ وَخَيْرٌ
أَمَلًا۔ (آل عمران - ۱۶)

”ان کے سامنے دُنویٰ زندگی کی مثال، بیش کہ ابھی ہے یہ
ہم نے آسمان سے اتاری فرمائی اور اس کی دولت زمین کے ملک و دار
کئے ہوئے۔ پھر ان کا یہ سب نہایت بھروسہ کرنا کی جیسے ہوئی
اُن کے لئے پھرتی رہے۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے مال اور اولاد
میں دُنویٰ زندگی کی نعمتیں ہیں مگر تمہارے سب کے نزدیک ثواب
اور آخرت کی توقع کے اعتبار سے اتنی نہ ہوتی جتنی ان ہی زیادہ
بہتر ہیں۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ كَثْرَةٍ وَلَا
أُولَئِكَ كَفَرُوا وَكُفِّرُوا وَهُمْ فِي ذُلٍّ فَأُولَئِكَ
هُمُ الْخَالِفُونَ۔ (النساء - ۲)

”اے ایمان والے! تمہارے احوال اور تمہاری خواہش کو
تمہاری بات سے غافل نہ کر دے۔ لوگ جو اکثر کے دھڑلے سے
چلے ہیں۔“

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّذِي نَعْتَذِرُكُمْ
بِعَذَابِنَا لَوْلَا فَتَنَ الْإِنسَانَ أَثَمَنَ الْأَمْثَلِ وَعَجِلَ أَجَلُهُ

(سجہ ۵)

”تمہارے اموال اور تمہاری اولاد وہ چیزیں نہیں ہیں جو تم کو
میرے قریب کرنے والی ہوں۔ ہم سے قریب ہوتے وہ ہے جو ایمان
دیا اور جس نے نیک عمل کیا۔“

إِغْلَبُوا أَثَمًا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا نَجِبٌ وَلَهُمْ
وَرِثَتُهُمْ وَقَتْلُهُمْ بَيْنَكُمْ وَكَذَلِكَ فِي الْأَمْوَالِ
وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ أَغْبَبَ الْكَثِيرُ نَبَاتًا
كَمْ يَهَيِّجُ فُلَانًا مُضْطَرًا كَمْ يَكُونُ خَطَامًا

(المعین ۳)

”جہاں دھوکہ دہاں کی زندگی ایک کھیل ایک تماشہ، ایک ظاہری
شان ہے ایسا ہی میں تمہارا ایک دوسرے پر غرور، امداد اولاد
میں ایک دوسرے سے ٹھٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی مثال اس
جگہ بارش ہوتی، اس کی روئیدگی نے افراتفری کو غوث کر دیا۔ پھر
وہ پک گئی اور ٹھٹھنے دیکھا کہ وہ تودہ پڑ گئی، پھر اتر کر وہ پھوس ہو کر رہ
گئی۔“

اتَّخَذُوا كُلَّ شَيْءٍ رُوحَ آيَةٍ فَتَعْبَثُونَ وَتَتَّبِعُونَ
مُضَاهَاةَ أَعْيُنِكُمْ قَتْلَهُنَّ قَتْلًا

(الاحزاب ۷۱)

”کیا تم ہر اونیچے جگہ پر تھم یاد گاری بناتے اور عبادت کو مزید
کرتے ہو؟ شاید کہ تم میں ہمیشہ جہاں رہنا چاہیے۔“

أَتَذْكُرُونَ فِي مَا هُمْ بِكَافِرِينَ فِي جَنَّتِي وَتُحْزَنُ
وَدُّرُوعٌ وَتُخْلَى طُلُوعُهَا هَضْبَةً

الْجَبَّالِ يُبْدِئُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ (الشورى۔ ۸)

”کیا تم ان چیزوں میں جو وہاں ہیں، اطمینان سے چھوڑ دیتے جاؤ گے؟ ان باغوں، ان چشموں، ان کھیتوں، ان ٹھکانوں میں جو کے خوش فوٹے پڑتے رہیں؟ تم یہاں کاٹ کاٹ کر لکھ رہا ہے جو اور خوش ہو؟

إِنَّمَا تَكُونُوا يَذَرُكُمْ كَمَا تَمُوتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي شَرٍّ مِّنْ ذَلِكَ لَبُذِلْتُمْ (النساء۔ ۱۱)

”تم یہاں نہیں جی ہو گے موت تم کو اے کی خواہ تم بڑے مضبوط قلعوں میں، ان کیوں نہ ہو؟

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ كَمَا لَيِّنَّا لَكُمُ الْعُيُونَ (الحکمت۔ ۶)

”ہر سچی کو موت کافی ہے۔ پھر تم سب ہماری طرف واپس لائے جاؤ گے؟

أَلَمْ نَخْلُقْكُمْ أَلْمَا خَلَقْنَاكُمْ عَشَا وَآخِلًا أَلَيْسَ لَكُمُ الْعُيُونُ (طہ۔ ۶)

”کیا تم نے یہ کچھ دیکھا کہ اہلے تم کو بے خبر پیدا کیا ہے۔ اور تم ہماری طرف واپس لائے جاؤ گے؟

پہلے کہا گیا تھا کہ دنیا تمہارے لئے ہے، اور اسی لئے بنائی گئی ہے کہ تم اس کو خوب اچھی طرح بدلو۔ اب معاملہ کا دوسرا رخ پیش کیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ مگر تم دنیا کے لئے نہیں ہو، اس لئے بنائے گئے ہو کہ یہ دنیا تمہیں مہلت دے اور تم اسی میں اپنے آپ کو گم کر دو۔ دنیا کی زندگی سے دھوکا کھا کر کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ ہمیں دائم رہیں رہنا ہے۔ خوب یاد رکھو کہ یہ مال، یہ دولت، یہ شان و شوکت

کے سامان، سب ناپائدار ہیں۔ سب کچھ دیر کا پہلا وار ہیں۔ سب کا انجام موت ہے۔ اور تمہاری طرح یہ سب خاک میں مل جانے والے ہیں۔ اس ناپائدار عالم میں سے اگر کوئی چیز باقی رہنے والی ہے تو وہ صرف نیکی ہے۔ عمل اور روح کی نیکی۔ عمل اور فعل کی نیکی۔ اعمال کی ذمہ داری اور جواب دہی پھر کیا گیا۔

إِنَّ الشَّاعَةَ الْيَتِيمَ أَكَاذِبُهَا الْبُخْرَى كُلُّ
نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ (غالب)

”یہ سب گھڑی جس کو ہم چھپانے کا ارادہ رکھتے ہیں، کتنے دن ہے تاکہ ہر نفس کو اس کی سچی کے مطابق چلائے“

هَلْ تُجِزُّونَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (الحملہ ۱)

”کیا تم کو تمہارے عملوں کے سوا کچھ اور چیز کے ناکام سے جڑا

ہی ہے؟“

وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى وَأَنْ تَكُنَّ
مَوَاقِعُ يَوْمِ يُغْفَرُ لِلظَّالِمِينَ الْجَزَاءُ الْأَوَّلَى وَأَنْ إِلَى
مَوْلَانِ الْمُنَافِقِينَ (الحملہ ۲)

”اور کہ انسان کو اتنا ہی ہے جتنا جتنی اس نے کوشش کی ہے اور اس کی کوشش حقیر و رکی جائے گی پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور یہ کہ انکار سب کو قہر ہے بعد کار کے پاس پہنچتا ہے“

وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَى فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ
أَعْمَى وَأَخْلُ سَهِيلًا (الحملہ ۳)

”جو اس دنیا میں اندھا تھا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ اور

وہ راجہ راست سے بہت ڈٹا ہوا ہے۔

وَمَا تَعْلَمُ أَتَدْرِي لَا تَتَذَكَّرُ وَمَنْ غَفِرَ تَجِدُ مَا
يَسْتَدْعِيهِ، اِنَّ اِلٰهًا بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (البقرہ-۳۷)
”تم اپنے لیے جو نیکیاں اس دنیا سے بھرو گے انہیں اللہ کے

ہاں پائے گا، تم جو کچھ کہتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔“

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهَا إِلَى اللَّهِ شِعْرٌ
كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ۔

(البقرہ-۳۸)

”اس دن سے ڈرو جب تم اللہ کے پاس واپس کیے جاؤ گے
پھر ہر نفس کو اس کے کئے کا بدلہ ملے گا اور ان پر ہرگز ظلم نہ کیا
جائے گا۔“

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا
وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ۔

”وہ دن جب کہ ہر نفس اپنی کی ہوئی نیکی اور اپنی کی ہوئی
بدی کو حاضر پائے گا۔“

وَالْوَارِثُ يَوْمَ يَعْلَمُ بِالْعَشَىٰ قُلْ قُلْتُ مَوَازِيئًا
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَعَلِّمُونَ وَمَنْ خَلَقْتَ مَوَازِيئًا
فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ غَشَوْا أَلْسِنَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا
يُظْلِمُونَ۔ (الاحزاب-۱)

”اس دن اعمال کا تولد ہونا برحق ہے۔ جن کے اعمال کا پڑنا
بھاری ہو گا۔ وہی لوگ ان کے پائے والے ہوں گے اور جن کے اعمال
کا پڑنا ہلکا ہو گا۔ وہی لوگ اپنے کپ کو نقصان پہنچانے والے
ہوں گے کیونکہ وہ بھاری کتبوں کے ساتھ علم کرتے تھے۔“

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ
يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ۔ (الزلزال)

”جس جو شخص ذرہ برابر نیک عمل کرے گا اس کا عجب دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر بُرا عمل کرے گا اس کا عجب بھی دیکھ لے گا۔“
فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أَضِيعُ عَمَلًا
عَابِدًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ۔ (الکہف-۸)

”اللہ نے ان کی دعا قبول کی اور کہا کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہ کروں گا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔“
وَالْيَقُوتُ مِنْ ثَمَرِهِ زَوْجُكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَبَاقُ
أَحَدُكُمْ الْمَوْتَ فَمَنْ يَقُولُ رَبِّ لَوْلَا الَّذِي آتَى
أَجَلَ قُرَيْبٍ فَأَصْدَقِي وَأَكُنَّ مِنَ الصَّالِحِينَ وَلَنْ
يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا۔ (الناحۃ-۲)

”پھر تم کو جو کہ کتاب ہے اس میں سے قرآن کہہ دو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے اور وہ کہے کہ میرے رب! اس کو جو مجھے تمہاری رحمت اور دینا تو میں تیرے راستے میں قرآن کہتا ہوں کہ اس کا بدلہ دے دے۔ مگر اللہ کسی نفس کی مدت مقررہ کی پہنچنے کے بعد پھر اس کو بہت دیر نہ دے گا۔“

وَلَوْ شِئْنَا لَافْتَحْنَا خَزَائِنُ السَّمَوَاتِ وَوَيَرَأَى
عَذَابَ مَنْ تَحْتُهَا أَفْصَحًا وَسَمِعْنَا قُلُوبًا جُنُودًا
نَعْمَلُ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ فَذُوقُوا
بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ يَوْمَ كُمْ هَذَا أَنَا لَيْسَ لَكُمْ
وَدُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ۔

حالات تم وقت دیکھتے جب مجرم اپنے رب کے سامنے سر
جھکا کر کھڑے ہوں گے اور کہیں گے کہ پروردگار ہم نے اب دیکھ
لیا اور سُن لی اب تو میں واقعی کُفر سے ہم اپنے عمل کریں گے اب
ہم کو ایمان حاصل ہو گیا ہے..... مگر کہا جائے گا کہ اب اس
کو تابی کا حوالہ چھو کہ تم نے اس دین بدلے پاس حاضر ہونے کو بھلا
دیا، اب یہی تم کو بھلا چکے ہیں۔ میں اب بیٹھنے کے خواب کا حوالہ
پچھوان اعمال کے بدلے جو تم کہتے تھے۔

یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا دارِ اعمال ہے۔ سعی اور کوشش کی
جگہ ہے۔ اور آخرت کی زندگی دارِ الجرا ہے۔ نیکی اور بدی کے پھل
اور اعمال کے بدلے کا گھر ہے۔ انسان کو موت کی گھڑی تک دنیا سے
عمل کرنے کی مہلت ملی ہوئی ہے۔ اس کے بعد اسے پھر عمل کی مہلت
ہرگز نہیں ملے گی۔ لہذا اس عمرِ مصیبات میں اس کو یہ سمجھ کر رکھنی چاہیے
کہ میرا ہر کام، میری ہر حرکت، میری ہر بُرائی اور بھلائی اپنا ایک اثر
رکھتی ہے، ایک وزن رکھتی ہے، اور اس اثر اور وزن کے مطابق
مجھے بعد کی زندگی میں اچھایا یا بُرا نتیجہ ملنے والا ہے۔ مجھے جو کچھ ملے گا
میری یہاں کی کوشش اور میرے یہاں کے عمل کا بدلہ ہوگا۔ نہ
میری کوئی نیکی ضائع ہوگی اور نہ کوئی بدی سزا سے بچے گی۔

انفرادی ذمہ داری

اس ذمہ داری کے احساس کو مزید تقویت دینے کے لئے یہ بھی
بتا دیا گیا ہے کہ ہر شخص خود اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔ نہ کوئی دوسرا
اس کی ذمہ داری میں شریک ہے، اور نہ کوئی شخص کسی کو اس کے
نتائج عمل سے بچا سکتا ہے۔

غَلَبَتْكُمْ أَنْفُسُكُمْ لَا يَحْضُرُكُمْ مَنْ ضَلَّ

۱۱ اَلْقُلُوبُ يَتَكَبَّرُ (الانعام - ۴۴)

”تم پر تمہارے اپنے نفس کی دیردری ہے۔ اگر تم جاہست
 پاؤ تو دوسرا گراہ ہوئے والا تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“
 وَلَا تَكِبُّ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ
 وِزْرَ أُخْرَىٰ۔ (الانعام - ۲۷)

”ہر نفس جو کچھ کاتا ہے اس کا بوجھ اسی پر ہے۔ کوئی کسی کا
 بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔“

لَنْ يَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ
 الْقِيَامَةِ يَفْعَلُ بِلِسَانِكُمْ فَاذْنًا بِمَا أَفْعَلُونَ بِصَلَاتِكُمْ
 (المائدہ - ۱)

”قیامت کیوں تمہارے رشتہ اور تمہاری اولاد ہرگز کام نہ
 کرسکے۔ تمہارے درمیان اللہ فیصلہ کرے گا۔ اور اس کی نظر
 تمہارے عملوں پر ہے۔“

إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَاؤْتُمْ
 فَالْحَبَاءُ۔ (نہی اسرائیل - ۱)

”اگر تم نیک کام کرو گے تو اپنے نفس کے لئے کرو گے اور
 اگر بُرے کام کرو گے تو اسی کے لئے۔“

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ وَتَزِدُّوا عُثْرًا
 مِّمَّا كُنْتُمْ فِيهَا لَا يُغْنِي عَنْكُمْ كُفْرُكُمْ إِنَّكُمْ عِنْدَ
 ذَا الْقُرُونِ۔ (طہ - ۳)

”کوئی شخص کسی دوسرے کا بار گناہ اپنے سر نہ لے گا۔ اور اگر
 کسی پر گناہوں کا ثا بار ہو اور وہ اپنا ہاتھ ہٹانے کے بجائے کسی کو
 نکالے تو وہ اس کے بوجھ کا کوئی حصہ اپنے اوپر نہ لے گا، خواہ وہ

رشتہ دار بھی کیوں نہ ہو؟

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَ أَيُّوْمَكُمْ لَا تَخْزِي وَالِدًا عَنْ وَلَدٍ وَلَا مَوْلًى هُوَ جَانِبُ عَنِّ وَالِدٍ وَلَا شَيْئًا. (لقمان- ۲)

”اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اس دن کا خوف کرو جب کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام آئے گا اور نہ بیٹا اپنے باپ کے بلکہ کام آئے گا۔“

مَنْ كَفَرَ بَعْدَ الْكُفْرِ وَتَمَنَّى عَمَلًا صَالِحًا قَوْلًا لِّنَفْسِهِ إِنَّهَا لَأَوْتَىٰ - (الزمر- ۵)

”جس نے کفر کیا اس کے کفر کا وہاں اس کے سہرے اور میں نے ایک عمل کیا تو ایسے لوگ خود اپنی بہتری کے لئے راستہ سامان کر رہے ہیں۔“

یہاں ہر انسان پر فرداً فرداً اس کے تمام اچھے اور بُرے اعمال کی کامل ذمہ داری کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ دوسرے امید بانی سمجھنے والی گئی ہے کہ کوئی ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کا کفارہ ادا کرے گا، اس توقع کے لئے کوئی گنہگار چھوڑی گئی ہے کہ کسی کے تعلق اور کسی کے واسطے ہم اپنے جرائم کی پاداش سے بچ جائیں گے اور اس خطرو کا کوئی موقع باقی نہ رہا گیا ہے کہ کسی کا جرم ہم سے جس عمل پر اثر انداز ہوگا، یا خدا کے ہوا کسی کی خوشی کو ہم سے اعمال کی مقبولیت یا مقبولیت میں کوئی دخل ہے جس طرح آگ میں ہاتھ ڈالنے والے کو جلنے سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی، اور شہد کھانے والے کو شہرہ کی کے احساس سے کوئی شے نہیں روک سکتی، نہ جلنے کی مضرت میں کوئی دوسرا شخص اس کا شریک و سیم ہو سکتا ہے اور نہ شہرہ کی لذت سے کوئی دوسرا

اس کو محروم کر سکتا ہے، اسی طرح جکاری کے تھوڑے پد اور نیکیو کا رکھنے کے انتہام نیک میں بھی ہر شخص پہلے خود مغلوب ہے۔ لہذا دنیا کو بہتے میں ہر شخص کو اپنی پوری ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے اور دنیا و مافیہا سے قطع نظر کر کے یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرنی چاہیے کہ اپنے ہر عمل کا ذکر دار میں خود ہوں، ثنائی کا وہاں بھی تنہا میرے اوپر ہے، اور بھلائی کا فائدہ بھی اکیلا میں اٹھانے والا ہوں۔

اوپر اسلام کے تصور حیات دنیا کی جو تحلیل کی گئی ہے اس سے وہ تمام اجزاء آپ کے سامنے آگئے ہیں جن سے یہ تصور مرکب ہے۔ اب تحلیل و تجزیہ کے پہلو کو چھوڑ کر ترکیب و تالیف کے پہلو پر نظر ڈالیے اور یہ دیکھئے کہ ان متفرق اجزاء کے ملنے سے جو کلی تصور حاصل ہوتا ہے وہ کس حد تک لطرت اور واقعہ کے مطابق ہے؟ اور دوسری زندگی کے متعلق دوسری تہذیبوں کے تصورات کی نسبت سے اس کا کیا مرتبہ ہے؟ اور اس تصور حیات پر جس تہذیب کی بنیاد قائم ہے وہ انسان کے فکر و عمل کو کس سانچے میں ڈھالتی ہے؟

زندگی کا فطری تصور

تھوڑی دیر کے لینے اپنے ذہن کو تمام ان تصورات سے جو دنیا اور حیات دنیا کے متعلق مذاہب نے پیش کیے ہیں خالی کر کے ایک مبصر کی حیثیت سے اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نگاہ ڈالیے اور خود کہئے کہ اس پر مجھے ماحول میں آپ کی حالت کیا ہے۔ اس مشاہدہ میں آپ کو چند باتیں واضح طور پر نظر آئیں گی۔

آپ دیکھیں گے کہ جتنی قوتیں آپ کو حاصل ہیں ان کا دائرہ محدود ہے۔ آپ کے حواس جن پر آپ کے علم کا انحصار ہے آپ کے قریبی ماحول کی حدود سے آگے نہیں بڑھتے۔ آپ کے حواس جن پر

آپ کے عمل کا انحصار ہے بہت تھوڑی سی اشیاء پر دسترس رکھتے ہیں۔ آپ کے گروہ پیش بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو آپ کے جسم اور طاقت میں بڑھی ہوئی ہیں اور ان کے مقابلہ میں آپ کی ہستی نہایت حقیر اور کمزور نظر آتی ہے۔ دنیا کے اس بڑے کارخانے میں جو زبردست قوتیں کار فرما ہیں ان میں سے کوئی بھی آپ کے دست قدرت میں نہیں ہے اور آپ ان قوتوں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ جہانی حیثیت سے آپ ایک متوسط درجے کے کھے ہستی رکھتے ہیں جو اپنے سے چھوٹی چیزوں پر غالب اور اپنے سے بڑی چیزوں سے مغلوب ہے۔

لیکن ایک اور قوت آپ کے اندر ایسی ہے جس نے آپ کو ان تمام چیزوں پر شرف عطا کر دیا ہے۔ اسی قوت کی بدولت آپ اپنی ہنس کے تمام حیوانات پر قابو پالیتے ہیں اور ان کی جہانی طاقتوں کو جو آپ کی جہانی طاقت سے بہت بڑھی ہوئی ہیں مغلوب کر لیتے ہیں۔ اسی قوت کی بدولت آپ اپنے گروہ پیش کی چیزوں میں تصرف کرتے ہیں اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق خدمت لیتے ہیں اسی قوت کی بدولت آپ طاقت کے نئے نئے خزانوں کا پتہ چلاتے ہیں اور ان کو نکال نکال کر نئے نئے طریقوں سے استعمال کرتے ہیں اسی قوت کی بدولت آپ اپنے وسائل اکتساب علم کو وسعت دیتے ہیں اور ان چیزوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں جو آپ کے طبیعی قوے کی دسترس سے باہر ہیں۔ غرض ایک قوت ہے جس کی بدولت تمام دنیا کی چیزیں آپ کی خادم بن جاتی ہیں اور آپ ان کے قندوم بھرنے کی مزیت حاصل کرتے ہیں۔

پھر کارگاہ ہستی کی وہ بالاتر قوتیں بھی جو آپ کے دست قدرت

میں نہیں ہیں، اس ڈھنگ پر کام کر رہی ہیں کہ بالعموم وہ آپ کی دشمنی و مخالفت نہیں بلکہ آپ کی مددگار اور آپ کے مفاد و مصلحت کی تبلیغ ہیں ہوا، پانی، روشنی، حرارت، اور ایسی ہی دوسری قوتیں جن پر آپ کی زندگی کا انحصار ہے، کسی ایسے نظام کے ماتحت عمل کر رہی ہیں جس کا مقصد آپ کی مساعدت کرتا ہے، اور اسی بنا پر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ سب آپ کے لیے "مضر" ہیں۔

اپنے اس ماحول پر جب آپ ایک حقیقی نگاہ ڈالتے ہیں تو آپ کو ایک زبردست قانون کار فرما نظر آتا ہے جس کی گرفت میں حقیقی ترین ہستیوں سے لے کر عظیم ترین ہستیاں تک یکساں جکڑی ہوئی ہیں اور جس کے ضبط و نظم پر تمام عالم کے بقا کا انحصار ہے۔ آپ خود بھی اس قانون کے تابع ہیں۔ مگر آپ میں اور دوسری اشیاء عالم میں ایک بڑا فرق ہے۔ دوسری تمام چیزیں اس قانون کے خلاف حرکت کرنے پر قوت، بلکہ قدرت نہیں رکھتیں۔ لیکن آپ کو اس کے خلاف چلنے کی قدرت حاصل ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب آپ اس کے خلاف چلنا چاہتے ہیں تو وہ قانون اس خلاف ورزی میں بھی آپ کی مساعدت کرتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر ایسی خلاف ورزی اپنے ساتھ کچھ مضر بھی رکھتی ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ آپ اس کی مخالفت کرنے کے بعد اس کے بُرے اثرات سے بچ جائیں۔

اس عالمگیر اور اُل قانون کے تحت دُنیا میں کون و فساد کے غلغلے مظاہر آپ کو نظر آتے ہیں۔ تمام عالم میں بے نیلے اور بنگرنے کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ جس قانون کے تحت ایک چیز کو پیدا اور پرورش کیا جاتا ہے اسی قانون کے تحت اس کو مٹایا اور ہلاک بھی کر دیا جاتا ہے دُنیا کی کوئی شے اس قانون کے نفاذ سے محفوظ نہیں ہے۔

بظاہر جو چیزیں اس سے محفوظ نظر آتی ہیں اور جن پر استمرار و دوام کا شبہ ہوتا ہے ان کو بھی جب آپ تفتق کی نظر سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حرکت و تغیر کا عمل ان میں بھی جاری ہے اور کون و فساد کے پھر سے ان کو بھی نہایت حاصل نہیں ہے۔ بچوں کہ لکائنات کی دوسری چیزیں شعور و ادراک نہیں رکھتیں یا کم از کم ہم کو اس کا علم نہیں ہے، اس لئے ہم ان کے اندر صدمہ اور بگڑنے سے کبھی لذت اور الم کا اثر محسوس نہیں کرتے۔ اور اگر انواع حیوانی میں اس کا اثر محسوس ہوتا بھی ہے تو وہ بہت محدود ہوتا ہے لیکن انسان جو ایک صاحب شعور و ادراک ہستی ہے اپنے گرد و پیش ان تغیرات کو دیکھ کر لذت اور الم کے شدید اثرات محسوس کرتا ہے۔ کبھی مناسب طبع انہوں سے اس کی لذت اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ وہ اس کو بھول جاتا ہے کہ اس دنیا میں فساد بھی ہے اور کبھی مخالف طور سے اس کا الم اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ اس دنیا میں اسے نرا فساد ہی فساد نظر آنے لگتا ہے۔ اور وہ بھول جاتا ہے کہ یہاں کون بھی ہے۔

مگر خواہ آپ کے اندر لذت اور الم کے کیسے ہی متضاد احساسات ہوں اور ان کے زیر اثر دنیوی زندگی کے متعلق آپ کا نظریہ کتنا ہی افراط یا تفریط کی طرف مائل ہو، بہر حال آپ اپنی جبلت سے مجبور ہیں کہ اس دنیا کو جیسی بھی ہے، عملاً برقیں اور ان قوتوں سے جو آپ کے اندر موجود ہیں کام لیں۔ آپ کی جبلت میں زندگی ہونے کی خواہش موجود ہے، اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے آپ کے اندر بھوک کی ایک زبردست قوت رکھ دی گئی ہے، جو دائماً آپ کو عمل پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ فطرت کا قانون آپ کی نوع کے

استقرار کے لئے آپ سے خدمت لینا چاہتا ہے اور اس کے لئے اس نے شہوت کی ایک ناقابل دفع قوت آپ کے اندر رکھ دی ہے جو آپ سے اپنا مقصد پورا کرنے کی چھوڑتی ہے۔ اسی طرح آپ کی جبلت میں کچھ دوسرے مقاصد کے لئے کچھ اور قوتیں بھی رکھ دی گئی ہیں۔ اور وہ سب آپ سے جبرود اپنا کام لے لیتی ہیں۔ اب یہ آپ کی اپنی فراست و دہائی پر موقوف ہے کہ فطرت کے ان مقاصد کی خدمت اچھے طریقے سے انجام دیں یا بُرے طریقے سے۔ بطیب نفس انجام دیں یا بکجرو لکرام۔ یہی نہیں بلکہ خود فطرت ہی نے مخصوص طور پر آپ کو یہ قدرت بھی عطا کی ہے کہ ان مقاصد کی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس فطرت کا قانون یہ بھی ہے کہ اس کی خدمت بجا لانا اور اچھے طریقے سے بطیب نفس بجا لانا آپ کے لئے مفید ہوتا ہے، اور اگر آپ اس سے روگردانی کریں، یا اگر اس کی متابعت کریں ہی تو بُری طرح کریں، تو یہ خود آپ ہی کیلئے مضر ہوتا ہے۔

مختلف مذاہب کے تصورات

ایک صحیح فطرت اور وسیع نظر آدمی جب دنیا پر نظر ڈالے گا اور اس دنیا کی نسبت سے اپنی حالت پر غور کرے گا، تو وہ تمام پہلو اس کی نگاہ کے سامنے آئیں گے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن فروع انسانی کے مختلف گروہوں نے اس مرقع کو مختلف گوشوں سے دیکھا ہے، اور اکثر ایسا بھولے کر جس کو جو پہلو نمایاں نظر آیا اس نے حیات دنیا کے متعلق اسی پہلو کے لحاظ سے ایک نظریہ قائم کر لیا اور دوسرے پہلوؤں پر نگاہ ڈالنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

مثال کے طور پر ایک گروہ نے انسان کی کمزوری اور بے بسی
اور اس کے مقابلہ میں فطرت کی بڑی بڑی طاقتوں کی شوکت و
جبروت کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ دنیا میں وہ ایک نہایت ہی حقیر
ہستی ہے، اور یہ نافع و خسار قوتیں جو دنیا میں نظر آتی ہیں کسی مالگیر
قانون کی تابع نہیں ہیں، بلکہ خود مختار و انیم خود مختار طاقتیں ہیں۔ یہ
تخیل ان کے ذہن پر اتنا غالب ہوا کہ وہ پہلو جس سے تمام کائنات
پر انسان کو شرف و عزت حاصل ہے، ان کی نظروں سے اوجھل ہو
گیا۔ وہ اپنی ہستی کے روشن پہلو کو بھول گئے اور اپنی عزت پرستی
کے احساس کو انہوں نے اپنی کمزوری و ناتوانی کے مبالغہ آمیز
اعتراظ پر قربان کر دیا۔ بے ہمتی، شجر پرستی، ستارہ پرستی، اور
دوسرے قوائے فطرت کی پرستش اسی نظریہ کی پیداوار ہے۔

ایک دوسرے گروہ نے دنیا کو اس نظریے دیکھا کہ اس میں ہی
فساد ہی فساد ہے۔ تمام کارخانہ ہستی اس لئے چل رہا ہے کہ
انسان کو تکلیف اور رنج و الم پہنچائے۔ دنیا کے جتنے تعلقات اور
علاقی ہیں سب انسان کو پریشانیوں اور مصیبتوں میں پھالنے والے
پھندے ہیں۔ ایک انسان پر ہی کیا موقوف ہے، تمام کائنات
افسردگی اور طاقت کے پنجے میں گرفتار ہے۔ یہاں جو کچھ بنا ہے
گرنے کے لئے بنا ہے۔ یہاں اس لئے آتی ہے کہ غزاں اس کا
بھن لوٹ لے۔ زندگی کا شجر اس لئے برگ و بار لاتا ہے کہ موت
کا مہریت اس سے لطف اخذ ہو۔ بقا کا جمال سفور سفور کر اس لئے
آتا ہے کہ فنا کے دیوتا کو اس سے کھینچنے کا خوب موقع ملے اس تخیل
نے ان لوگوں کے لئے دنیا اور اس کی زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہ
بچوڑی اور انہوں نے اپنے لئے نہات کی راہ میں اسی میں دلچسپی

دُنیا سے کنارہ کش ہو جائیں، نفس کشی اور ریاضت سے اپنے تمام احساسات کو باطل کر دیں، اور فطرت کے اُس ظلم قانون کو توڑ ڈالیں جس نے محض اپنے کارخانے کو چلانے کے لئے انسان کو آواز کار بنایا ہے۔

ایک اور گروہ نے اس دُنیا کو اس نظر سے دیکھا کہ اس میں انسان کے لئے لذت و عیش کے سامان فراہم ہیں اور اس کو ایک تھوڑی سی لذت ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے مل گئی ہے۔ تکلیف اور اہم کا احساس ان لذتوں کو ہدم کر دیتا ہے۔ اگر انسان اس احساس کو باطل کر دے، اور کسی چیز کو اپنے لئے موجب اہم اور باعث تکلیف نہ سمجھنے دے، تو یہاں پھر لطف ہی لطف ہے۔ کوئی کے لئے جو کچھ بھی ہے وہی دُنیا ہے اور اس کو جو کچھ مزہ اڑانے میں اسی دُنوی زندگی میں اڑانے میں۔ موت کے بعد نہ وہ ہوگا، نہ دُنیا ہوگی، نہ اس کی لذتیں ہوں گی، سب کچھ نسیا نسیا ہو جائے گا۔

اس کے مقابلہ میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو دُنیا اور اس کی لذتوں اور مسترتوں بلکہ خود دُنوی زندگی ہی کو سرا سر گناہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی رُوح کے لئے دُنیا کی مادی آکاشیں ایک خواست اور ایک ناپاک کا حکم رکھتی ہیں۔ اس دُنیا کو بدتے اور اس کے کاروبار میں حصہ لینے اور اس کی لذتوں اور مسترتوں سے لطف اندوز ہونے میں انسان کے لئے کوئی پاکیزگی اور کوئی صلاح اور خیر نہیں ہے جو شخص انسانی بادشاہت سے ہر وہ مند ہونا چاہتا ہو اسے دُنیا سے الگ تھک رہنا چاہیئے۔ اور جو دُنیا کی دولت و حکومت اور دُنوی زندگی کا لطف اٹھانا چاہتا ہو اسے حقین رکھنا چاہیئے کہ آسمانی بادشاہت میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے۔ پھر جب اس گروہ نے محسوس کیا

کہ انسان اس دنیا کو جیتنے اور اس کے دھندوں میں پھنسنے کے لئے اپنی جہالت سے مجبور ہے، اور آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کا خیال خواہ کتنا ہی دلفریب ہو، مگر وہ اتنا قوی نہیں ہو سکتا کہ انسان اس کے بل پر اپنی فطرت کے اقتضاء کا مقابلہ کر سکے، تو انہوں نے آسمانی بادشاہت تک پہنچنے کے لئے ایک قریب کا راستہ نکال دیا، اور وہ یہ تھا کہ ایک ہستی کے کتابے نے ان سب لوگوں کو ان کے اعمال کی ذمہ داریوں سے ہلکدوش کر دیا ہے جو اس ہستی پر ایمان لے آئیں۔

ایک اور گروہ نے قانونِ فطرت کی ہمہ گیری کو دیکھ کر انسان کو ایک جمہورِ محض، ہستی سمجھ لیا۔ اس نے دیکھا کہ نفسیات، عضویات، حیاتیات اور قانونِ تدریث کی شہادتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان ہرگز کوئی مرید و محفلِ ہستی نہیں ہے۔ فطرت کے قانون نے اس کو بالکل بکڑ رکھا ہے۔ وہ اس قانون کے خلاف نہ کچھ سوچ سکتا ہے، نہ کسی چیز کا ارادہ کر سکتا ہے، اور نہ کوئی حرکت کرنے پر قادر ہے۔ لہذا اس پر اپنے کسی فعل کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

اس کے بالکل برعکس ایک گروہ کی نگاہ میں انسان نہ صرف ایک صاحبِ ارادہ ہستی ہے، بلکہ وہ کسی بالاتر ارادہ کا تلخ اور کھنساہلی طاقت کا مایع و قربانِ ضرور نہیں ہے اور نہ اپنے اعمال و افعال میں خود اپنے ضمیر یا انسانی حکومت کے قانون کے سوا کسی کے آگے جوابدہ ہے۔ وہ اس دنیا کا مالک ہے۔ دنیا کی سب چیزیں اس کے لئے مستحق ہیں۔ اسے اختیار ہے کہ ان کو جس طرح چاہے۔ اس نے اپنی زندگی کو بہتر بنانے اور اپنے اعمال و افعال میں ایک ضبط و نظم پیدا کرنے کے لئے اپنی حیاتِ انفرادی پر خودی پا بندیاں عائد کر لی ہیں۔ مگر اجتماعی

حیثیت سے وہ بالکل مطلق انسان ہے اور کبھی بالاتر ہستی کے لئے مسئول
بھرنے کا تخیل سرسرا نہیں ہے۔

یہ دُنیوی زندگی کے حلق مختلف مذاہب فکر و رائے کے مختلف
تصورات ہیں۔ اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن پر مختلف تہذیبوں
کی عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں۔ ہر تہذیب کی عمارت میں جو مختلف طرز و
انداز ہم کو نظر آ رہے ہیں ان کے ایک مخصوص اور بُدا گاہ ہیئت
اختیار کرنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ ان کی بنیاد میں دُنیوی زندگی کا ایک
خاص تصور ہے جو اس مخصوص ہیئت کا مقتضی ہوا ہے۔ اگر ہم ان میں
سے ہر ایک کی تفصیلات پر نظر ڈال کر یہ تحقیق کریں کہ اس نے کس طرح
ایک خاص طرز و انداز کی تہذیب پیدا کی ہے تو یہ جتنا ایک دلچسپ
بحث ہوگی۔ لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے، کیونکہ
ہم صرف اسلامی تہذیب کی خصوصیات کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔
یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ زندگی کے یہ جتنے تصورات آپ کے
سامنے بیان ہوئے ہیں۔ یہ سب دُنیا کو ایک خاص گوشہ نظر سے دیکھنے
کا نتیجہ ہیں۔ ان میں سے کوئی تصور ایسا نہیں ہے جو عسوی حیثیت سے
تمام کائنات پر ایک نئی نگاہ ڈالنے اور موجوداتِ عالم میں انسان کو
صحیح حیثیت حسین کرنے کے بعد قائم کیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر تصور
ہماری نظر میں باطل ہو جاتا ہے جب ہم اس کے زاویہ نگاہ کو چھوڑ کر
ایک دوسرے زاویہ نگاہ سے دُنیا کو دیکھتے ہیں۔ اور پھر دُنیا کے نئی
ملاحظہ کے بعد تو ان تمام ہی تصورات کی عقلی ہم پر روشنی ہو جاتی ہے۔
اسلامی تصور کی خصوصیت

اب یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ زندگی کے تمام تصورات
میں صرف اسلام ہی کا تصور ایک ایسا تصور ہے جو فطرت اور حقیقت

کے مطابق ہے، اور جس میں دنیا اور انسان کے تعلق کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ نہ تو دنیا کوئی ترک اور نفرت کے قابل چیز ہے اور نہ ایسی چیز ہے کہ انسان اس کا فریفتہ ہو اور اس کی لذتوں میں گم ہو جائے نہ وہ سراسر گنہگار ہے نہ سراسر فساد۔ نہ اس سے اجتناب درست ہے اور نہ اس میں کئی انہماک صحیح۔ نہ وہ بالکل خواہست و آلودگی ہے اور نہ تمام تر پاکیزگی و طہارت۔ پھر اس دنیا سے انسان کا تعلق نہ اس قسم کا ہے جیسا ایک بادشاہ کا اپنی مملکت سے ہوتا ہے اور نہ اس قسم کا جیسا ایک قیدی کا اپنے قید خانے سے نہ انسان اتنا حقیر ہے کہ دنیا کی ہر قوت اس کی مسجود ہو اور نہ اتنا غالب و قابض کہ وہ دنیا کی ہر شے کا مسجود ہو جائے۔ نہ وہ اتنا بے بس ہے کہ اس کا ذاتی ارادہ کوئی چیز ہی نہ ہو اور نہ اتنا طاقتور کہ بس اسی کا ارادہ سب کچھ ہو۔ نہ وہ عالم ہستی کا مطلق اعنان فرمان روا ہے اور نہ کدوؤں آکاؤں کا بیچارہ غلام۔ حقیقت جو کچھ ہے وہ ان مختلف اطراف و نہایات کے درمیان ایک متوسط حالت ہے۔

یہاں تک تو فطرت اور عقل سلیم ہماری راہنمائی کرتی ہے۔ لیکن اسلام اس سے آگے بڑھتا ہے اور اس امر کا ٹھیک ٹھیک تعین کرتا ہے۔ کہ دنیا میں انسان کا حقیقی مرتبہ کیا ہے؟ انسان اور دنیا کے درمیان کس نوع کا تعلق ہے؟ اور انسان دنیا کو دے تو کیا سمجھ کر دے؟ وہ یہ کہہ کر انسان کی آنکھیں کھول دیتا ہے کہ تو عام مخلوقات کی طرح نہیں ہے بلکہ دے دے نہیں پر رب العالمین کا ذکر دار فاضل ہے۔ دنیا اور اس کی طاقتوں کو تیرے لئے مسخر کیا گیا ہے۔ تو سب کا حاکم اور ایک کا محکوم ہے۔ سب کا فرماں روا اور صرف ایک کا تابع فرمان ہے۔ سب سے بڑے تمام مخلوقات پر عزت و شرف حاصل ہے، مگر عزت کا

استحقاق تھے اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب تو اس کا تبلیغ ہو فرما بیٹا
 ہو اور اس کے احکام کا اہتمام کرے جس نے تجھے نیابت کا منصب
 عطا کر کے دنیا پر شرف بخشا ہے دنیا میں تو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اس
 کو برستے اور اس میں تصرف کرے۔ پھر تو اس دنیا کی زندگی میں چھٹو
 صبح یا غلط عمل کرے گا اس پر وہ اچھے یا بُرے نتائج مُترتب ہوں
 گے جنہیں تو بعد کی زندگی میں دیکھے گا۔ بسناؤ نبوی زندگی کی اس سُن
 تھوڑی سی قدرت میں تجھ کو اپنی شخصی ذمہ داری اور مسئولیت کا ہر لمحہ
 احساس رہنا چاہیئے، اور کہیں اس سے غافل نہ ہونا چاہیئے کہ تھوڑی سی
 ربُّ العالمین نے اپنے نائب کی حیثیت سے تیری امانت میں دی ہیں
 ان سب کا تجھ سے پورا پورا حساب لیا جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تصور اپنے جزئیات کے ساتھ ہر مسلمان
 کے ذہن میں حاضر نہیں ہے، اور نہ الہی علم کے مخصوص گروہ کے سوا
 کوئی ان جزئیات کا واضح ادراک رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ تصور اسلامی
 تہذیب کی رُخ و بنیاد میں محکم ہے۔ اس لئے مسلمان کی سیرت اپنی
 اصل شان اور اپنی حقیقی خصوصیات سے بہت کچھ ماری ہو جانے کے
 باوجود آج بھی اُس کے اثرات سے غالی نہیں ہے۔ ایک مسلمان جس
 نے اسلامی تہذیب کے ماحول میں تربیت پائی ہو، اس کا عمل خواہ
 بیرونی اثرات سے کتنا ہی ناقص ہو گیا ہو، لیکن خود داری و عزت
 نفس کا احساس، خدا کے سوا کسی کے آگے نہ جھکنا، خدا کے سوا کسی
 سے نہ ڈرنا، خدا کے سوا کسی کو اپنا مالک اور آقا نہ سمجھنا، دنیا میں اپنے
 آپ کو شخصاً مسئول سمجھنا، دنیا کو دارِ اعلیٰ اور آخرت کو دارِ الجبر سمجھنا،
 مہربان اپنے ذاتی اعمال کے خُسن و قبح پر اپنی آخرت کی کامیابی و ناکامی
 کو منحصر سمجھنا، دنیا اور اس کی دولت و لذت کو ناپائیدار اور مہربان

اپنے اعمال اور ان کے نتائج کو باقی و دائم خیال کرنا، یہ ایسے امور ہیں جو اس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہوں گے اور ایک عمیق النظر مبصر اس کی باتوں اور اس کی حرکات و سکنات میں اس عقیدے کے اثرات (خواہ وہ کتنے ہی دھندے کیوں نہ ہوں) سامنے محسوس کرے گا جو اس کی نفع اور اس کے دل کی گہرائیوں میں اُترا ہوا ہے۔

پھر جو شخص تہذیب اسلام کی تادم رخ کا مطالعہ کرے گا اسے یہ بات نمایاں طور پر محسوس ہوگی کہ اس میں جب تک خالص اسلامیات رہی اس وقت تک یہ ایک خالص عملی تہذیب تھی۔ اس کے پیروؤں کے نزدیک دُنیا آخرت کی کھیتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ دُنیا میں جتنی مدت وہ زندہ رہیں اس کا ہر لمحہ اس کھیتی کے کھٹنے اور بھٹنے میں صرف کریں اور زیادہ سے زیادہ رقم رچی کریں تاکہ بعد کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ فصل کاٹنے کا موقع ملے۔ انہوں نے رہبانیت اور لذتیت کے درمیان ایک ایسی معتدل اور متوسط حالت میں دُنیا کو رہتا جس کا نام و نشان بھی ہم کو کسی دوسری تہذیب میں نظر نہیں آتا۔ خلافتِ الہی کا تصور ان کی دُنیا میں پوری طرح منہک ہوئے اور اس کے معاملات کو انتہائی سرگرمی کے ساتھ انجام دینے پر اُجھاتا تھا، اور اس کے ساتھ مسئولیت اور ذمہ داری کا خیال انہیں مدد سے مٹھاؤں بھی نہ بھونے دیتا تھا۔ وہ نائبِ خدا ہونے کی وجہ سے انتہائی درجہ کے خوددار تھے، اور پھر یہی تصور ان میں بکتر اور غرور کی پیدائش کو روکتا بھی تھا۔ وہ خلافت کے فرائض انجام دینے کے لئے ان تمام چیزوں کی طرف رجعت رکھتے تھے جو دُنیا کا کام چلانے کے لئے ضروری ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی ان چیزوں کی طرف ان کو کوئی رجعت نہ تھی۔

جو دنیا کی لذتوں میں گم کر کے انسان کو اس کے فرائض سے غافل کر دینے والی ہیں۔ غرض وہ دنیا کے کام کو اس طرح چلاتے تھے کہ گویا اللہ کو ہمیشہ پیسے رہنا ہے، اور پھر اس کی لذتوں میں منہک ہونے سے اس طرح بچے رہتے تھے کہ گویا دنیا ان کے لئے ایک سرائے ہے جہاں محض مارضی طور پر وہ مقیم ہو گئے ہیں۔

بعد میں جب اسلامیت کا اثر کم ہو گیا اور دوسری تہذیبوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں کی سیرت میں پوری اسلامی شان باقی نہیں رہی۔ تو انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو دنیوی زندگی کے اسلامی تصور کے خلاف تھا۔ عیش و عشرت میں منہک ہوئے۔ عالی شان قصر تعمیر کئے۔ موسیقی، مصوری، سنگ تراشی اور دوسرے فنون لطیفہ میں دلچسپی لے کر معاشرت اور طرز و دو عالم میں اس اسرات اور اس شان و شکوہ کو اختیار کیا جو اسلامی مذاق کے بالکل خلاف تھی۔ حکومت و سیاست اور دوسرے دنیوی معاملات میں وہ طریقے اختیار کر لیتے جو بالکل غیر اسلامی تھے۔ مگر اس کے باوجود دنیوی زندگی کا اسلامی تصور، جو انہی کے دل میں اُترا ہوا تھا، کہیں نہ کہیں اپنا اثر نمایاں کر کے رہتا تھا اور یہی اثر ان کے اندر دوسروں کے مقابلے میں ایک امتیازی شان پیدا کر دیتا تھا۔ ایک مسلمان بادشاہ جتنا کہ کتابے ایک مالِ شانِ قصر تعمیر کرتا ہے اور اس میں لطف و تفریح اور شان و شوکت کے وہ تمام سامان فراہم کرتا ہے جن کا انسان اس زمانہ میں تصور کر سکتا تھا۔ مگر اس قصر کی سب سے زیادہ بڑی لطف و تفریح گاہ میں پشت کی جانب (یعنی قبلہ کے کُٹھ پر) بے ڈبائی بھی کھد کا ہے۔

اسے بند پائے و قفل بدول ہمداد

وسے دوختہ چشم و پائے دگر ہمداد

عزم سفر مغرب و روضہ مشرق

اسے داد و پشت بمنزل ہمدار

وہ قصرانی جگہ ظہیر نہیں ہے۔ اس سے بہتر قصر دنیا کی دوسری قوموں میں مل سکتے ہیں۔ مگر اس تحقیق کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں مل سکتی۔ جو دسے زمین پر فردوس بنانے والے کو "اسے داد و پشت بمنزل ہمدار" کی تنبیہ کرتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں اس قسم کی مثالیں بکثرت ملیں گی کہ قیصر و کسری کے لمحوں پر بادشاہی کرنے والوں نے بھی جب کسی دشمن پر فتح پائی تو اپنی کبریائی کا اظہار کرنے کے بھائے خدا نے واحد کے سامنے خاک پر سر بسجود ہو گئے۔ ٹہے ٹہے چادر و گردن کش فرماں رعاؤں نے جب شریعت اسلامی کے خلاف عمل کرنا چاہا تو کسی ہندو خدا نے ان کو بڑ ملا ٹوک دیا اور وہ خوف خدا سے کانپ اُٹھے۔ اشتہادِ جہ کے ہر عمل اور سیہ کار لوگوں کو کسی ایک معمول بات سے تشبیہ ہو گئی اور دفعتاً ان کی زندگی کا رنگ بدل گیا۔ دولت دنیا پر جان خدا کے لئے والوں کے دل میں دنیا کی ناپائیداری اور آخرت کے حساب کتاب کا خیال آیا اور انہوں نے خدا کے بندوں پر سب کچھ تقسیم کر کے ایک معتد زندگی اختیار کر لی۔ غرض ان تمام غیر اسلامی اثرات کے باوجود جو مسلمانوں کی زندگی میں پھیل گئے ہیں، آپکو ہر قدم پر ان کی قومی سیرت میں اسلامی تصور کا جلوہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور نظر آئے گا اور اس کو دیکھ کر آپ ایسا محسوس کریں گے کہ گویا اندر سے میں دفعتاً روشنی نمودار ہو گئی۔

باب دوم

زندگی کا نصب العین

صح اجتماعی نصب العین کے لازمی عناصر۔

انسان کا فطری نصب العین۔

دو مقبول اجتماعی نصب العین اور ان پر تنقید۔

اسلامی تہذیب کا نصب العین اور اس کی خصوصیات۔

۱۔ طبعی اور عقلی نصب العین کی ہم آہنگی۔

۲۔ احکام اسلامی کی قوت جاذبہ

۳۔ فکر و عمل کی یکسوئی۔

۴۔ خالص بشری اجتماعیت کی شیرازہ بندی۔

۵۔ تمام انسانی مرادات کا باقیع حصول۔

۶۔ تقویٰ اور نیکوکاری کے لئے بہترین مرکب۔

۷۔ طریقوں کے امتیاز میں مقصد کی تعین کا اثر۔

۸۔ اسلامی تہذیب کی تشکیل میں اس کے نصب العین کا حصہ

زندگی کا نصب العین

تصور حیات کے بعد دو سرا سوال جو ایک تہذیب کے حسن و قبح کو جاننے میں خاص اہمیت رکھتا ہے، یہ ہے کہ وہ انسان کے سامنے کون سا نصب العین پیش کرتی ہے؟ اس سوال کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ انسان کے ارادوں اور اس کی عملی کوششوں کا رخ فطری طور پر اسی سمت پر اسی مقصود کی طرف پھرتا ہے۔ جس کو اس نے اپنا نصب العین اور سطح فکر قرار دیا ہو۔ اس کے صحیح یا غلط ہونے پر ذہنیت کی اچھی یا بُری تشکیل اور زندگی بسر کرنے کے طریقوں کا درست یا نادرستی کا انحصار ہے۔ اسی کے بلند یا پست ہونے پر افکار و خیالات کی بلندی و پستی، اخلاق و ادب کی فضیلت و رذیلت اور عیشت و معاشرت کی رفعت و دناست کا مدار ہے۔ اسی کے واضح اور متعین ہونے یا نہ ہونے پر انسان کے ارادوں اور خیالات کا مجتمع یا پرگانہ ہونا، اس کی زندگی کے معاملات کا ہموار یا ناہموار ہونا، اور اس کی قوتوں اور قابلیتوں کا ایک راہ میں صرف ہونا یا مختلف راہوں میں منتشر ہو جانا موقوف ہے۔ بالکل نصب العین ہی وہ چیز ہے جس کی بدولت انسان فکر و عمل کی بہت سی راہوں میں سے کوئی راہ انتخاب کرتا اور اپنی ذہنی و جسمانی قوتوں اور اپنے مادی و روحانی وسائل کو اسی راہ میں صرف کر دیتا ہے۔ لہذا جب ہم کسی تہذیب کو نقد و

کے معیار پر جانچنا چاہیں تو ہمارے لئے اس کے نصب العین کھ
جستجو مانگتا ہے۔

صحیح اجتماعی نصب العین کے لازمی خصائص
لیکن بحث و تحقیق کی راہ میں قدم اٹھانے سے پہلے ہم کو یہ متیقن
کر لینا چاہیئے کہ تہذیب کے نصب العین سے ہماری مراد کیا ہے؟ یہ
ظاہر ہے کہ جب ہم ”تہذیب“ کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ہماری
مراد افراد کی شخصی تہذیب نہیں ہوتی بلکہ ان کی اجتماعی تہذیب مراد
ہوتی ہے۔ اس لئے ہر فرد کا شخصی نصب العین، تہذیب کا نصب العین
نہیں ہو سکتا۔ لیکن برعکس اس کے یہ لازم ہے کہ ایک تہذیب کا جو
نصب العین ہو وہ اس تہذیب کے متبعین میں سے ہر فرد کا نصب
العین ہو، عام اس سے کہ ہر فرد کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو اس لحاظ
سے تہذیب کا نصب العین وہ ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر
المانوں کی ایک بڑی جماعت کا مشترک اجتماعی نصب العین بن گیا ہو
اور اس نے افراد کے شخصی نصب العین پر اتنا غلبہ پایا ہو کہ ہر فرد
بجائے خود ہی نصب العین رکھتا ہو جو بوری جماعت کے تشکیلی نظر
سے ہے۔

اس قسم کے اجتماعی نصب العین کے لئے یہ ایک لازمی شرط ہے
کہ وہ افراد کے شخصی نصب العین سے کمال موافقت و مناسبت رکھتا
ہو اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ مٹا انفرادی اور اجتماعی نصب
العین بن سکے۔ اس لئے کہ اگر اجتماعی نصب العین افراد کے شخصی نصب
العینوں سے منافات کی نسبت رکھتا ہو تو اولاً اس کا اجتماعی نصب العین
بننا ہی مشکل ہوگا، کیونکہ جس چیز کو افراد فرداً فرداً قبول نہ کر سکیں وہ اجتماعی
نہیں بن سکتا، اور اگر کسی زبردست اثر کے تحت وہ اجتماعی نصب

العین بن بھی گیا ہو تو فرد کے نسب العین اور جماعت کے نسب العین میں غیر محسوس طور پر ایک کشمکش بڑھا رہے گی، تاکہ اگر اس غالب اثر کے کمزور ہوتے ہی افراد اپنے اپنے نسب العین کی طرف پھر جائیں گے، جماعت کا نسب العین باطل ہو جائے گا، بیست اجتماعی کی قوت باذہب و رابطہ فنا ہو جائے گی اور تہذیب کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا۔ اس لئے تہذیب کا صحیح نسب العین وی ہو سکتا ہے۔ جو حقیقتہً انسان کا فطری نسب العین ہو، اور ایک تہذیب کی اصل غری نہیں ہے کہ وہ ایسا اجتماعی نسب العین پیش کرے جو عینہً افراد کے نسب العین بن سکتا ہو۔

اس نقطہ نظر سے ہمارے سامنے دو سوال آتے ہیں جن کو حل کیے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

۱۔ کیا یہ کہ فطرۃً انسان کا شخصی نسب العین کیا ہے؟

۲۔ دوسرے یہ کہ دنیا کی دوسری تہذیبوں نے جو نسب العین پیش کیئے ہیں، وہ کس حد تک انسان کے اس فطری نسب العین سے مناسبت رکھتے ہیں؟

انسان کا فطری نسب العین

انسان کے فطری نسب العین کا سوال دراصل یہ سوال ہے کہ انسان فطری طور پر دنیا میں کس مقصد کے لئے مہذب ہوا کرتا ہے۔ اور اس کی طبیعت کس چیز کی خواہش مند ہوتی ہے؟ اس کی تحقیق کے لئے اگر آپ فرداً فرداً ہر شخص سے پوچھیں کہ وہ دنیا میں کیا چاہتا ہے تو آپ کو مختلف لوگوں سے مختلف جوابات ملیں گے اور شاید کوئی دو آدمی بھی ایسے نہ ملیں جن کے مقاصد اور جن کی خواہشات بالکل یکساں ہوں۔ لیکن ان سب کا استقصار کیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ

لوگوں نے جن چیزوں کو مقاصد قرار دیا ہے وہ دراصل فی نفسہ مقصود نہیں ہیں بلکہ ایک مقصود تک پہنچنے کے ذرائع ہیں، اور وہ واحد مقصود خوشحالی و اطمینان قلب ہے۔ ہر شخص خواہ وہ کسی مرتبہ عقل و ذہنی اور کسی طبقہ عمرانی سے تعلق رکھتا ہو، اور خواہ وہ کسی شعبہ حیات اور کسی میدان عمل میں جدوجہد کر رہا ہو، اپنی کوششوں کے لئے ایک ہی نصب العین رکھتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسے امن، سلامتی، خوشی اور جمعیت خاطر نصیب ہو۔ لہذا اس کو ہم فرد انسانی کا فطری نصب العین کہہ سکتے ہیں۔

دو مقبول اجتماعی نصب العین اور ان پر تنقید

دنیا کی مختلف جمہوریوں نے جو اجتماعی نصب العین پیش کیے ہیں ان کو بھی اگر جزئیات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان میں بہت کچھ اختلافات پائے جائیں گے، جن کا حصر کرنا نہ یہاں مقصود ہے اور نہ ممکن۔ لیکن اصول حیثیت سے ہم ان سب کو دو قسموں پر تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ جن جمہوریوں کی بنیاد کسی مذہبی و روحانی حقیقت پر نہیں ہے انہوں نے اپنے مقبوعین کے سامنے حقوق و برتری کا نصب العین پیش کیا ہے یہ نصب العین متعدد اجزاء سے مرکب ہے جن میں سے خاص اور اہم اجزاء ترکیبی یہ ہیں۔

و سیاسی غلبہ و استیلا کی طلب۔

و دولت و ثروت میں سب سے بڑھ جانے کی خواہش، ماحس سے کہ وہ فتح ممالک کے قبضے سے ہو یا تجارت و صنعت پر ماحس ہو جانے کی بدولت۔

و عمرانی ترقی کے مظاہر میں سب پر سبقت لے جانے کی خواہش،

غواہ وہ علوم و فنون کے اعتبار سے ہو، یا آثارِ مدنیّت و تہذیب میں شان و شکوہ کے اعتبار سے۔

یہ اجتماعی نصبُ العین ظاہرِ نظر میں اس شخصی نصبُ العین کے منافی نہیں ہے جس کا اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں۔ کیونکہ اولیٰ غور و تامل کے بغیر یہ حکم نکلایا جاسکتا ہے کہ اگر جماعت کا یہ نصبُ العین محقق ہو جائے تو فرد کا نصبُ العین مع شئی یا ناکہ محقق ہو جائے گا۔ اس نصبُ العین کی یہی ظاہرِ فریبی ہے جس کی بدولت ایک قوم کے لاکھوں کروڑوں افراد اپنے شخصی نصبُ العین کو اس میں گم کر دیتے ہیں۔ لیکن تحقیقی نظر اور پھر عملی تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ اجتماعی نصبُ العین فرد کے فطری نصبُ العین سے سنت منافات رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں بقوق و بدتری کا یہ نصبُ العین رکھنے والی صرف ایک ہی قوم نہیں ہوتی، بلکہ ایک زمانہ میں متعدد قومیں اپنے سامنے یہی نصبُ العین رکھتی ہیں، اور وہ سب اس کے حصول کے لئے ہتھ پھڑکتی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں شدید سیاسی و معاشی اور تمدنی کشمکش برپا ہوتی ہے، مسابقت و مقابلہ اور مزاحمت کے زبردست جنگلے رونما ہوتے ہیں، اور شورشِ اضطراب کے عالم میں افراد کو امن و سکون اور خوشحالی و اطمینانِ قلب کا بیشتر آقا قریب قریب محال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہی حالت ہمساری آنکھوں کے سامنے مغربی ممالک میں حدیث ہے۔ تاہم اگر ایک زمانہ ایسا بھی فرض کر لیا جائے جس میں صرف ایک ہی قوم اس نصبُ العین کے لئے کوشش کرنے والی ہو، اور کوئی دوسری قوم اس نصبُ العین کی خاطر اس کی مزاحمت کرنے والی نہ ہو، تب بھی اس کی کامیابی افراد کے شخصی نصبُ العین کا محقق ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ

ایسے اجتماعی نصب العین کا یہ فطری خاصہ ہے کہ وہ بین الاقوامی
مقابلہ ہی نہیں پیدا کرتا بلکہ خود ایک قوم کے اپنے افراد میں ہی باہم
مسابقت کی ذہنیت پیدا کرتا ہے۔ اس کی بدولت قوم کے ہر فرد
کا مقصد حیات یہ ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے ایسے قوم پر طلب حاصل
کے، دولت، حکومت، طاقت، شان و شوکت اور اسباب عیش و
نعمت میں سب سے بڑھ جائے، دوسروں کے رزق کی گنجائش اس کے
باتحاد آجائیں، جتنے وسائل ثروت ممکن ہوں ان کا اہان اس کی قاست
فائدہ کو حاصل ہو جائے، فوائد و منافع اس کا حصہ ہوں اور غمراں و
نامرادی دوسروں کا حصہ، صاحبِ امر وہ ہو اور دوسرے اس کے
میلج و دست گردن کر رہیں۔ اول تو اس قسم کے لوگوں کی حرص و طمع
کسی مرتبہ پر ہی پہنچ کر قانع نہیں ہوتی اس لیے وہ ہمیشہ غیر مطمئن اور
بے یقین رہتے رہیں۔ دوسرے اس نوع کا مقابلہ جب ایک قوم کے
خود اپنے افراد میں پیدا ہو جاتا ہے تو اس میں ہر گھراؤ ہر بازار ایک
میدانِ جنگ بن جاتا ہے اور امن و اطمینان، سکون و سلامتی اور مسرت
و خوشحالی ناپید ہو جاتی ہے، خواہ دولت و حکومت اور اسبابِ نعمت
کی کتنی ہی کثرت ہو۔

علاوہ برسی یہ ایک فطری بات ہے کہ خاص مادی ترقی، جیٹ
رؤمانیت کا کوئی حصہ نہ ہو، انسان کو کبھی مطمئن نہیں کر سکتی کیونکہ
حقی لذات کا حصول ایک خاص حیوانی نصب العین ہے اور اگر یہ
ہے کہ انسان حیوان مطلق سے نام نہ کوئی چیز ہے، تو یقیناً یہ لگا رہے گا
چاہے کہ انسان کو محض ان چیزوں کا حصول مطمئن نہیں کر سکتا
کی لذتیں صرف اس کی حیوانی خواہشات کی تسکین کے لیے کافی ہیں۔

۲۔ جن تہذیبوں کی بنیاد مذہبی و روحانی تھی پر رکھی گئی ہے انہوں نے عموماً اپنا نصب العین نہات کو قرار دیا ہے۔ بلاشبہ اس نصب العین میں وہ روحانی عنصر موجود ہے جو انسان کو سکون اور الطینان قلب بخشتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ نہات میں طرح ایک قوم کا نصب العین بن سکتی ہے اسی طرح فرداً فرداً ہر شخص کا نصب العین بن سکتی ہے، لیکن زیادہ گہری تنقید سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ نصب العین ایک صحیح نصب العین ہی نہیں بن سکتا اس کے چند وجوہ ہیں:-

اولاً، نہات کے نصب العین میں ایک طرح کی خود مرضی بھی ہوتی ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ اجتماعیت کو کمزور کر کے انفرادیت کو قوت پہنچائے۔ کیونکہ جب ہر شخص بہانے خود چند خاص احوال انہام دے کر نہات حاصل کر سکتا ہو تو اس نصب العین میں کوئی چیز ایسی نہیں رہتی جو اس کو انفرادی کے بہانے اجتماعی حیثیت دینے والی اور اس کے تحقق کے لئے فرد کو جماعت کے ساتھ اشتراک عمل پر ابھارنے والی ہو۔ یہ انفرادیت کی روح اس مقصد کے بالکل خلاف ہے جو تہذیب کا من حیث التہذیب میں مقصد ہے۔

ثانیاً، نہات کا مسئلہ دراصل طریقہ حصول نہات کے مسئلہ سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اور اس نصب العین کے صحیح یا غلط ہونے میں اس طریقہ کے صحیح یا غلط ہونے کو بھی بہت کچھ دخل حاصل ہے جو اس لحاظ سے سمجھنے کے لئے تجویز کیا گیا ہو۔ مثلاً جن مذاہب نے ترک دنیا اور رہبانیت کو ذریعہ نہات قرار دیا ہے، ان میں نہات نہ انفرادی نصب العین بن سکتی ہے اور نہ اجتماعی۔ ایسے مذاہب کے متبعین آخر کار دنیا کو دنیا سے الگ کرنے اور دنیا داروں کی نہات کے لئے رچ کر لگتے

(مثلاً دین داروں کی خدمت یا کلمہ وغیرہ) نکال لینے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقل تو یہ نصب العین یکسانی و یکجائی کے ساتھ فرد اور جماعت کا مشترک نصب العین نہیں رہا۔ دوسرے یہ کہ دین داروں کی ایک قلیل تعداد کے سوا باقی پوری جماعت کے لئے اس نصب العین میں وہ رفعت، وہ اہمیت، وہ ہاؤ ہیٹ اور وہ دلچسپی باقی نہیں رہی جو اسے اپنا گرویدہ بنائے رکھتی۔ اس لئے تمام دنیا اور اس کو چھوڑ کر اس مادی نصب العین کے پیچھے پڑ گئے۔ جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ دوسری طرف جن مذاہب نے نہایت کوشش و محنت کرنا شروع کی اور مسیحوں کی خوشنودی پر موقوف قرار دیا ہے ان میں نصب العین کا اشتراک یہ قرار نہیں رہتا۔ مختلف گروہ مختلف مسیحوں کی طرف پھرتے ہیں اور نصب العین کی وہ حقیقی وحدت ہی باقی نہیں رہتی جس کو قائم کرنا اور جس کے رشتہ میں اپنے تمام متبعین کو مربوط کر دینا ایک تہذیب کا اصلی کام ہے۔ اس لئے ان مذاہبوں کے پیروں میں جب تک مذہبی ترقی کے راستے پر ہانا اور اپنی جماعت کی شیرازہ بندی کرنا چاہتے ہیں تو ان کو کسی دوسرے نصب العین کی حاجت ہوتی ہے۔ ایک اور قسم مذاہب کی وہ ہے جس کی دعوت کا خطاب انسان بحیثیت انسان سے نہیں ہے، بلکہ کسی خاص نسل اور خاص جغرافیائی محدود میں رہنے والی قوم سے ہے۔ اور اس بنا پر اس کے نزدیک نہایت ہی اُس خاص نسل و قوم کے لئے مخصوص ہے۔ یہ نصب العین بلاشبہ تہذیب و تمدن کے ابتدائی مرحلہ میں ایک کامیاب اجتماعی نصب العین بن سکتا ہے، مگر چونکہ یہ عقلی صحیح کے معیار پر پورا نہیں اُترتا، اور نہایت کا کسی خاص نسل کے لئے مختص ہونا ایسی بات ہے جس کو ماننے سے ہر سلیقہ الطہرت انسان کی عقل انکار کرتی ہے، اس لئے ایسے مذاہب کے

مجبور عقلی ترقی کی راہ میں چند ہی قدم اگے بڑھ کر اس نصب العین کے خلاف خود بے جاوت کر دیتے ہیں اور اس کو اپنے ذہن سے خارج کر کے کوئی دوسرا نصب العین اختیار کر لیتے ہیں۔

مثلاً، نہات کا نصب العین دینی و روحانی نقطہ نظر سے فواد کتنا ہی پاکیزہ ہو، لیکن دنیوی نقطہ نظر سے اپنے اہل کوئی چیز ایسی نہیں رکھتا جو ایک قوم کو من حیث القوم اُبھارنے والی اور اس کے اہل و عیال کی عزت و وقار اور وہ حرکت پیدا کرنے والی ہو جو قوی ترقی کے لئے لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی ترقی پسند قوم نے اس کو اپنا اجتماعی نصب العین نہیں بنایا، اور ان قوموں میں بھی اس کی حیثیت ہمیشہ ایک انفرادی نصب العین ہی کی رہی ہے جس کے مذہب نے صرف یہی ایک نصب العین پیش کیا ہے۔

یہ دہرہ ہیں جن کی بنا پر مادی اور روحانی دونوں نصب العین لغو و برباد کے میدان پر ٹکڑے نہیں اترتے۔ آئیے اب ہم دیکھیں کہ اسلامی تہذیب نے کس چیز کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے اور اس میں کیا خاصا پن ہے جو اس کو ایک صحیح نصب العین بناتے ہیں۔

اسلامی تہذیب کا نصب العین اور اس کی خصوصیات اس بحث کے آغاز ہی میں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ نصب العین کا سوال درحقیقت تصورات کے سوال سے ایک گہرا تعلق رکھتا ہے۔ ہم دنیوی زندگی کے متعلق جو تصور رکھتے ہیں، اور دنیا میں اپنی حیثیت اور اپنے لئے دنیا کی حیثیت کا جو نظریہ ہمارے ذہن میں ہے، وہی فطری طور پر زندگی کا ایک نصب العین پیدا کر دیتا ہے، اور ہم اپنی تمام قوتیں اسی نصب العین کے تحقق کی راہ میں صرف کرنے لگتے ہیں۔ اگر دنیا کو ہم اپنے لئے ایک چراگاہ تصور کرتے ہیں

اور ہمارے ذہن میں زندگی جہالت ہے ایک جہالت سے جو ہم کو کھلنے پھینے اور لغات کوزیا سے متعلق ہونے کے لئے لی ہوئی ہے، تو بلاشبہ یہ حیوانی تصور ہمارے نفس میں زندگی کا ایک حیوانی نصب العین راسخ کر دے گا اور ہم تمام عمر اپنے لئے حتی لذتوں کے سامان فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے بخلت اس کے اگر ہم نے اپنے آپ کو پیدائشی مجرم اور فطری گنہگار سمجھا ہے، اور دنیا کے متعلق ہمارا تصور یہ ہے کہ یہ کوئی حقوت خانہ اور عذاب کا گھر ہے جہاں اپنے اس پیدائشی مجرم کی سزا جگتے کے لئے ہم بیدار دیئے گئے ہیں، تو قدرتی طور پر یہ تصور ہمارے نفس میں اس عذاب سے رہائی حاصل کرنے کی خواہش پیدا کرے گا، اور اس بنیاد پر ہم نہات کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیں گے۔ لیکن اگر دنیا کے متعلق ہمارا تصور چراگاہ اور دارالعباد دونوں سے مدتر ہو، اور انسان ہونے کی حیثیت سے ہم اپنے آپ کو حیوان اور مجرم دونوں سے زیادہ ارفع و اعلیٰ سمجھیں تو یقیناً ہمارے نفس کو مادی لذات کی طلب اور نہات کے حصول دونوں سے زیادہ بلند نصب العین کی تلاش ہوگی، اور کسی پست اور ادنیٰ سطح نظر پر ہماری نگاہ نہ ٹپکے گی۔

اس قاعدہ کو پیش نظر رکھ کر جب آپ دیکھیں گے کہ اسلام نے انسان کو خدا کا خلیفہ اور تدبیر نشین پر اس کا نائب قرار دیا ہے، تو اس تصور حیات سے جو نصب العین فطری طور پر پیدا ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے اس تک آپ کی عقل خود بخود پہنچ جائے گی ایک نائب کا بحیثیت نائب ہونے کے اس کے سوا اور کیا نصب العین ہونا چاہیئے کہ وہ جس کا نائب ہے اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرے اور اس کی نظر میں ایک اچھا، وقار، متدین اور فرض شناس ملازم قرار

پائے؟ اگر وہ کوئی سچا اور نیک فیت آدمی ہے تو کیا وہ اپنے آقاؐ کے
خدمت بجالانے میں اس کی رضا جوئی کے سوا کسی اور چیز کو اپنا مقصود
بناسکتا ہے؟ کیا وہ اپنا فرض اس بڑے بھالائے گا کہ اس کے معاوضہ
میں اس کو کوئی فتح کی طرح اور کسی ترقی یا انعام یا اضافہ مناسب یا جہاد و
منازات کی زیادتی کا لہجہ ہے؟ یہ دوسری بات ہے کہ آقاؐ اس سے
خوش ہو کر اسے یہ سب کچھ عطا کر دے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آقاؐ
اس کو حین خدمت کے صلہ میں ان چیزوں کے بخش دینے کی امید
دلے، اور اس میں بھی مضائقہ نہیں کہ خود اس کو یہ علم ہو کہ اگر میں
نے ٹھیک طور سے فرائض انعام دے کر اپنے آقاؐ کو خوش کر دیا تو
وہ مجھے یہ انعام دے گا۔ لیکن اگر اس نے انعام کو اپنا مقصود بنالیا،
اور اپنے فرائض منفعت کی خاطر انعام دیتے، تو کیا کوئی دانشمند
ایسے عاقل کو ایک فرض شناس عاقل کہہ سکتا ہے؟ اسی مثال پر غماز
اور اس کے نائب کے معاملہ کو بھی قیاس کیجئے۔ اگر انسان دوسرے
زمین پر خدا کا نائب ہے تو اس کی زندگی کا نصب العین خدا کی رضا
جوئی اور اس کی خوشنودی کے حصول کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟
یہ وہ نصب العین ہے جو اس تصور حیات سے خود عقل اور فطرت
پیدا کرتی ہے اور کسی ادنیٰ فرق کے بغیر ٹھیک یہی نصب العین ہے
جو اسلام نے انسان کے سامنے پیش کیا ہے۔ قرآن مجید کے ارشاد آقاؐ
کا تہج کرنے سے پہلے کو معلوم ہو گا کہ طرح طرح سے اسی ایک نصب
العین کو ذہن نشین کرنے اور قلب و روح میں بٹھا دینے کی کوشش
کی گئی ہے اور اس کے سوا ہر دوسرے طرح فکر کر کے دوسرے دوسرے
ساتھ ابھال کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ۔

قُلْ إِنَّا صَلَوقًا وَنُحْيَايَ وَمَتَابِقًا بَلَدًا

مَرَّتِ الطَّيْمُونُ لِأَشْرِيكَ لَمَّا وَهَذَا إِلَافُ أَوْزَتِ
وَأَنَا أَكُولُ الْمُسْلُوبُونَ۔ (الانعام۔ ۲۰)

”سے طیمون کہہ کر میری نمل اور میری جہالت اور میرا ہونا
اور میرا سب کے لشکر کے ہے جو تمام جہانوں کا سب سے اور
جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اسی کا علم دیا گیا ہے اور وہ
سب سے پہلے اس کے لئے سرنگھانے والا ہوں۔“

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ
وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ
اللَّهِ فَيُقتَلُونَ وَيُقتَلُونَ..... فَأَشْهَدُوا بِأَنَّهُمْ
الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ ۖ وَذَلِكَ هُوَ الْقَوْلُ الْعَظِيمُ
(التوبة۔ ۱۱)

”اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید
لیئے ہیں جن کے معاوضہ میں ان کے لئے جنت ہے۔ وہ اللہ کے
راہ میں جنگ کرتے ہیں، مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں.....
پس اس سوئے پر جو تم نے (اپنے خدا سے) کیا ہے خوشی ملنا
حقیقت میں یہی لڑی کا میابی ہے۔“

شورۂ بقرہ میں تاقرمان اور قرآن بردار بندے کا فرق بتاتے ہیں
قرآن بردار بندے کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ
مَرْضَاتِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔ (البقرہ۔ ۲۵)
”اور لوگوں میں سے ایک وہ ہے جو اپنی جان کو اللہ کے
خوشنودی کی خاطر بیچ دیتا ہے، اور اللہ اپنے بندوں پر شفقت
کرنے والا ہے۔“

سورۃ فتح میں مسلمانوں کی تعریف ہی کی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دوستی اور دشمنی اور جن کا رکوع و سجود سب کچھ اللہ کے لئے ہے۔

مُحَمَّدًا رَاسُ الْمَوْءِدِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ
عَلَى الْكُفَّارِ مَأْسُومًا وَبَيْنَهُمْ قُرْبَاهُ رُحَمَاءُ
يَجْتَنِبُونَ قِتْلًا وَفِي اللَّهِ يَحْتَوَانَا (نکاح-۲)

”محمدؐ اللہ کے پیچھے جوئے رسول ہیں۔ اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں دم دل ہیں۔ تم بیشک ان کو رکوع و سجود کرتے ہوئے دیکھتے ہو۔ یہ لوگ اللہ کے فضل احسان کی خوشنودی کے طلبگار ہیں۔“

سورۃ محمد میں کافروں کے اہمال خائے ہونے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ خدا کے لئے کچھ نہیں کہتے بلکہ دوسری اطرائس کے لئے عمل کر کے خدا کی ناخوشی مول لیتے ہیں۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ اتَّبَعُوا مَا أَصْحَبَ اللَّهَ وَكَرِهُوا
رِضْوَانَنَا فَأَصْحَبْنَا أَهْلَ الْهَيْمَةِ (نکاح-۲)

”ان پر مار اس لئے پڑے گی کہ انہوں نے اس چیز کی پیروی کی جس نے خدا کو ناخوش کر دیا اور انہوں نے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کو پسند نہ کیا۔ اس لئے اللہ نے ان کے اہمال اہستہ کر دیئے۔“

سورۃ حج میں خدا کی ایسی عبادت کو جو دنیوی فوائد کی خاطر ہو قلمنا سے نکال دیا اور موجب نامرادی قرار دیا گیا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّبِعُ اللَّهَ عَلَى حَرْفٍ
فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ مُّذِ الْهَيْمَةِ فَإِنْ أَصَابَتْهُ

فَلْيَسْمَعْ أَتَقْلِبْ عَلَىٰ وَجْهِكَ النَّاسُ وَالْآخِرَةُ
ذَٰلِكَ هُوَ الْغَضَبُ الْمُبِينُ۔ (نکاح ۲)

”اور لوگوں میں سے ایک وہ ہے جو اشد کی عبادت کرنے
دل سے کرتا ہے۔ اگر اس کو کوئی فائدہ پہنچ گیا تو اس سے مطمئن ہو
گیا اور اگر کوئی کینہش کا وقت آگیا تو اٹھ پھر گیا۔ ویسا شخص دنیا
اور آخرت دونوں میں نامراد ہوا۔ اور یہی صریح لکھا ہے۔“

سورۃ بقرہ میں بتایا گیا ہے کہ جو خیرات لوگوں کو دکھانے کے لئے کی
جائے اور جس مال کو دے کر کوئی احسان جتائے وہ باطل ہے۔ اس کی
مثال ایسی ہے کہ ایک چٹان پر تھوڑی سی مٹی پڑی تھی، تم نے اس میں
زیچہ بویا، مگر پانی کا سیلاب آیا اور اس کو بہا لے گیا۔ بخلاف اس کے
جو خیرات ثبات نفس کے ساتھ خاص خدا کی خوشنودی کے لئے کیا گئے
اس کی مثال ایسے بارش کی سی ہے جس پر اگر خوب بارش ہو تو دو چاند
پہل لگے اور اگر دھند کی بارش نہ ہو تب بھی ہلکی سی پھو بارش اس کے
پھلنے پھولنے کے لئے کافی ہو جائے۔ (نکاح ۳۶)

اس بات کو مختلف مقامات پر مختلف پیرایوں میں سمجھایا گیا ہے
کہ تم جو نیک عمل بھی کرو صرف خدا کی خوشنودی کے لئے کرو اور اس سے
کوئی اور غرض نہ رکھو۔

وَمَا تَنْتَعَزُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا تَنْتَعَزُوا وَمَا تَنْتَعَزُونَ
إِلَّا أَنْتُمْ وَأَنْتُمْ بِاللَّهِ۔ (انعام ۲۷)

”تم جو کچھ بھی خیرات کی مرضی غریب کو ملے اس کا فائدہ نہ کر
یہ کہتے ہیں، اور جو کچھ بھی تم غریب کہتے ہو صرف خدا ہی کی رضا
جوئی کے لئے کہتے ہو۔“

وَالَّذِينَ سَاءُوا بِالْإِسْلَامِ وَجَعَلُوا سَاءُ مَا يَحْكُمُونَ

الْمَلُوءَ وَأَنْفَعُوا مِمَّا زَكَّاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً
وَبِذِّكْرِكُمْ بِالْحَسَنَةِ الشَّيْئَةُ أَوْ لَيْتَ لَكُمْ عُقْبَى
الدَّارِ (الروم - ۴)

”اور جو لوگوں نے اپنے رب کی رضا عمل کے لئے سر کیا
اور نماز قائم کی اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا حق اس میں سے
بدوشہہ یا عا بر خرچ کیا اور جو لوگ مجھ سے بدی کو دفع کرتے ہیں
آخرت کا اجر ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے“

وَسَيُجَازِيهِمُ اللَّهُ الَّذِي يُؤْتِي مَالًا يَكْفِيهِ
وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى إِلَّا إِلَّا بِمَا كَانَ
يُحْسِنُ سَمِيًّا الْأَعْمَلِ وَلَسَوْفَ يَرْضَى (الزمر - ۳۵)

”اور عذاب دے گا وہ بڑا بڑا عذاب ہے جسے دے گا جو اس کی نفس
کے ساتھ اپنا مال دیتا ہے اس پر کسی کا کوئی اسماں نہیں ہے جس
کا بدلہ اسے دینا ہو بلکہ وہ صرف اپنے مال و دولت پروردگار کی خوشنودی
پاتا ہے اور ضرور وہ راضی ہو جائے گا“

قَالَتْ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقًّا وَالْمُشْكِينَ فَايِسَ الشَّيْءِ
ذَلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يُؤْتُونَ وَجْهَ اللَّهِ وَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُونَ (الروم - ۴)

”پس تو اپنے دشمن دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور سائل
کو (اس کا حق) دے بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو خوشنودی اپنی
پاس دیتے ہیں اور حقیقت میں وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں“
وَمَا آتَيْتُمُوهُمْ مِنْ شَيْءٍ لَّا يَشْكُرُوا وَجْهَ اللَّهِ
فَإُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضِلُّونَ (الروم - ۳)

”جو کچھ تم نے ان کو دیا وہی اور اس سے تم صرف شکریہ نہ شکر دے

حاصل کرتا چاہتے ہو تو جو لوگ ایسا کر رہے ہیں وہی اپنے غریب کو دیکھا
دیکھنا کر رہے ہیں۔

وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُدُودِهَا وَيُؤْتَوْنَ
وَأَسْرًا۔ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ
جَزَاءً وَلَا شُكُورًا۔ إِنَّا نَنقُذُكَ مِنْ ظُرْمٍ لَوْ مَا عَمِلْتُمْ
فَتُطْرِقُونَ۔ فَوَقَّعَهُ اللَّهُ شِرْكَكَ الْيَوْمِ وَلَقَدْ فَهَّمْنَا
نُظْرًا وَاسْمُومًا۔ (المزمل)

”اور اللہ کی محبت کی خاطر میںیں اللہ تعالیٰ اور اس کے لوگوں کو کھانے
اور پینے دیتے ہیں کہ ہم تم کو کھانے کے لیے کھانا نہیں دیتے۔ ہم تم سے کوئی
بھلا چاہتے ہیں اور شکر۔ ہم کو تو اپنے سب سے اس دن کا خوف دیکھا
دیکھا ہے۔ جب لوگوں کے منہ سے جھوٹے بھانے کے اور ان کے جھوٹے
برائیوں پر ہانپ لیا۔ یہی اللہ نے ان کو اس دن کے شر سے بچایا اور
کوئی بدلہ اور خوش حالی سے ہم انھیں کر دیا۔“

بِالْفَقْرِ وَالْمُحَاجِرِينَ الَّذِينَ أَخْرَجْنَا مِنْ دِيَارِهِمْ
وَأَمْوَالِهِمْ يُنَافِقُونَ قُلْ لَا يَمُنُّ إِلَّا الَّذِينَ وَفَّوْا
وَيُخْشَوْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ۔
(المشر)

”اے میں ان عرب لوگوں کا ضد ہی ہے جنہوں نے ہجرت کی
ہے اور جو اپنے گھروں اور جائیدادوں سے نکالے گئے ہیں (انھیں)
نے یہ سہ پہلے اس پر قبول کیا ہے کہ وہ اللہ کا فضل اور اس کی
خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کے کام آتے ہیں،
صدقہ سے ہی لوگ چکے ہیں۔“

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُكَفِّرُونَ فِي سَبِيلِهِ سَلَامًا

سَيَا لِقَدْ بَيَّنَّا فَرَضُوهَا (ص ۱)

”اللہ کی لوگوں کو پسند کرنے والی بات جو اس کی راہ میں اس طرح
مستعد ہو کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ ایک سیرت والی برکت و عبادت
ہو۔“

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
الَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ
(النساء: ۱)

”جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں

اور جو کافر ہیں وہ ظلم و سرکشی کی خاطر لڑتے ہیں۔“

اس تمام تعلیم کو صاحب جوامع الکلم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم
نے ایک جگہ میں ادا فرمایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا قاعدہ کلیہ
بیان فرمایا ہے جو تمام معاملات اور عبادات پر پوری طرح حاوی
ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا كَانَ

لَهُ خَالِصًا وَأَبَشْرًا

”اللہ صرف وہی عمل قبول کرتا ہے جو خالص اس کے لیے

کیا جائے اور جس سے محض اس کی رضا ہوئی مقصود ہو۔“

اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام نے ہر قسم کی فیزیکی
اور اخروی اغراض کو چھوڑ کر ایک چیز کو زندگی کا نصب العین اور انسان
کی تمام کوششوں کا مقصود، اور تمام اربادوں اور امتوں کی غایت
الطیبات قرار دیا ہے، اور وہ چیز اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی
کا حصول ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس نصب العین میں وہ کون
سی خصوصیات ہیں جو اس کو ایک بہترین نصب العین بناتی ہیں۔

وجود کے صرف اتنی کسر رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے اس طبعی نصب العین و شعور میں حاصل کر لے اور عقل و فکر کے ساتھ اس کو سمجھ کر اپنے لواحقوں اور اپنی نیتوں اور اپنی سعی و عمل کا نفع بھی اسی کی طرف ہی بھر دے۔ اس صورت میں اس کا عقلی نصب العین اس کے اور تمام موجودات کے طبعی نصب العین کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانے کا جہان ہستی کے سارے لشکر اور نظام وجود کے سب کل رُخسے اس مقصود تک پہنچنے میں اس کا ساتھ دیں گے اور وہ اپنے عقلی مرتبہ کے لحاظ سے اس عظیم اشیان قافلے کا سالار اور امام ہو گا۔ یہ عکس اس کے اگر اس نصب العین کو چھوڑ کر اس نے کسی اور چیز کو اپنا عقلی نصب العین بنایا تو اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص ایک قافلے کے ساتھ ہے۔ قافلہ مغرب کی جانب سفر کر رہا ہے، وہ شخص خود جس گھوڑے پر سوار ہے وہ بھی مغرب کی جانب دھڑک رہا ہے، لیکن اس بے ہوش مسافر کو خبر نہیں کہ قافلہ کا رخ اور اس کی اپنی سواری کا رخ کدھر ہے۔ اس کا دل مشرق میں لٹکا ہوا ہے۔ اُس نے اپنے گھوڑے کی دم کی طرف اپنا منہ کر رکھا ہے۔ حکام کھینچ کھینچ کر اور لڑی لگا لگا کر کوشش کر رہا ہے کہ گھوڑا اُٹھے پاؤں پٹے چند قدم وہ گھوڑے کو پیچھے کی طرف کھینچ بھی لے گا ہے، مگر قافلے کی روش اور خود اپنی طبعی روش سے مجبور ہو کر گھوڑا اسی مغرب سمت میں دوڑنے لگا ہے۔ غرض اس طرح یہ مسافر کشاں کشاں اپنی ریت اور اپنے اداے کے خلاف اسی منزل کی طرف جانے پر مجبور ہو جاتا ہے مگر ایک کامیاب اور بامراد مسافر کی طرح نہیں بلکہ ایک ناکام و نامراد مسافر کی طرح۔ کیونکہ اس نے جس چیز کو اپنی منزل مقصود قرار دیا ہے اس تک پہنچنا اسے نصیب نہیں ہوتا اور جہاں فی الواقع وہ پہنچ جاتا ہے وہ جگہ اس کی منزل مقصود ہوتی ہے اور نہ اس جگہ رہنے کے

لئے اس نے کوئی تیاری ہی کی ہوئی ہے۔

۲۔ نظام اسلامی کی قوت جاڑیہ

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، دین اسلام کے چھوٹے نظام کا مرکز اور مدار خدا کی ذات ہے۔ یہ پورا نظام اسی مرکز کے گرد گردش کرتا ہے اس نظام میں جو کچھ بھی ہے، خواہ وہ نیت و اعتقاد کے قبیل سے ہو یا پرستش و عبادت کے قبیل سے یا فرائض و زندگی کے معاملات میں سے، بہر نوع اور ہر کیفیت اس کا لائحہ اسی مرکزی سستی کی جانب پھرا ہوا ہے اور ہر چیز اس کی قوت جاڑیہ کے زبردست تاروں میں جکڑی ہوئی ہے خود لفظ دین (طاہریت) اور لفظ اسلام (گردن پہاڑی) جن سے اس خدائی نظام کو موسوم کیا گیا ہے، اپنے سستی کی فطرت و حقیقت پر بہترین دلالت کرتے ہیں۔ دین اور اسلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ بندہ اپنے خدا کی رضا کے آگے سر جھکا دے اور اسی کی مرضی کا تابع ہو جائے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَخَبِهًا بَلَاءٌ وَهُوَ

تَحْسِينٌ۔ (احسان)

”اس سے بہتر دین اور کس کا ہوگا جس نے اللہ کے آگے سربم

نم کردیا اور جو کچھ ہے۔“

وَمَنْ يُسْلِمْ وَخَبِهًا إِلَى اللَّهِ وَهُوَ تَحْسِينٌ فَتَحِي

اسْمُكَ بِالْعَزِيزَةِ الْوُثْقَى۔ (احسان-۲)

”جو کوئی اپنا اللہ خدا کی طرف پھیر دے اور اس کے ساتھ وہ لچک

کا دے، جو تو اس نے بڑی مضبوطی سے تھام لی۔“

اس سے بڑھ کر فطرت اسلام کا اندازہ اس چیز سے ہوتا ہے کہ جب

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے خدا کے آگے سربم نم کر دیتے ہیں، بیٹا یا نبی اعلانِ مافکونمؤ کہہ کر اپنے آپ کو پھری کے

حوالے کر دیتا ہے، اور باپ اپنے نسب جگر کو محض خدا کی خوشنودی کے لئے ذبح کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، تو ان دونوں کے اس فعل کو اسلام کے نقطے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فَلَمَّا آسَلَمُوا فَذَلَّلَا لِلْغَيْبِ (احزاب-۳)

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جو کچھ بھی ہے خدا کے لئے ہے۔ نہ اگر خدا کے لئے نہ ہو تو وہ ایک بے معنی ٹھکانہ ہے۔ نہ اگر خدا کے لئے نہ ہو تو وہ محض ایک ناقصہ۔ زکوٰۃ و خیرات اگر خدا کے لئے نہ ہو تو خیرات اور اتفاق فی سبیل اللہ ہے ورنہ محض اسراف و تبذیر۔ جنگ اور جہاد اگر خلافت و اللہ اور فی سبیل اللہ ہو تو بہترین جہاد ہے ورنہ محض ایک فساد اور تاحق کی تخریبی۔ اسی طرح دوسرے تمام افعال جن کا حکم اسلام میں دیا گیا ہے اگر خدا کے لئے نہ ہو تو وہ ایک اور قابلِ اجراء ورنہ بے فائدہ اور بے نتیجہ، اور ان سے اسلام نے منع کیا ہے اگر ان سے اعتنا نہ کیا کی خوشنودی کی خاطر کیا جائے تو مفید ہے ورنہ قطعاً لا حاصل۔

یہ زبردست مرکزیت اور یکسوئی جو اسلام کے نظام میں نظر آتی ہے اسی نصب العین کی پیدا کردہ ہے۔ یہی قوت ہاؤز ہے جس نے نظام اسلامی کے تمام اجزاء میں ایک طاقت اور مائل مرکز میلان پیدا کر دیا ہے، جس کی بدولت یہ نظام ویسا ہی ایک مکمل اور مضبوط نظام بن گیا ہے جیسا موجودہ زمانے کے علم ہیئت کی روش سے ہمارا نظام شمسی مکمل اور مضبوط ہے۔ اگر یہ نصب العین نہ رہتا تو دین اسلام میں یہ نظم بھی نہ ہوتا۔

۲۔ فکر و عمل کی یکسوئی

جس طرح اس نصب العین نے اسلام کے نظام دینی میں مرکزیت

یکسوئی، اور ضبط و نظم کی تربیت پیدا کی ہے، اُسی طرح یہ انسان کے افکار و خیالات، ادبیت و نیات، اور عقائد و اعمال میں بھی کامل یکسوئی پیدا کر دیتا ہے۔ اور یکسوئی کے ساتھ یہ اس کو ایک ایسے بلند سطح نظر اور ایک ایسے اعلیٰ و ارفع مقصد کی طرف ہمہ تن متوجہ کر دیتا ہے جس سے زیادہ بلند اور عالی شان اور رفیع المنزلت کوئی مقصد اور سطح نظر نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کے پیش نظر عنصر اپنی طبعی خواہشات کی تسکین یا انسانی اغراض کی تکمیل، یا مادی مقاصد کی تکمیل ہو، اسے کسی فکر و عمل کی یکسوئی میسر نہیں آ سکتی۔ کیونکہ عقل و ذہنی ارتقاء اور نظری و عملی کشمکش کے ہر مرحلے میں اس کے اندر نئی خواہشیں اور نئی رغبتیں پیدا ہوں گی اور وہ نئی نئی چیزوں کو اپنی غایت اور اپنا مقصد قرار دیتا چلا جائے گا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ علم اور عقل کے کسی اپنے مرحلے پر پہنچ کر انسان ابھی طبعی رغبتوں اور انسانی مادی مطالبوں پر رہا ہے جو اس سے پہلے کے پست تر مرحلے میں اس کے لئے ہادِیہ نظر اور محرک عمل تھے۔ اس طرح انسان کی تمام زندگی ایک متحدہ سے دوسرے مقصد کی طرف اشتغال میں بسر ہو جائے گی اور کبھی کوئی ایسا مرکزی خیال اس کے ذہن میں جاگزیں نہ ہو سکے گا جو اس کے افکار میں کامل یکسوئی پیدا کر دینے والا ہو اور جس کی راہ میں وہ اپنی تمام فکری اور عملی قوتیں صرف کر سکتا ہو۔ یہ خوبی صرف اسلامی نسب العین ہی میں ہے کہ وہ ہر مرتبہ علمی و عقلی میں انسان کا واحد نسب العین بن سکتا ہے اور کسی اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ پر بھی پہنچ کر اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ کیونکہ ہم جتنے عقل اور عملی مراتب کا تصور کر سکتے ہیں۔ خدا کی ذات ان سب سے اعلیٰ و ارفع ہے، اور اس کے باوجود ادنیٰ سے ادنیٰ مرتبہ کے لئے کہ بلند سے بلند مرتبہ تک ہر ایک کے ساتھ اس کا تعلق یکساں ہے

اگر فرق ہے تو وہ محض ہمارے عقل و شعور کے مراتب کے لحاظ سے ہے۔

۴۔ خالص بشری اجتماعیت کی شیرازہ بندی

پھر جس طرح یہ نصب العین ایک فرد کا نصب العین بن سکتا ہے۔ اسی طرح ایک جماعت، ایک قوم، بلکہ تمام نوع بشری کا نصب العین بھی بن سکتا ہے۔ اس میں سرے سے نفسانیت اور انفرادی یا اجتماعی خود غرضی کا وہ عنصر ہی موجود نہیں ہے جس کی طبیعی خاصیت یہ ہے کہ انسانیت کو نسلوں اور قوموں میں اور پھر افراد و اشخاص میں تقسیم کر دے اور ان کے اندر ایک دوسرے کے خلاف مقابلہ و مزاحمت اور بغض و حسد کے جذبات ابھارتا ہے۔ برعکس اس کے یہ نصب العین انسان کو اس راستی کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ جس کے ساتھ تمام نوع بشری، بلکہ تمام کائنات کا تعلق یکساں ہے اور جس کی طرف متوجہ ہو جانے کے بعد ہر جہت اور ہر حیثیت سے انسانی مقاصد میں ایسا اشتراک و اتحاد پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگوں میں مظاہر و مزاحمت تو ہر گز نہ ہو، تعاون اور مواصلت، اخوت اور بھائی بھائی کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ دنیا کے جتنے مادی مقاصد ہیں۔ ان کی راہ میں دو آدمی بھی ایک دوسرے کے پے در پے نہ ہو سکتے۔ بھائی اور بھائی، باپ اور بیٹے، ماں اور بیٹی کے لئے بھی ایک مادی مقصد میں مشترک ہو کر تراجم اور کشمکش، حتیٰ کہ عداوت اور دشمنی تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم نے خود غم اور خون کے تعلقات منقطع ہوتے دیکھے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بھائیوں نے بھائیوں کے گلے کاٹ دیئے ہیں۔ ہماری نگاہوں سے ایسے بے شمار مناظر گزرے ہیں اور گزرتے رہتے ہیں کہ قریب سے قریب عزیزوں نے دُشمنی

مقاصد کی خاطر ایک دوسرے کی جان، مال، عزت اور آبرو کو تباہ و برباد کر دیا۔ یہ سب اس انسانیت اور خود غرضی کی تاثیرات ہیں۔ جو انجروی اغراض و مقاصد کے عناصر ترکیبی میں سب سے اہم عنصر ہے لیکن ذاتِ حق وہ غایت الغایات ہے جس کی جانب لاکھوں کروڑوں انسان ایک وقت دوڑ سکتے ہیں بغیر اس کے کہ ان میں کوئی کشمکش مقابلہ اور مزاحمت ہو، اور کسی ایک شخص کو بھی دوسرے شخص کی ٹنگ لگے۔ بلکہ یہ سفر تو ایسا سفر ہے جس کا ہر مسافر دوسرے مسافر کی مسافر مدد کرتا ہے، اپنے آرام پر دوسرے کے آرام کو ترجیح دیتا ہے، اپنے مشقت کو دوسرے کی مشقت کے مقابلہ میں گوارا کر لیتا ہے۔ عیش آرام کے ساتھ جانے سے بددعا بہتر اس کو سمجھتا ہے کہ اپنے دوسرے ساتھیوں کا بوجھ ڈھو کر، دوسروں کی خدمت کے، ہاتھ، کاپٹا، تنکا، ماندہ، عرق عرق، منزل مقصود پر پہنچے اور اپنے مالک کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی حاصل کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ نسل، رنگ، زبان اور جغرافیہ مذہب کے اعتبار کو مٹا کر ایک عالمگیر قومیت کی تعمیر، اور ایک بین الاقوامی انسانی جمعیہ کی شیرازہ بندی کیلئے جس مرکزی ٹیکل کی ضرورت ہے، وہ اس انسانِ امین میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس قسم کی جہاگیر تہذیب کیلئے سے بہتر نسبتِ امین اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ ایک طرف فردِ انفرادیت کو بالکل فنا بھی نہیں کرتا، اور دوسری طرف انفرادیت کے تمام دافع المרכז میلانات کو مٹا کر اسے ایک خالص بشری اجتماعیت پوری طرح ضم بھی کر دیتا ہے۔

۵۔ تمام انسانی مرادات کا بالیقین حصول

اس نسبتِ امین کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ دنیا میں انفرادی

اور اجتماعی حیثیت سے انسان کے جتنے مقاصد ہو سکتے ہیں وہ سب اس کے تحقیق کے ساتھ بالقیح حاصل ہو جاتے ہیں۔ بغیر اس کے کہ انسان ان کو بالذات مقصود بنائے۔ قرآن مجید نے ایک ایک کر کے ان سب چیزوں کو گناہ سے جوڑ دیا ہے جو دشمنانِ الہی کے حصول کے ساتھ لازماً حاصل ہوتی ہیں۔

دنوی زندگی میں انسان سب سے زیادہ جس چیز کا خواہشمند ہوتا ہے وہ امن و سکون، راحت اور الطمانین قلب ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کی طرف رجوع کرو اور اس کی خوشنودی کے طالب ہو جاؤ، یہ چیز تم کو آپ سے آپ مل جائے گی۔

بَلْ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا وَقَالَ هَبْ لِي مِثْرًا
أَقْبِرْنَا جَوَّارًا وَمِنَ اللَّيْلِ فَسُوقُوا قُبُورَهُمْ
(احقاف - ۳۰)

”ہاں جس بھی نے میرے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور وہ دیکھ کر
ہنسا، تو اس کا اور اس کے ہندو گاہ کے پاس ہے۔ ایسے لوگوں کے
بائے کوئی خوف نہیں ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوتے ہیں۔“

أَلَا يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ أَنَّهُ ظَلَمَ
(الزمر - ۳)

”آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کی بات ہی سے دلوں کو الطمان نصیب

ہوتا ہے۔“

دوسری چیز جو انسان دنیا میں حاصل کرنا چاہتا ہے، خوشحالی ہے۔
یعنی ایسی زندگی جو پریشانی اور پرگندہ خاطر سے خالی ہو۔ قرآن کہتا
ہے کہ خدا پر ایمان لانے اور اس کے غضب سے بچنے اور اس کے
خاطر پر ہرزگاری و نیکی کاری۔ اختیار کرنے سے یہ چیز بھی بخش
و قبول حاصل ہو جاتی ہے۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ ۖ مَسَّوْا وَأَتَقُوا لَفَتَحْنَا
عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ ۖ وَالْأَمْرُ جَدِّ (الاحزاب: ۲۷)
”اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لیتے اور پرہیزگاری اختیار
کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین سے برکتوں کے حوالے کھول
دیتے۔“

مِنَ غَيْمٍ مَّالِحًا ۚ وَمِنَ ذُكْرِ أَوَّاسٍ ۚ وَهُوَ
مُؤْمِنٌ فَلْيُصْبِحْ بِأَسْمَاءِ خَلِيفَةً ۚ وَلْيَجْزِ بِهَا
أَجْرَهُ ۚ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْتَمِدُونَ۔ (الاحزاب: ۲۸)
”جیسا کہ پہلے ایک نیک کیا، اس حال میں کہ وہ مومن ہو تو وہ
وہ مرد ہوا نصرت، ہم اس کو خلیفہ عثمان کی زندگی بسر کرانے کے اور
یقیناً اسے لوگوں کو ہم ان کے عمل سے بہت زیادہ اچھا بدلہ دیا
کے۔“

تیسری چیز حکومت و فرمانروائی اور علم و سرپرستی ہے جو انسان
بڑی مطلوب و مرغوب چیز ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تم خدا کے ہو جاؤ،
منازع خود تمہارے قدموں میں کہے گی۔

وَمِنَ يُشَوِّكِي ۚ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ۚ وَالَّذِينَ ۖ مَسَّوْا
فَبِأَنَّ حَزْبًا أَلْفًا هُمُ الْغَالِبُونَ۔ (الاحزاب: ۲۹)
”جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور ایمان لےنے والوں کا
دوست ہو گیا (یہ دشمنی پائی میں شامل ہو گیا) اور اللہ کی پارتی، پھر
غالب ہونے والے ہے۔“

وَلَقَدْ أَكْثَبْنَا فِي الرُّكُوعِ ۚ وَمِنَ الْيَمِينِ ۚ
الْأَمْرُ مَن تَرَاهَا ۚ وَمِنَ الْغَالِبُونَ۔ (الاحزاب: ۳۰)
”اور ہم انہیں رُکوع میں پند نصرت کے بعد بات کھپکے کی کہ ان

کے واسطے تمام صلہ بند ہوں گے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ إِنَّمَا اشْتَلَيْتُمُ الدِّينَ مِن
قَبْلِهِمْ وَلَئِن كُنتُمْ لَهْفُكُمْ عَلَيْهِ وَتَوَلَّوْا فَيَكُنْ لَكُمْ
عَذَابٌ أَلِيمٌ (النور)

”تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے ان
سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ضرور ان کو زمین میں خلافت عطا کرے گا۔
جس طرح اس نے ان سے پہلے کب سے جوئے لوگوں کو علیہ السلام عطا
اور وہ ضرور ان کے اس دنیا کو استقام پاتے گا۔ جس کو اس نے ان
کے پہلے پسند کیا ہے، ان کی حالت خوف کے بعد ان کو اس عطا
کے گا۔“

اسی طرح اخروی زندگی میں نہایت انسان کی مطلوب ہے اور اس
کے متعلق بھی قرآن کہتا ہے کہ وہ ہر طرف خدا کی رضا اور اس کی خوشنودی
کے حاصل ہونے کا نتیجہ ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُنْتَهِيَّةُ إِنَّهُ جِئَ إِلَى رَبِّكَ
مَرَاهِدَةً مَّرْهُبَةً فَأَذْخِلِ فِي عِبَادِي وَأَذْخِلِ
جَنَّتِي۔ (الفرج)

”اے نفس مطمئن! اپنے پروردگار کی طرف واپس ہو اس حال
میں کہ تو اس سے ڈرتی ہے اور وہ تجھ سے ڈرتی ہے۔ ہر (خدا کے) گنا
کو (تو میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں نے جتنی چیزوں کو مقصود اور قیامت
قرار دیا ہے۔ اسلام نے ان کی طرف توجہ بھی نہیں کی، بلکہ اس چیز کو
اپنا مطلع ٹھہرنا چاہیے۔ جس کے حصول سے ہر سب چیزیں خود بخود حاصل

ہو جاتی ہیں۔ دوسرے جن چیزوں کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں ان کی نگاہ میں وہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ وہ ان کی طلب میں اپنے قدموں کو ایک لمحہ کے لئے بھی اٹھنے دے۔ اس کے پیش نظر تو ایک ایسا نصب العین ہے جو ان سب سے اور چاہی دستیابی کی ہر چیز سے اعلیٰ و اعلیٰ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جب اس بلند ترین مقصود کو وہ پہنچ جائے گا تو اس کے تحت جتنی چیزیں ہیں وہ اس کو آپ سے آپ حاصل ہو جائیں گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح عمارت کی سب سے اونچی منزل پر پہنچ جانے والا بچہ کی تمام مثال کو اپنے قدموں کے نیچے پا آتا ہے۔

۶۔ تقویٰ اور نیکو کاری کے لئے بہترین محرک

ایک اور خصوصیت اس نصب العین کی یہ ہے کہ اسلام پر بیزار گاری اور نیکو کاری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا ہے، اور اس کے ادا و مرو لوہائی کا جو ضابطہ پیش کیا ہے، اس کے اتباع پر انسان کو کرنے کے لئے صرف یہی نصب العین ایک شریعت اور پاکیزہ نصب العین ہو سکتا ہے۔

دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ ٹکی اس ہوئی چاہیئے کہ وہ ٹکی ہے اور ہدی سے اس لئے اہتمام ہونا چاہیئے کہ وہ ہدی ہے۔ لیکن جو لوگ دیکھتے ہیں ان کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ان کے اس قول کا مفہوم کیا ہے۔ ٹکی محض ٹکی کی خاطر کر کے معنی یہ ہیں کہ ہر قسم کے فوائد و منافع سے قطع نظر کہ ٹکی کیا ہو ٹکی ہے اور وہ انسان کی مقصود ہی ہو سکتی ہے۔ اور اسی طرح ہدی محض اس کی ہدی ہونے کی بنا پر اہتمام کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کے معنی ہدیوں اور نعمات سے محروم کر کے ہدی اپنی ذات میں ہدی ہے۔ اس کی ذات ہی کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے لئے قابل اہتمام

سکتی ہے۔ مگر حقیقتاً دنیا میں انسان کے لئے کسی ایسی خالص نیکی کا وجود ہی نہیں ہے جو ذاتِ فاعل کی طرف مائل نہ ہونے والے تمام فوائد و منافع سے مجرّد ہو۔ اور نہ کسی ایسی خالص بدی کا وجود ہے جو فاعل کی ذات کو پہنچنے والی جملہ مضرتوں سے خالی ہو۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں نیکی اور بدی کا تخیل ہی فائدے اور نقصان، منفعت اور مضرت کے تجربات سے پیدا ہوا ہے۔ انسان ہر اس فعل کو نیک کہتا ہے جس سے خود اس کی ذات کو کوئی حقیقی منفعت پہنچتی ہو خواہ وہ ظاہر نظر میں اپنے اندر کچھ منفعتیں بھی رکھتا ہو۔ اگر کسی فعل کو فائدے اور نقصان کے جملہ پہلوؤں سے مجرّد کر لیا جائے اور وہ فعل محض ایک حرکت رہ جائے تو ہم اس پر نیک یا بد ہونے کا کوئی حکم نہیں لگا سکتے اس میں شک نہیں کہ نیکی کا مفہم واضح ہو جائے اور بلند عقلی مراتب پر پہنچ جانے کے بعد یہ ممکن ہے کہ انسان فائدے اور نقصان کے تصور سے خالی الذہن ہو کر نیکی محض نیکی کی خاطر کرنے لگے اور بدی سے محض اسکے بدی ہونے کی بنا پر مجتنب رہے، لیکن اقول تو یہ فقط مبدئہٴ غیر و شر کی طرف سے ذہول ہے نہ کہ اس کی مبدئیت کا سبب وہ شر ہے محض فلسفیوں کے تخیل کی معراج ہے جس تک پہنچنا بڑے بڑے حکماء کو بھی نصیب نہیں ہوا ہے، پھر بھلا عام انسان مجرّد نیکی کے اعتبار اور مجرّد بدی سے اجتناب کو اپنا نصب العین کیونکر بنا سکتا ہے؟

۹

اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ نیکی اور بدی کے تصور کو فائدے اور نقصان کے تصور سے بچا نہیں کیا جاسکتا۔ نیکی فی نفسہ انسان کی مراد نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کی تہ میں کوئی فائدہ مضمر نہ ہو یا بدی بذات خود قلابی احراز قرار نہیں پاسکتی تاؤ تھیکہ اس کے باطن میں کوئی

نقصان پوشیدہ نہ ہو۔ اب اگر ہم تقویٰ اور نیکوکاری کو خود غرضی کے ادویہ مرتبے سے اٹھا کر بے نفسی اور خلوص کے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچانا اور اسے ایک ایسے ضابطہ اخلاق کی بنیاد قرار دینا چاہیں جو عوام و خواص سب کے لئے ہو، تو اس کی بہترین صورت یہی ہے کہ فائدے اور نقصان کا ایک ایسا معیار قائم کیا جائے جو مروت اور نفاذیت سے بالاتر ہو، جس کی بنیاد پر تمام مادی اور نفسانی نقصانات سے بھرپور بچنے کے باوجود ایک نیک عمل انسان کی نگاہ میں سراسر فائدوں سے ملور نظر آئے، اور ہر قسم کی منتفعیتوں سے بچنے کے باوجود ایک بُرا عمل اس کو سرتاپا نقصان محسوس ہو۔ یہی طریقہ اسلام نے اختیار کیا ہے اس نے دھائے الہی کے حصول و عدم حصول کو فائدے اور نقصان کا معیار قرار دیا ہے جو مادی اور نفسانی آکاشوں سے بالکل پاک ہے اس معیار کے مطابق ایک نیکوکار انسان اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی جان، مال، اولاد، نیک نامی، شہرت، ہر چیز کو قربان کر کے بھی یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ فائدہ میں ہے اور ایک بدکار انسان خدا کا غضب مولیٰ لینے کے بعد دنیا کے تمام مادی اور نفسانی فوائد حاصل کر کے بھی یہ خوف رکھتا ہے کہ وہ نقصان میں ہے۔ یہی چیز ہے جو انسان کو تمام دنیوی فائدوں اور نقصانوں سے بے نیاز کر کے خلوص بہت کے ساتھ تقویٰ اور نیکوکاری اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

یہاں تک دو اٹھو کی تشریح کی جا چکی ہے۔ ایک یہ کہ اسلام نے کس چیز کو زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے ؟ دوسرے یہ کہ وہ کس چیز سے ایک بہترین نصب العین ہے ؟ اب ہمیں اس مسئلہ کے تیسرے پہلو کی طرف نظر کرنی چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کو ایک مخصوص تہذیب بنانے میں اس نصب العین کا کیا حصہ ہے اور اس نے

اس تہذیب کو کون سی خصوصی شان بخشی ہے ؟
 طریقوں کے امتیاز میں مقصد کی تعین کا اثر

پہلے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ زندگی کے تمام
 معاملات میں ہر طرح مقصد کی تعین ضروری ہے اس طرح طریق حصول
 مقصد کی تعین بھی ضروری ہے۔ اور طریقہ کی تعین، مقصد کی مناسبت
 کے سوا کسی اور بنیاد پر نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی شخص کے پیش نظر غرض
 سلوک و سیر کے سوا کوئی حقیقت نہ ہو، مقصود نہ ہو اور وہ شخص راستوں
 اور گلیوں کی خاک چھاننا چاہے تو ہم اس کو بخون یا آلودہ گراہکتے ہیں
 اور اگر وہ مقصد تو رکھتا ہو، لیکن اس کی تحصیل کے مختلف طریقوں میں
 سے کسی خاص طریقہ کا پابند نہ ہو، بلکہ ہر اس طریقہ پہنچنے کے لئے تیار
 ہو جائے جس پر اسے موصل الی المقصود ہونے کا گمان ہو، تو اس کو
 ہم ہم احق قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اللہ نے عقل ایسا شخص کسی منزل
 مقصود تک نہیں پہنچ سکا جو ایک مقام کی طرف جانے کے لئے دوسرے
 مختلف راستوں پہنچنے کی کوشش کرتا ہو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنا
 مقصود تو کسی چیز کو قرار دے اور راستہ ایسا اختیار کرے جو اس کے
 مخالف سمت میں جانے والا ہو، تو اس کو بھی ہم صاحب عقل نہیں
 سمجھتے کیونکہ وہ اس اعلیٰ کے مانند ہے جو کہیں کی طرف جانے کے لئے
 ترکستان کی راہ پر چل رہا ہو۔ پس انسان کی عقل کامیابی کے لئے ضروری
 ہے کہ وہ سلوک کے لئے پہلے ایک مقصد متعین کرے، پھر اپنی عینوں
 اور کوششوں کا رخ اسی مقصد کی طرف پھیر دے، اور اگر اس مقصد
 تک پہنچنے کے بہت سے راستے ہوں تو ان میں سے ایک راستہ اختیار
 کرے جو اس کے نزدیک بہترین ہو، اور اس کے سوا دوسرے تمام
 راستوں کو چھوڑ دے۔

یہ ترک و اختیار میں مستقل عقل ہے۔ مقصد کی تعیین کا عقلی فیصلہ
 یہی ہے کہ جو طریقہ اس مقصد سے خاص طور پر مناسبت رکھتا ہو اس
 کو اختیار کیا جائے اور دوسرے تمام طریقوں کو ترک کر دیا جائے۔ ایک
 صاحب عقل کا وہی جب سفر کرتا ہے تو اسی ایک راستہ پر چلتا ہے جو منزل
 مقصود تک پہنچانے والے راستوں میں سب سے بہتر ہو۔ اس کے
 اور بیسیوں راستے جو اس کو دوران سفر میں ملتے ہیں ان کی طرف
 التفات بھی نہیں کرتا۔ ایک عقلمند طالب علم اپنے لئے علم کا وہی
 اختیار کرتا ہے جو اس کے نصب العین کی تکمیل میں سب سے زیادہ
 مددگار ہوتا ہے۔ دوسرے جتنے شعبے اس سے غیر متعلق ہوتے ہیں
 ان میں اپنا وقت اور اپنا داغ کھپانا پسند نہیں کرتا۔ ایک لڑیکہ وہ
 سوداگر اپنے لئے کاروبار کا وہی طریقہ اختیار کرتا ہے جو اسکے نزدیک
 حصول ثمر کا بہترین وسیلہ ہو سکتا ہو۔ ہر کام میں اپنا سرمایہ لگانا
 ہر پیشہ میں اپنی محنت صرف کرنا وہ حماقت سمجھتا ہے۔ اس ترک
 اختیار کے فعل پر ایک نقاد اگر بحث کر سکتا ہے تو صرف اس حیثیت
 سے کہ جو راستہ اختیار کیا گیا ہے وہ مقصود تک پہنچانے کے لئے
 بہترین ہے یا نہیں؟ لیکن نفس ترک و اختیار پر کوئی اعتراض
 نہیں ہے۔

یہ اصل جس طرح زندگی کے جزئی معاملات پر منطبق ہوتا ہے
 اسی طرح من حیث المجموع پوری زندگی پر بھی منطبق ہوتا ہے اگر
 اپنی زندگی کا کوئی مقصد رکھتا ہو، یا بالفاظ دیگر جیسے سے اس کا
 محض مہینا ہو تو وہ اکتاہٹ ہے کہ زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ چاہے
 کہ۔ اس کے لئے طریقوں کے درمیان اچھے اور بُرے، سچے
 غلط یا اور اسفل کا اختیار محض ہے معنی ہے۔ وہ اپنی خواہشات

عاجات کو جس طرح چاہے چھڑا کر سکتا ہے۔ بیرونی اسباب کسی مذہب سے ایک خاص طریقہ کی پابندی پر مجبور بھی کریں تو یہ اس کی زندگی کو کسی نظم اور ضابطہ کے تحت لانے میں کارگر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ انضباط کا کوئی مبدع محرک خود اس کے اپنے نفس میں موجود نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر وہ اپنے پیش نظر زندگی کا کوئی مقصد رکھتا ہو، یا اگر وہ صحیح الفاظ میں زندگی کے حیوانی طبیعی مقصد سے بالاتر کوئی عقلی انسانیت مقصد اس کے ذہن میں جاگزیں ہو، تو لازماً وہ طریقوں کے درمیان اختیار کرے گا اور اگر حقیقت میں وہ ایک صاحب عقل انسان ہے تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ کو جو اس کے مقصد کی تکمیل کے لئے زیادہ مناسب ہو اختیار کرے۔ ایک مقصد متعین کر لینے کے بعد طریقوں میں وہی آزادیاں رہتا جو ہر فرد ایک بے مقصد انسان کا حق ہے، اس کے لئے کسی طرح پابند نہ ہوگا۔

اب اس قاعدے کو ذرا وسیع کیجئے۔ فرد کی جگہ جماعت کو لے کر دیکھئے۔ یہی قاعدہ بالکل اسی طرح محمود افراد پر بھی جاری ہوتا ہے۔ ہم تک کوئی جماعت مذہبیت کے ابتدائی مدارج میں ہوتی ہے، اور زندگی کے حیوانی طبیعی مقاصد سے اعلیٰ و ارفع کوئی مقصد اس کے پیش نظر نہیں ہوتا، وہ اپنے طور طریقوں میں اسی طرح آزاد رہتی ہے جس طرح ایک بے مقصد انسان چھڑا کر رہتا ہے۔ مگر جب ایک ارتقاء عقل اور تہذیب دینی کے زیادہ اونچے مدارج پر پہنچ کر اس میں ایک تہذیب پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ تہذیب اس کے لئے اجتماعی زندگی کا کوئی عقلی مقصد متعین کر دیتی ہے، تو یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس مقصد کی مناسبت سے عقائد، تصورات، معاہدات، اخلاقی، نفسی، شرعی،

معیشت وغیرہ کے لئے ایک خاص نظام وضع کیا جائے، تہذیب کے متبعین کو اس نظام کا پابند بنایا جائے اور ان کے لئے اس امر کی آزادی باقی نہ رہنے دی جائے کہ وہ اس کے دائرے میں رہتے ہوئے کسی ایسے عقیدہ یا طریقہ عمل کو اختیار کر لیں جو اس نظام سے خارج ہو۔ اپنے اس ضابطہ کی حفاظت میں سختی کرنا تہذیب کی ضرورت کا عین مقتضائے ہے۔ اس باب میں جس تہذیب کی گرفت ڈھیلی ہوگی اور جس کی گرفت ضابطہ میں مشغول اور شستگی پائی جائے گی، وہ کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ تہذیب کا وجود مخصوص ہے اس کے عقیدہ اور عمل کا جو نظام اس نے وضع کیا ہے اس کے متبعین اس کی پابندی کریں۔ جب متبعین میں اس کی پابندی ہی نہ ہوگی اور اس نظام سے باہر کے تصورات اور طوور طریقے ان کے ذہن اور ان کی عملی زندگی پر قابض ہو جائیں گے تو تہذیب کا کوئی واقعی وجود باقی نہ رہے گا۔ لہذا ایک تہذیب اپنے متبعین سے اپنے وضع کردہ نظام کی پابندی کا مطالبہ کرنے اور دوسرے خارجی تعلقات سے پیشہ روی پر اصرار کرنے میں بالکل حق بجانب ہے۔ نقاد اگر کچھ کلام کر سکتا ہے تو اس کے مقصد کے صحیح یا غلط ہونے پر کر سکتا ہے، یا اس پر کر سکتا ہے کہ اس مقصد کیلئے یہ خاص طریقہ مناسب ہے یا نہیں، یا اس پر کر سکتا ہے کہ اس نظام کی پابندی تمام حالات میں ممکن ہے یا نہیں، لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس تہذیب کو اپنے متبعین سے اپنے وضع کردہ نظام کی پابندی کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

پھر جب یہ قاعدہ مسلم ہو چکا ہے کہ ذہنی اور عملی زندگی کے لئے جو خاص طریقے اور نتائج حقیقتیں کیے جاتے ہیں ان کی تعین حاصل مقصد کی نوعیت پر ملتی ہوتی ہے، اور مقصد کے امکانات سے طریقہ

اور جنہوں کا مختلف ہونا ضروری ہے، تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جو
 تہذیبیں اپنے مقاصد میں مختلف ہوں ان کے اعتقادی اور عملی نظامات
 لازمی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہونے چاہئیں۔ یہ ممکن ہے
 کہ وہ نظام اپنے بعض اجزاء میں باہم متضاد ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے
 کہ ایک نظام میں بعض جزئیات دوسرے نظام سے آگئی ہوں، لیکن نہ
 تو جڑی تشابہات سے کلی موافقت کا حکم نکالا جاسکتا ہے اور نہ جزئیات
 کے مستعار لینے سے کلی کا مستعار ہونا لازم آتا ہے۔
 اسی اصل سے دو قاصدے اور نکلتے ہیں۔

ایک یہ کہ ایک خاص مقصد رکھنے والی تہذیب کے نظام کو جاننے
 کے لئے دوسری جدا گانہ مقصد رکھنے والی تہذیب کے نظام کو معیار
 نہیں بنایا جاسکتا۔ یعنی تنقید کا یہ طریقہ درست نہیں ہے کہ یہ نظام اگر
 اس نظام سے مطابقت رکھتا ہے تو سہجہ ہے ورنہ غلط۔

دوسرے یہ کہ ایک تہذیب کو بہانے خود اپنی رکھتے ہوئے اس
 کے اعتقادی اور عملی نظام کو دوسرے نظام سے نہیں بدلا جاسکتا اور
 نہ ایک نظام کے اسی اجزاء دوسرے نظام میں داخل کئے جاسکتے ہیں
 جو شخص اس قسم کے غلط ملط کو ممکن یا درست سمجھتا ہے۔ وہ تہذیب
 کے اصول سے ناواقف ہے اور اس کے مزاج کو سمجھنے کی اہلیت نہیں
 رکھتا۔

اسلامی تہذیب کی تشکیل میں اس کے نصب العین کا حصہ
 ان معذات کو ذہن نشین کرنے کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی
 تہذیب کو ایک بالکل جدا گانہ اور مخصوص تہذیب بنانے میں اس کے
 نصب العین کا کیا حصہ ہے؟ پہلے مباحث میں یہ بات پوری تفصیل کے
 ساتھ بیان کی چکی ہے کہ اسلام نے زندگی کا جو نصب العین مقرر کیا ہے

وہ دوسرے اویان اور دوسری تہذیبوں کے نصب العین سے اسلاف مختلف ہے۔ اور یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ مقصد کے اختلاف سے اعتقاد و عمل کے نظام میں بنیادی اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ لہذا اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے نصب العین نے اس کو ایک ایسی خصوصیت عظیم بنادیا ہے جو بنیادی طور پر دوسری تہذیبوں سے مختلف ہے اور جس کا اعتقادی و عملی نظام دوسرے نظامات سے اس کی اختلاف دیکھ کر یہ ممکن ہے کہ اس نظام کے بعض اجزاء دوسرے نظامات میں بھی پائے جاتے ہوں، لیکن یہاں وہ اجزاء بعینہ اُس حیثیت سے مندرج نہیں ہیں جس حیثیت سے وہ دوسرے نظامات میں مندرج ہیں۔ کسی نظام میں مندرج ہونے کے بعد بڑی اپنی شخصیت کو گم کر کے گل کی طبیعت اختیار کر لیتا ہے اور جب ایک گل کی طبیعت دوسرے گل سے مختلف ہو تو لازماً اس کے ہر جزو کی طبیعت بھی دوسرے کے ہر جزو کی طبیعت سے مختلف ہوگی، خواہ اس کے بعض اجزاء اپنی ظاہری شکل میں دوسرے کے بعض اجزاء سے کتنی ہی مشابہت رکھتے ہوں۔

جیسا کہ بیان کیا چکا ہے اسلام نے انسان کو دنیا میں خدا کا نائب قرار دیا ہے اور اس کی زندگی کا مقصد یہ متعین کیا ہے کہ جس اتھا کا وہ نائب ہے اس کی خوشنودی حاصل کرے۔ یہ مقصد چ کر میں اس کی زندگی کا مقصد ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کی زندگی کے تمام اعمال کا نفع اسی مقصد کی طرف پھر جائے۔ اس کے نفس اور اس کے جسم کی تمام قوتیں اسی مقصد کی راہ میں صرف ہوں۔ اس کے خیالات و تصورات اور حرکات و سکنات پر اسی مقصد کی حکومت ہو۔ اس کا بیٹا اور مرزا، اس کا سوتا اور جاگتا، اس کا کھانا اور پینا، اس کے معاملات اور تعلقات، اس کی دوستی اور دشمنی، اس کی معیشت اور معاشرت، غرض اس کی ہر چیز اسی ایک

مقصد کے لئے ہو۔ اور یہ مقصد اس کے اندر اس طرح ساری و ہماری ہو جانے کہ گویا وہی اس کی وہ نیت ہے جس کی بدولت وہ زندہ اور متحرک ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی زندگی کا یہ مقصد رکھتا ہو، اور اسی مقصد کے لئے زندہ ہو، وہ اس شخص کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتا جس کے پیش نظر کوئی مقصد نہ ہو، یا اگر ہو بھی تو اس مقصد سے مختلف ہو۔ یہ مقصد تو اپنی بین فطرت کے اعتبار سے انسان کو ایک مامل اور کارکن ہستی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ایسا مامل اور کارکن جو زندہ ہے صرف اس لئے کہ اپنے زندگی کے مقصد کو حاصل کرے۔

پس یہ مقصد متعین کرنے کے بعد اسلام زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے ایک خاص طریقہ کو انتخاب کرتا ہے اور انسان کو مجبور کرتا ہے کہ اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ پر چل کر اپنے عزیز وقت اور اپنی قیمتی طاقتوں کو ضائع نہ کرے۔ وہ اس مقصد کے طبیعت و فطرت کے مطابق عقائد اور اعمال کا ایک جھڈا کاہ نظام وضع کرتا ہے اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس خاص نظام سے کسی حالت میں باز نہ جائے۔ وہ اس نظام کو سراسر اطاعت اور عین انقیاد قرار دیتا ہے، اس لئے اس کا نام ہی ”دین“ رکھ دیتا ہے جس کے معنی اطاعت اور انقیاد کے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔

۱۔ اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران: ۲)

”دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔“

اسی دین کی بنیاد پر وہ اپنے متبعین اور غیر متبعین کے درمیان خط امتیاز کھینچتا ہے جو لوگ اس خاص مقصد کے تحت اس نظام دینی کا اتباع کرتے ہیں ان کو وہ ”مسلم“ (اطاعت کر قبولے) اور ”مومن“ (ماننے والے) کہتا ہے۔ اور جو اس مقصد سے متعلق نہیں ہیں اور اس

نظام دین کا اتباع نہیں کرتے ان کو "کافر" (انکار کرنے والا) قرار دیتا ہے۔ وہ نسل، قوم، زبان، وطن اور ایسے ہی دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر اولاد آدم میں صرف اسی ایک کفر و ایمان کے امتیاز کو قائم کرتا ہے۔ جو کوئی اس کے نظام کا اتباع کرے وہ اس کا پتا ہے، خواہ وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں۔ اور اس کے نظام کا اتباع نہ کرے وہ غیر ہے، خواہ وہ بین کعبہ کی دیوار ہی کے نیچے کیوں نہ رہتا ہو، اور اس کے کی پڑی ہوئی مٹکی کچھڑوں اور زمزم کے پانی ہی سے کیوں نہ بنی ہو۔

جس طرح اس نے عقائد اور اعمال کی بنا پر انسانوں کے درمیان "کفر" اور "ایمان" کا امتیاز قائم کیا ہے اسی طرح زندگی بسر کرنے کے طریقوں اور دنیا کی تمام چیزوں کے درمیان بھی اس نے حرام اور حلال، ہائز اور ناہائز، مکروہ اور مستحب کا امتیاز قائم کیا ہے۔ جو اعمال اور طور طریقے اس کے مقصد کی تکمیل اور فرائض طاعت کی بہا آہی میں مددگار ہیں وہ اپنے مرتبہ کے لحاظ سے مستحب ہیں یا مکمل ہیں یا جائز۔

یہ لفظ کافر کے استعمال میں بھی ہے بغیر باخت سے کام لیا گیا ہے۔ لغت عرب میں "کفر" کے بنیادی معنی چھپانے کے ہیں۔ اسی لئے ناصت کو "کافر" کہا جاتا ہے کہ وہ سچ و عدل کو چھپا دیتی ہے۔ اور کسان کو بھی کافر کہتے ہیں کہ وہ سچ کو دین میں چھپا دیتا ہے۔ ان خوشے کو کافر کہتے ہیں کہ وہ پل کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے۔ پھر استفادہ کے طور پر لغت کو چھپانے اور اس کا شکر ادا نہ کرنے کو "کفر" اور "کفران" کہا گیا ہے۔ اسلام سے اس لفظ کو ایمان کی ضد قرار دیا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جو لوگ اسلام قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں وہ دراصل اپنی فطرت اور لغت پروردہ ڈالتے ہیں۔

اور جو اس میں مزامم اور مائع ہیں وہ اپنے مرتبہ کے لحاظ سے مکروہ ہیں یا ناجائز یا حرام۔ جو عموماً اس غلط اختیار کا احرام کرے وہ "مستحق" کہلائے گا۔ ہے اور جو اس کا احرام ذکرے وہ "فاسق" (مذکورہ سے بالکل ہٹنے والا) ہے۔ اللہ کی پادشاهی کے لوگوں میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا امتیاز بل دوست، یا حسب و نسب، یا مراتب معاشرت، یا رنگ کی سیائی، سبیدی پر مبنی نہیں ہے، بلکہ صرف "تقویٰ" کی بنا پر ہے **إِنَّ الْكَرَّهِيَّ** **جَسَدُ اللَّهِ أَفْضَلُكُمْ (المہرات-۲)۔**

اس طرح تصورات و افکار، اخلاق و خصال، معیشت و معاشرت، تمدن و عمران، سیاست و حکومت، غرض انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی تہذیب کا راستہ دوسری تہذیبوں کے راستے سے الگ ہو جاتا ہے۔ زندگی کے متعلق اسلام کا نظریہ دوسری تہذیبوں کے نظریہ سے الگ ہے۔ زندگی کا مقصد اسلام کے نزدیک اس مقصد سے مختلف ہے جو دوسری تہذیبوں نے متفق کیا ہے۔ لہذا اسلام اپنے نظریہ کے مطابق دنیا اور مافیہا سے جو شواہد برتا ہے، اور اپنے مقصد کی تحصیل کے لئے کئی نوعی زندگی میں جو طریقہ اختیار کرتا ہے، وہ بھی بنیادی طور پر اس شواہد اور اس طریقہ سے مختلف ہے جو دوسری تہذیبوں نے اختیار کیا ہے۔ ذہن کے بہت سے افکار و تصورات، نفس کے بہت سے میلانات و رجحانات، اور زندگی بسر کرنے کے بہت سے طریقے ایسے ہیں جن کا اتباع دوسری تہذیبوں کے نزدیک صرف جائز بلکہ پسند اوقات لازم تہذیب ہے مگر اسلام ان کو ناجائز، مکروہ اور بعض حالات میں حرام قرار دیتے پر مجبور ہے۔ اس لئے کہ وہ ان تہذیبوں کے تصور، حیات سے تین شواہد بتا سکتے ہیں اور ان کے مقصد زندگی کی تحصیل میں مددگار ہوتے ہیں، مگر اسلام کے تصور حیات سے ان کو کوئی نگاڑ

نہیں ہے یا اس کے مقصد زندگی کی تکمیل میں وہ مانع ہیں۔ مثال کے
 طور پر قانون لطیفہ دنیا کی بہت سی تہذیبوں میں ملتا ہے جہاں تہذیبیں اور ان
 قانون میں اعلیٰ مہارت رکھنے والوں کو قومی ہیرو کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے
 مگر اسلام ان میں سے بعض کو حرام، بعض کو منکر، اور بعض کو ایک حد
 تک جائز قرار دیتا ہے۔ اس کے قانون میں فوقی لطیف کی پرورش اور
 جمالی مصنوعی سے لطیف اندازی کی مہارت صرف اس حد تک ہے۔
 جہاں انسان اس کے ساتھ ساتھ خدا کو یاد رکھے، اس کی رضا جوئی
 کے لئے عمل کر سکے، اپنے منصب خلافت کے فرائض بجالا سکے مگر
 جس مقام پر یہ فوقی لطیف احساسی فرض پر غالب آجاتا ہو جہاں لطیف
 اندازی کا اہمک انسان کو خدا پرست کے بجائے محسن پرست بنا دیتا
 ہو، جہاں قانون لطیف کی چاشنی سے انسان کو بیش پسندی کا چمکا لگ
 جاتا ہو، جہاں اللہ قانون کے اثر سے ہدایت و ممانعت محسوس
 نہ ہو قوت و شدت حاصل کر لیتے ہوں کہ عقل کی گرفت ڈھیلی ہو جائے
 اور ضمیر کی آواز کے لئے دل کے کان بند ہو جائیں اور فرض کی پکار
 کے لئے سمع و طاعت باقی نہ رہے، ٹھیک ایسی سرمد پر اسلام عدم حیا
 کو بہت اور حرمت کے موانع قائم کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا مقصد
 ممانعت اور بندھن، مافی اور ہزار، چارلی، چیلن اور میری پکھوڑ پیدا
 کرنا نہیں ہے بلکہ وہ ایسا کر صدیق اور عمر فاروقؓ، علی بن ابی طالبؓ
 اور حسین ابن علیؓ، ابوذر غفاریؓ اور نابھہ ہزیرہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔
 یہی حال معاشرت اور تعلیم کے اور بہت سے معاملات میں بھی
 ہے جن کی تفصیلات کو اوپر کی مثال پر قیاس کیا جاسکتا ہے خصوصیت
 کے ساتھ مردوں اور عورتوں کے تعلقات، مالدار اور مفلس کے معاملات،
 دائمی اور زحمت کے روابط، اور انسانی طبقات کے باہمی برتاؤ کے حلقے

اسلام کا طریقہ تمام قدیم اور جدید تہذیبوں کے طریقہ سے اصول طور پر
 ممتاز ہے۔ اس پاسداری و دوسری تہذیبوں کے نظام کو معیار قرار دینا
 اور اسلام کے نظام کو اس پر جانچنے کی کوشش کرنا اسلام غلط ہے یہ لوگ
 ایسا کہتے ہیں وہ سچ ہیں اور حقیقت نا آشنا ہیں۔

باب سوم

اس کی افکار و عقائد

۱۔ ایمان کی حقیقت و اہمیت

سیرت اور اس کی ذراستی پیدا۔

تعلیم عمل کی پہلی شرط۔

ایمان کے معنی۔

تہذیب کی تاسیس میں ایمان کا اثر۔

ایمان کی دو قسمیں۔

۱۔ ایمانی ایمان ۲۔ دنیوی ایمان۔

چند اصولی کلیے۔

۲۔ اسلام کے ایمانیات

عقلی تنقید۔

اسلام میں ایمان کی اہمیت۔

عمل پر ایمان کا اہتمام۔

مسلمہ۔

ایک اعتراض۔

اعتراض کی تحقیق۔

۳۔ ایمان باللہ

ایمان باللہ کا اہمیت

ایمان باللہ کا تفصیلی عقیدہ۔

ایمان ہائے کے اخلاق فوائد۔

۱۔ وسعت نظر۔

۲۔ عزت نفس۔

۳۔ انکسار و خضوع۔

۴۔ قسط توقعات کا اطلاق۔

۵۔ رہائیت اور الینین تکب

۶۔ صبر و تحمل۔

۷۔ شہامت۔

۸۔ قناعت و استقامت۔

۹۔ اصلاح اخلاق و تنکیم اعمال۔

۱۰۔ ایمان بالسلامتکہ

ایمان بالسلامتکہ کا مقصد۔

نظام و حدود میں فرشتوں کی حقیقت۔

انسان اور فرشتوں کی اخلاقی حیثیت۔

۱۱۔ ایمان بالترسل

حقیقت رسالت۔

رسول اور عام رہنماؤں کا فرق۔

ایمان ہائے ایمان بالترسل کا تعلق۔

وحدت کلمہ۔

اتحاد و الامت و رسول۔

مقصد رسالت کی اہمیت۔

رسالت محمدی کے امتیازی خصائص۔

پہلے نبیوں اور رسالت محمدی کا فرق۔

دعوتِ عام۔

تکمیلِ دین۔

شیخ اور آپِ سالک۔

عقیدہ نبوت۔

عقیدہ محمدی کے لازمی اجزاء۔

۴۔ ایمان بالکتاب

رسالت اور کتاب کا تعلق۔

چودھ اور رہنمائی قرآنی مثال۔

تمام کتبِ کمال پر ایمان۔

ہر قرآن کا اتباع۔

قرآن کے متعلق تفصیلی عقیدہ۔

ہر مسلمان کی اس کتاب بنیاد۔

۵۔ ایمان بالیوم الآخر

چند فطری سوالات۔

حیاتِ اخروی کا انکار۔

اخلاق پر انکارِ آخرت کا اثر۔

ظہرِ تناسخ۔

عقلِ تنقید۔

تبدل پر عقیدہ تناسخ کا اثر۔

حیاتِ اخروی کا عقیدہ۔

عقلِ تحقیق کا صحیح طریقہ۔

حیاتِ اخروی پر منکرین کا اعتراض۔

قرآن مجید کا طرزِ استدلال۔

حیاتِ اخروی پر امکان
 نظامِ عالم ایک حکیمانہ نظام ہے۔
 حکیمانہ نظام ہے مقصد اور عمل نہیں ہو سکتا۔
 اقتضائے حکمت کے مطابق نظامِ عالم کا کیا انجام ہونا چاہیئے۔
 نظامِ عالم کا خاتمہ۔
 حیاتِ اخروی کا نظام کیا ہوگا۔
 اعتقادِ یومِ آخر کی ضرورت۔
 دنیا پر آخرت کی ترجیح۔
 نامہ اعمال اور عدالت۔
 اعتقادِ یومِ آخر کا فائدہ۔

۸۔ اسلامی تہذیب میں ایمان کی اہمیت

ایمانیات پر مجموعی نظر۔
 تہذیبِ اسلامی کا خاکہ۔
 تہذیبِ اسلامی میں ایمان کی اہمیت۔
 نفاق کا خطرہ۔

ضمیمہ ۱
 زندگی بعد موت۔

اساسی افکار و عقائد

۱۔ ایمان کی حقیقت و اہمیت

نظر پر حیات اور مقصد حیات سے گزر کر اب ہمارے سامنے تیسرا سوال آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام نے انسانی سیرت کی تعمیر کس بنیاد پر کی ہے؟

سیرت اور اس کی ذہنی بنیاد

انسان کے جملہ اعمال و افعال کا سرچرچا اس کا ذہن ہے۔ مہذبہ العال ہونے کی حیثیت سے ذہن کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت یہ ہے کہ اس میں کبھی خاص قسم کے خیالات راسخ نہ ہوں۔ مختلف پرآگندہ اور منتشر خیالات آتے رہیں اور ان سے جو خیال بھی قوی ہو وہی عمل کیلئے متحرک بن جائے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ وہ پرآگندہ خیالی کی نگاہ نگاہ نہ رہے بلکہ چند مخصوص خیالات اس میں اس طرح راسخ ہو جائیں کہ اس کی عمل زندگی مستقل طور پر انہی کے زیر اثر ہو، اور اس سے منتشر اعمال سرزد ہونے کے بجائے مرتب اور منضبط اعمال صادر ہوا کریں۔ پہلی حالت کو ہم ایک شرک سے تشبیہ دیتے ہیں جو ہر آنکھ و روئے کے لئے کشش ہوئی ہے، کبھی وارد و صادر کی اس میں تھپیس نہیں۔ دوسری حالت ایک ایسے سانچہ کی سی ہے جس میں سے ہمیشہ ایک متعین شکل و ریخت کے پٹرن سے ڈھل کر نکلتے ہیں۔ جب انسان کا ذہن پہلی حالت میں ہوتا ہے

تو ہم کہتے ہیں کہ اس کی کوئی سیرت نہیں ہے۔ وہ شیطان بھی ہو سکتا ہے اور فرشتہ بھی۔ اس کی طبیعت میں ٹکڑے ہیں۔ جن میں کیا ہوا سکتا ہے اس سے کہ کہیں قسم کے افعال کا صدور ہو۔ بخلاف اس کے جب وہ دنیا کی حالت میں آہٹا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ اپنی ایک سیرت رکھتا ہے۔ اس کی عمل زندگی میں ایک نظم ہے۔ ایک ترتیب ہے۔ اعتماد کیا ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کن حالات میں کیا فعل کرے گا۔

تنظیم عمل کی پہلی شرط

پہلی معلوم ہوا کہ انسان کی عمل زندگی کا ایک قابل اعتماد نظم و ترتیب اختیار کرنا منصب ہے اس پر کہ اس کی ایک مستقل سیرت بن جائے، اور سیرت کے بننے کا اعتماد اس پر ہے کہ اس کا ذہن پرانہ خیالی کی حالت سے نکل جائے، چند مخصوص خیالات اس کے اندر متشکل ہو جائیں، اور ان خیالات میں اتنا وسوسہ، اتنا جماؤ، اتنی مضبوطی ہو کہ کسی دوسری طرح کے خیالات کو آنے اور ذہن کی دنیا میں برائی پیدا کرنے کا موقع نہ دیں۔ یہ خیالات جتنے زیادہ گہرے ہوں گے، سیرت اتنی ہی زیادہ مضبوط ہوگی، اور انسان کی عمل زندگی اتنی ہی زیادہ مرتب، منظم اور قابل اعتماد ہوگی۔ یہ عکس اس کے ان میں جتنی کمزوری ہوگی، مخالف خیالات کو زیادہ دینے کی جتنی زیادہ صلاحیت ہوگی، اتنی ہی سیرت ہی کمزور ہوگی، اور عملی زندگی بھی اسی قدر بے نظم اور ناقابل وثوق ہو جائے گی۔

ایمان کے معنی

قرآن کی اصطلاح میں انسانی سیرت کی اسی ذہنی بنیاد کا نام ایمان ہے۔ ایمان کا لفظ مادہ "امن" سے نکلا ہے۔ امن کے اصلی معنی نقص کے مٹانے اور بے خوف ہو جانے کے ہیں۔ اسی سے دانت ہے جو خدا

ہے خیانت کی۔ یعنی امانت وہ ہے جس میں خیانت کا خوف نہ ہو۔ ایسا کو
ایمان اسی لئے کہتے ہیں کہ اسکی ٹھیک معاملگی پر دل ٹھک جاتا ہے، وثوق
ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملگی نہ کہے گا۔ جو اذنی غریب اور مصلح ہوتی ہے
اُس کو ائمہ کہتے ہیں، کیونکہ اس سے سرکشی اور شرارت کا خوف نہیں
ہوتا۔ اسی مادے کا آپ افعال "ایمان" ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ
نفس میں کوئی بات برائے تصدیق و یقین اس طرح بجائی جائے کہ
اب اس کے خلاف کسی بات کے راہ پانے اور داخل ہو جانے کا
خوف ہی باقی نہ رہے۔ ایمان کا کمزور ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ نفس اس
بات پر پوری طرح مطمئن نہیں ہوا، قلب کو پوری طرح سکون نہیں ہوا،
اُس کے خلاف باتوں کو بھی ذہن میں داخل ہو جانے کا موقع مل گیا۔
اسی سے سیرت کمزور ہوئی اور اس نے عمل زندگی میں بے عملی پیدا کر
دی۔ ایمان کا قوی اور مضبوط ہونا اس کا عکس ہے۔ مضبوط ایمان کے
معنی یہ ہیں کہ سیرت بالکل شمس اور یقینی بنیادوں پر قائم ہو گئی، اب
احتیاد کیا جاسکتا ہے کہ اعمال ٹھیک ٹھیک اُس عقل اور اُس مفکر کے
مطابق و مناسب صادر ہوں گے جو دل میں جم گیا ہے اور جس سے سیرت
کا سانچہ تیار ہوا ہے۔

تہذیب کی تاسیس میں ایمان کا مرتبہ

اگر مختلف افراد مختلف قسم کے عقائد و افکار پر ایمان رکھتے ہوں اور
ان کی سیرتیں مختلف و متضاد بنیادوں پر قائم ہو جائیں تو کوئی اجتماعی حیات
نہیں بن سکتی۔ ان کی مثال دسی ہوئی سیڑیے ایک میدان میں بہت سے پتھر
بکھرے پڑے ہوں۔ ہر پتھر بلاشبہ اپنی جگہ مضبوط ہے، مگر ان کے
درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اگر ایک ہی مشترک عقل
بہت سے افراد کے دلوں میں ایمان بن کر جم جائے تو اشتراک ایمانی

کا رابطہ ان کو ایک قوم بنا دے گا۔ گویا وہی پتھر جو بھروسے پڑے
تھے چوڑے سے چھڑ دیئے گئے اور ایک مضبوط دیوار قائم ہو گئی۔ اب
انکے درمیان مثال و متوازن شروع ہو جائے گا جس سے ترقی کی رفتار تیز اور
تیز تر ہوتی چلی جائے گی۔ ایک قسم کا ایمان ان کی سیرتوں میں ہم آہنگی
اور ان کے اعمال میں یک رنگی پیدا کر دے گا۔ اس سے ایک خاص
قدن پیدا ہو گا۔ ایک خاص شان کی تہذیب ظاہر ہوگی۔ ایک نئی قوم
نئی سیرت، نئی ذہنیت، نئے خیالات، نئے طریق عمل کے ساتھ اٹھے
گی اور اپنی تہذیب کا قہر ایک نئے انداز پر تعمیر کرے گی۔

اس تحریر سے آپ نے سمجھ لیا کہ ایک تہذیب میں اس اس
تحقیق کا کیا مرتبہ ہے جو اجتماعی طور پر اس تہذیب کے متبعین میں ایمان
بن کر باخ ہو جائے۔
ایمان کی دو قسمیں

اب بھی دیکھنا چاہیئے کہ ایمان کے اعتبار سے دنیا کی تمام تہذیبوں
کا کیا حال ہے۔ ایمان کا لفظ اصل میں تو ایک مذہبی اصطلاح ہے، مگر
چونکہ یہاں ہم اس کو اسی تحقیق کے معنی میں بول رہے ہیں اس لیے
اس معنی میں ایمان کی دو قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں۔ ایک وہ ایمان جو
مذہبی نوعیت رکھتا ہو۔ مذہبی نوعیت کا ایمان صرف اس تہذیب کی
اساس بن سکتا ہے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ کیونکہ اس صورت میں
ایک ہی ایمان دین اور دنیا دونوں پر حکمران ہوتا ہے۔ مگر جس تہذیب کی
بنیاد مذہب پر نہ ہو اس میں مذہبی ایمان مذہبی ایمان سے الگ ہو جاتا
ہے اور مذہبی ایمان کا شخصی و قومی زندگی پر کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔

۱۔ مذہبی ایمان

مذہبی ایمان عموماً ایسے امور پر ہوتا ہے جو انسانی سیرت کو متاثر

اور اخلاقی بنیادوں پر تعمیر کرتے ہیں۔ مثلاً ایک یا متعدد مہبود ہیں جن کی مخصوص صفات سے مقصد کیا گیا ہو، کتابیں جن کا الہامی ہونا تسلیم کر لیا گیا ہو، اور پیشوا جن کی تعلیم اور سنت پر اعتقاد و عمل کی بنیاد رکھی ہو۔ دینی نقطہ نظر کو چھوڑ کر غاص و ذمیوی نقطہ نظر سے اس کے ایمان کی کامیابی دو چیزوں پر منحصر ہے۔ ایک یہ کہ مذہب سے جن امور کی تصدیق کرنے اور جن پر یقین کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ عقلی اعتبار سے قابل تصدیق ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ ایسے امور ہوں جن کی بنیاد پر انسانی سیرت کی تعمیر صحیح طور سے ہو سکتی ہو۔ وہ سیرت کو اس طرح سے بنائیں کہ اس کی روحانیت ایک اعلیٰ درجہ کے نظام اخلاقی کی بنیاد بن سکے، اور اس کا اخلاق اپنی زندگی و جہاد کے ساتھ ساتھ دنیوی زندگی میں بھی انسان کو کامیابی حاصل کرنے کے لئے مستعد کرنے والا ہو۔

پہلی شرط اس لئے ضروری ہے کہ اگر ایمانیات محض اوہام کا مجموعہ ہوں، یا ان میں اوہام زیادہ اور معقولات کم ہوں تو انسان کے لئے ان پر ان کا استیلاء، کلیتہً جہالت و نادانی کا زہر بار منت رہے گا۔ جو کہ ارتقاء کے عقل کے بلند مدارج کی طرف انسان نے قدم اٹھانے کا اوہام باطل کا طلسم ٹوٹنا شروع ہو جائے گا، ایمان کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں گی، اور اس کے ساتھ ہی روحانیت اور اخلاق کا سارا نظام بھی درہم برہم ہوتا چلا جائے گا جس پر شخصی اور قومی سیرت کی بنیادیں اٹھانی گئی تھیں۔ اس کی مثال میں ہم ان اختلافات کو پیش کر سکتے ہیں جو مختلف مشرکانہ مذاہب نے دیوتاؤں مہبودوں اور اخلاق اور پیشواؤں کے متعلق پیش کیے ہیں۔ ان کو جن صفات سے مقصد کیا گیا ہے، جو اعمال ان کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، جو فلسفے

کے متعلق لکھ رہے تھے، وہ ایسے ہیں کہ عقل سلیم ان کی تصدیق کرنے اور ان پر ایمان لانے سے انکار کرتی ہے۔ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ ان پر اعتبار رکھنے والی قوم دنیا میں ترقی اور غلبہ حاصل کرنے کے قابل ہی نہیں ہوتی۔ باطل اور باہم اس کے ذہن پر ایسا بُرا اثر ڈالتے ہیں کہ عقل کی بہترین قوتیں ششمر کر رہ جاتی ہیں۔ نہ حوصلوں میں دہندی پیدا ہوتی ہے، نہ عزائم میں شدت، نہ نگاہ میں وسعت، نہ صلاح میں بے شکا نہ دل میں جرات۔ اگر کار بھی چیز اس قوم کے لئے دائمی نجات و دولت مقہوری اور خلائی کا سبب بن جاتی ہے۔ برعکس اس کے جن قوموں پر کچھ دوسرے اسباب سے ترقی کی راہیں کھل جاتی ہیں وہ عقل و علم کے اعتبار سے جتنی ترقی کرتی جاتی ہیں اپنے عقائد، مہجودوں اور پیشواؤں پر سے ان کا اعتماد اُٹتا ہوتا ہے۔ اول اول محض تعلیم اجتماعی کے تحت کی خاطر ان غلط ایمانیات کو مسئلہ برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ ان کے خلاف دل اور صلاح کی بغاوت اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ اگر کار قوم کے ذہن پر ان کے لئے کوئی گرفت باقی نہیں رہتی۔ صرف ایک مختصر سا رُومانی گروہ الگ پر حقیقی یا پیشہ وارانہ یقین رکھنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے اور باقی ساری قوم کے نفس و دُوح پر ایک دوسرے ایمان کا تسلط ہو جاتا ہے جس کو ہم نے دُنیوی ایمان سے تعبیر کیا ہے۔

دوسری شرط کا ضروری ہونا بالکل ظاہر ہے جو ایمانیات انسان کو دُنیوی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں کر سکتے ان کا اثر محض رُومانی اور اخلاقی زندگی تک محدود رہتا ہے۔ مادی زندگی تک نہیں پہنچنے پاک۔ نتائج کے اعتبار سے یہ بھی دو حصوں سے خلی نہیں ہے۔ یا تو ان کی بدولت وہ قوم ترقی ہی نہ کرے گی جو ان کی معتقد ہو

گی۔ یا ترقی کرے گی تو بہت جلد ان کی گرفت سے نکل جائے گی۔ مذہب کا ایمان تہذیب کے ایمان کے لئے جگہ خالی کر دے گا، اور جب مادی زندگی کی سعی و عمل میں قوم کا اہمک ٹٹھے گا تو اخلاقی و روحانیت بھی مذہبی ایمانیات کے اثر سے آزاد ہو جائیں گے۔

میں خدا کسی مذہب کی تختیں نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے تفصیل کے ساتھ مختلف مذاہب کے ایمانیات پر کوئی کلام نہ کروں گا۔ آپ غلبہ کا طور سے مطالعہ کریں گے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح بعض مذاہب کے ایمانیات نے ان کے معتقدین کو دنیوی زندگی میں ترقی کرنے سے روکا ہے اور کس طرح مذاہب کے ایمانیات علم و عقل کی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکے ہیں۔ پھر یہ بھی آپ سمجھیں گے کہ دوسری قوموں نے تنزیل کی حالت میں اپنی مذہبی معتقدات پر ایمان رکھا اور ترقی کی حالت میں ان کو چھوڑ دیا۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے ایمان میں سب سے زیادہ مضبوط اس وقت تھے جب وہ دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھے، اور ان کے ایمان میں کمزوری آئی تو اس وقت جب کہ وہ عقل میں، علم میں، دنیوی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور دوسری قومیں ان پر غالب آ گئیں۔ آج مسلمان انتہائی تنزیل کی حالت میں ہیں، اور اس کے ساتھ ضعیف ایمانی کے مرض میں بھی شدت کے ساتھ مبتلا ہیں۔ اب سے ہزار بارہ سو برس پہلے وہ انتہائی ترقی کی حالت میں تھے، اور اس کے ساتھ اپنے مذہبی ایمان میں انتہا و درجہ کے مضبوط بھی تھے۔ بخلاف اس کے یودھ کے کسی اور مہاپان کے یودھی جب پکے کسی اور یودھی تھے تو حد درجہ تنزیل کی حالت میں تھے، اور جب انہوں نے ترقی کی تو مسیحیت اور ہودیت پر ان کا ایمان نہ رہا۔ یہ اسلام کے ایمانیات اور دوسرے مذاہب کے

ایمانیات کا ایسا نمایاں فرق ہے جس کو باوقار تاجی ہر صاحب عقل و بصیرت انسان محسوس کر سکتا ہے۔

۲۔ دنیوی ایمان

اب دوسری طرف ان ایمانیات پر نظر ڈالیں جن کو ہم دنیوی ایمانیات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان میں کوئی مذہبی عنصر شامل نہیں ہے۔ نہ یہاں کوئی خدا ہے، نہ کوئی مذہبی پیشوا، نہ کوئی الہامی کتاب، نہ کوئی ایسی تعلیم جو انسانی سیرت کو روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر تعمیر کرنے والی ہو۔ یہ فاعل دنیوی امور ہیں۔

ان میں سب سے بڑی چیز ”قوم“ ہے جسے ایک خاص رقبے کے رہنے والے لوگ معبود بنا کر پورے غلوں و اٹھماک کے ساتھ پوجتے ہیں۔ تمام ”قوم پرست“ اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ قوم ان کی جان و مال کی مالک ہے، اس کی خدمت و حفاظت فرض ہے، اس کی خدمت میں جان دینا اور اس پر قن من و حن نہ کر دینا عین سعادت ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ جتن سکتے ہیں کہ انہی کی قوم برحق ہے، وہی زمین کی وارث اور مستحق ہے، دنیا کی تمام نعمتیں اور دنیا کی ساری قومیں اس کے لیے خنائم اور سہایا کی حیثیت رکھتی ہیں، ہر شخص کا فرض ہے کہ سادے جہان میں اپنی قوم کا علم بلند کرے۔

دوسرا معبود ملک کا ”قانون“ ہے جس کو وہ خود بناتے ہیں اور پھر خود ہی اس کی عبادت کرتے ہیں۔ یہی عبادت ان کے اجتماعی ضبط و نظم کی ضامن ہے۔

تیسرا معبود ان کا اپنا ”نفس“ ہے جس کی پرورش، بچہ کی حاجات و ضروریات کی تکمیل، اور جس کے حاجات و خواہشات کی تکمیل ہر وقت ان کے پیش نظر رہتی ہے۔

چوتھا معبود ”علم و حکمت“ ہے جس پر وہ ایمان لائے
کی روشنی میں چلتے ہیں، اور جس کی رہنمائی میں ترقی کی راہیں
بھرتے ہیں۔

یہ ایمانیات یقیناً دنیوی زندگی کے لئے ایک مضبوط
قلع نظر اس سے کہ حق اور صداقت کے اعتبار سے ان کا یہ
خاص دنیوی نقطہ نظر سے بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا فائدہ
صرف اپنا ہے۔ ان کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان میں کوئی
اخلاقی عنصر شامل نہیں ہوتا، اس لئے مذہب کا دامن ہاتھ
چھوٹے ہی اخلاقی مفاسد کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ قانون
نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں میں سائنہ اخلاق پیدا کرے۔
میں اخلاق کا کوئی معیار قائم کر دے۔ نہ اس میں اتنی قوت
شخص و اجتماعی زندگی میں اخلاق کی حفاظت کر سکے۔ اس کا
دائرہ عمل محدود ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ وہ قانون
خود بناتے ہیں اس معاملہ میں اور بھی زیادہ ہے جس طرح
اس لئے کہ ایسے قانون کی گرفت کو تنگ اور ڈھیلہ کرنا تو
اپنے اختیار میں ہے، جتنی جتنی آزادی عمل کی خواہش لوگوں
میں ہے، پُرانی اخلاقی بندشیں تنگ اور ناممکن برداشت
نہیں رہتی ہیں۔ اور جب کسی اخلاقی بندش کے متعلق یہ احساس
ہے تو رائے عام کا دباؤ قانون کو اپنے بند ڈھیلے کرنے پر
ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اخلاق کے سارے بند کھل جاتے
عام اخلاقی انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ اور اخلاقی انحطاط
جس کے مہلک اثرات کو نہ دولت کی فراوانی روک سکتی ہے
کا زور، نہ مادی وسائل کی قوت، نہ علم و حکمت کی تدابیر

ہے جو اللہ سے لگا شروع ہو تا ہے اور مضبوط سے مضبوط عمارت کو اس کے ساتھ مسلمان سمیت لے بیٹھا ہے۔

اس کے علاوہ قوم پرستی اور نفس پرستی کے جو دوسرے مفساد ہیں وہ اتنے نمایاں ہیں کہ ان کے بیان میں کچھ زیادہ تفصیل کے حاجت نہیں ہے۔ اب تو ان کو بگھنے کے لئے کسی بحث و نظر کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ وہ نظریات سے گزر کر محسوسات و مشاہدات کے درجہ میں آ گئے ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ آج انجلی کی بدولت ایک بہت بڑی تہذیب و طاقت و دہائی کے سرے پر پہنچ گئی ہے اور وہ انجلی کے ناکام ہیں۔ جی کے جینی جیسور کا اندیشہ آج تمام دنیا کو لرزہ بر اندام کیئے ہوئے ہے۔

چند اصول یکے

اس تمام بحث سے چند اصول یکے مستنبط ہوتے ہیں جن کو آئندہ مباحث کی طرف تجاوز کرنے سے پہلے ایک ترتیب وار کے ساتھ ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

۱۔ انسانی عمل کا مضبوط اور مضبوط ہونا منحصر ہے اس پر کہ اس کی ایک مستقل اور متعین سیرت بن جائے۔ کسی مستقل سیرت کے بغیر انسان کی عملی زندگی پر گندہ خلون اور ناقابل وثوق رہتی ہے۔

۲۔ سیرت کی بنیاد اُن تصورات پر قائم ہوتی ہے جو ذہن میں پورے قوت کے ساتھ راسخ ہو جائیں، اور اتنا قلبہ ماسل کر لیں کہ انسان کی ساری عملی قوتیں انہیں کے زیر اثر رہ کر کام کرنے لگیں۔ اس موضوع کا اصطلاحی نام ”ایمان شبہ“ اور اس طرح راسخ ہو جانے والے تصورات کو ہم ”ایمانیات“ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

۳۔ سیرت کی اچھی اور بُری صبح اور غلط، مضبوط اور کمزور تشکیل

کلیدِ اِمانی "ایمانِ حقیقی" کی صحت اور ان کے رسوم پر منحصر ہے۔
 صبح ہوں تو سیرت بھی صبح ہوگی۔ ایمان مضبوط ہو تو سیرت
 مضبوط ہوگی۔ ورنہ معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔ لہذا انسان کی زندگی
 کو ایک صبح اور اعلیٰ درجہ کے نظم میں لانے کے لئے ناگزیر ہے۔
 اس کی سیرت کو ایک صبح اور مضبوط ایمان پر قائم کیا جائے۔
 ۴۔ جس طرح شخص واحد کے اعمالِ حیات کو پرانگی سے نکال کر
 مضبوط اور نظم کے تحت لانے کے لئے ایمان کی ضرورت ہے اُن
 طرح بہت سے اشخاص کو انتشار اور تفرقہ کی حالت سے نکال کر
 نظم اور متحد جمیعت بنادینے کے لئے ضروری ہے کہ ان سب
 دلوں میں ایک ہی مشترک ایمان بٹھا دیا جائے۔ پس تمدن کا مفاد
 کا متعلق ہے کہ ایمان کا معاملہ جس شخص ذہن سے ہے بلکہ قومیت کا
 اتحاد ان ہائے۔

۵۔ جب ایک مشترک ایمان کے زیر اثر بہت سے افراد میں
 مشترک قوی سیرت بن جاتی ہے اور اس سیرت کے اثر سے ان
 زندگی کے اعمال میں ایک طرح کی یکدگی پیدا ہوتی ہے تو ایک خاص
 وائز کی تہذیب وجود میں آتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر تہذیب
 تاسیس اور تشکیل میں ان ایمانیات کا بڑا دخل ہے جو قوی سیرت
 بناتے اور پختہ کرتے ہیں۔

۶۔ جس قوم کے ایمانیات روحانی امور پر مشتمل ہوتے ہیں
 کا مذہب اور اس کی تہذیب دونوں ایک ہوتے ہیں، اور جس کے ایمان
 مادی امور پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کی تہذیب اس کے مذہب
 جدا ہو جاتی ہے۔ اس دوسری صورت میں شخصی اور قومی زندگی پر مذہب
 کا کوئی خاص اثر باقی نہیں رہتا۔

۷۔ تہذیب کا مذہب سے اگلا ہو جانا آخر کار اخلاقی انحطاط اور
تباہی کا موجب ہوتا ہے۔

۸۔ تہذیب کا مذہب کے زیر اثر رہنا منحصر ہے اس پر کہ مذہب
کے ایمانیات ایسے روحانی امور پر مشتمل ہوں جو اولاً خارج سے
کر بلند ترین مدارج تک انسان کے ارتقائے عقلی کا ساتھ دے سکیں
اور جن سے انسانی سیرت کی تشکیل اس طرح بر ہو کہ وہ بیک وقت
اعلیٰ درجہ کا دیندار بھی ہو اور دنیا دار بھی۔ بلکہ اس کی دنیا داری میں
دینداری ہو اور دینداری میں دنیا داری۔

۹۔ جس قوم کا مذہب و تہذیب دونوں ایکٹ ہوں اُس کا ایمان
نرا مذہبی ایمان ہی نہیں ہوتا بلکہ بیہم و نہی ایمان بھی ہوتا ہے۔
اس کے ایمان کا حیران ہونا اس کے مذہب اور اس کی تہذیب دونوں
پائے غارت گر ہے، اس کی دنیا اور اس کے دین دونوں کے لئے تہ
کنی ہے۔

یہی وہ اصولی کلیہ ہیں جن کے لحاظ سے ہم کو ایمان کے حلقوں
کے موقف پر تنقیدی نگاہ ڈالنی ہے۔

ایمان کی حیثیت، شخصی کردار میں اس کی بنیادی اہمیت اور
تہذیب میں اس کی اساسی حیثیت کے بعد آپ دیکھنے کو اسلام
کے چیزوں پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے؟ اس کے ایمانیات
تنقید کے معیار پر کس حد تک چمکے اُترتے ہیں؟ اس کے نظام
ایمان کی حیثیت کیا ہے؟ اور انسان کے شخصی کردار اور اجتماعی سیرت
پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے؟

اسلام کے ایمانیات

قرآن مجید میں اسلام کے ایمانیات اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں کہ ان میں کسی اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے مگر جن لوگوں نے قرآن کے اسلوب بیان کو نہیں سمجھا ہے، یا اس کے مضامین کا تتبع نہیں کیا ہے، ان کو چند در چند غلط فہمیاں ہو گئی ہیں۔ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ کہیں وہ تمام ایمانیات کو یکجا بیان کر لے، اور کہیں موقع و محل کے لحاظ سے بعض احوال یا صورت ایک جڑ بیان کرے اسی پر زور دیتا ہے۔ اس سے بعض لوگ یہ سمجھ بیٹھے کہ اسلام کے ایمانیات کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ان میں سے کسی ایک یا بعض پر ایمان لانا کافی ہے، اور اہل حق کے انکار کرنے کے باوجود انسان نجات پا سکتا ہے۔ مگر قرآن کا ناظر فیصلہ یہ ہے کہ جتنے امور اس نے ایمانیات کے طور پر پیش کیے ہیں ان سب کو ماننا ضروری ہے۔ ان کو ایک ٹکڑے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سب مل کر ایک ناقابل تجزیہ و تحلیل کل بناتے ہیں جس کو صیغہ خَوَاتَمُ النَّجْوٰۃِ تسلیم کرنا چاہیئے۔ اگر ان میں سے ایک کا بھی انکار کیا گیا تو وہ باقی سب کے اقرار کو باطل کر دے گا۔ قرآن میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ

إِنَّ الْإِيْمَانَ قَالُوا بِمَا آمَنُوا قُلْ آمَنُوا بِمَا تُشْكُرُونَ

عَلَيْكُمْ الْمَلَائِكَةُ (علم السہو - ۴)

اس آیت میں صرف خدا پر ایمان لانے کا ذکر ہے اور اسی پر دنیا و آخرت کی کامیابی کا مشرور مقرر کیا گیا ہے۔

دوسری جگہ خدا کے ساتھ یوم اکڑ کا بھی ذکر ہے۔
 مَن آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ
 أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (البقرہ)

یہی مضمون آکل عمران (۱۲) مائدہ (۱۰) اور رعد (۲) میں بھی ہے۔
 تیسری جگہ خدا اور رسولوں پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔
 فَأَمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُؤْمِنُوا فَتَمَنَّوْا لَكُمْ
 أَجْرُ غَوْلٍ (آکل عمران ۵۱)

یہی مضمون حدید (۲) میں بھی ہے۔
 ایک اور جگہ ایمان دار اس شخص کو کہا گیا ہے جو خدا اور محمد صلی اللہ
 علیہ وسلم پر ایمان لائے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ
 (النور ۶۰)

محمد (۳) جن (۲) اور الفتح (۲) میں اسی مضمون کا اضافہ ہے۔
 ایک جگہ خدا، کتب الہی، قرآن اور یوم آخر، پادھیزوں کا ذکر

ہے۔
 وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ
 مِن قَبْلِكَ وَالْمُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

الْآخِرِ (النساء ۴۲)

ایک اور جگہ خدا، ملاک، انبیاء اور قرآن کے انکار کو کفر و فسق قرار
 دیا گیا ہے۔

مَن كَانَ عَدُوًّا لِلّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ
 وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ وَلَقَدْ
 أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا الْإِسْلَامُ

فَلْيَايِسُوا (البقرہ۔ ۱۲)

ایک جگہ اللہ، ملاک، کُتبِ الٰہی، انجیل اور قرآن پر ایمان لایوالوں کو مومن کہا گیا ہے۔

أَمِنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ
كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَعَلَىٰ كُتُبِهِ وَكَتُبِهِمْ وَرُسُلِهِمْ۔

(البقرہ۔ ۴۰)

دوسری جگہ ایمان کے پانچ اجزاء بیان کیے گئے ہیں۔ ایمان باللہ، یومِ آخر و ملاک و کتبِ الٰہی و انجیل۔

وَكَيْفَ الْيَوْمَ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَآلِئِكَ
الْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ
الْعَذَابُ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَكَبِّرُونَ۔ (البقرہ۔ ۲۲)

سُورۃ النّٰس میں مذکورہ بالا پانچ کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن پر بھی ایمان لانے کی تاکید کی گئی ہے اور ان کا انکار کرنے والوں کو کافر اور گمراہ قرار دیا گیا ہے (ملاحظہ ہو رکوع ۲۰)۔

ایک جگہ صرف یومِ آخر کے اقرار پر زور دیا گیا ہے اور اس کے انکار کو نامردی کا سبب بتلایا گیا ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاللّٰهِ۔ (انعام۔ ۴)

اسی مضمون کا اعادہ اعراف (۱۷)، یونس (۱۰)، فرقان (۲) نمل (۱۱)

صافات (۱۵) میں ہے۔

دوسری جگہ یومِ آخر کے ساتھ کُتبِ الٰہی کے انکار کو بھی عذاب

ایم کا موجب قرار دیا گیا ہے۔

إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا

بِكَذَا أَهْلًا (المائدہ ۱)

تیسری جگہ یوم آخر اور کتب الہی کے ساتھ قرآن کو بھی ایمانیات میں شامل کیا گیا ہے۔

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ
مِن قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ
هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔

(المائدہ ۱)

چوتھے مقام پر کہا گیا ہے کہ یوم آخر، کتب الہی اور انبیاء کے احکام سے تمام اعمال پر پانی پھر رہا ہے۔ ایسا شخص فلاحی ہے اور اس کے عمل کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ (حکمت ۴)

کتب الہی پر ایمان لانے کا اوپر بار بار ذکر آیا ہے اور ان میں تورات، انجیل، زبور اور صحیفہ ابراہیمؑ کے نام تصریح کے ساتھ لگائے گئے ہیں۔ مگر قرآن میں تیسریوں مقالات پر یہ بھی صاف کہہ دیا گیا ہے کہ ان کتابوں کا ماننا ہرگز کافی نہیں ہے۔ ان کے ساتھ قرآن کا ماننا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص تمام کتابوں کو ماننا ہو اور قرآن کو نہ ماننا ہو، تو وہ اسی طرح کافر ہے جس طرح تمام کتابوں کا احکام کرنے والا۔ ملاحظہ ہو یقرہ (۱۱-۱۲-۱۳-۱۴) فسار (۷) مائدہ (۲-۱۰) رعد (۲) حاکموت (۵) زمر (۴) یہی نہیں بلکہ خدا کی نیکی ہوئی میری طرف کو پھرا پھرا ماننا لازم ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی بعض باتوں کو ماننے اور بعض کو نہ ماننے تو وہ بھی کافر ہے۔ (المائدہ ۱۰)

اسی طرح انبیاء کے متعلق تصریح ہے کہ ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے جن کے نام لگے ہیں ان پر تفسیراً اور جن کے نام نہیں ہیں ان پر ایماناً۔ لیکن اگر کوئی شخص تمام انبیاء پر ایمان رکھتا ہو اور صرف

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کر دے تو وہ یقیناً کافر ہے قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں مقامات پر اس کی تصدیق کی گئی ہے اور تمام انبیاء کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اقرار کو ایمان کی لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔ ملائکہ ہو یقرؤ (۱۳) نساہ (۲۳) مائدہ (۲-۳-۴) انعام (۱۸) اعراف (۱۹-۲۰) انفال (۳) مؤمنون (۴) شوری (۵) محمد (۱) طلاق (۲)۔ ان میں سے اکثر آیات ایسی ہیں جن میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی امتوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ جب تک تم قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہ لاؤ تم کو ہدایت نہیں ملی سکتی۔ ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ اسلام کے ایمانیات پانچ ہیں۔

۱۔ خدا۔

۲۔ ملائکہ۔

۳۔ کتب الہی، جن میں قرآن بھی شامل ہے۔

۴۔ انبیاء عظیم اسلام، جن میں رسولی عرضی محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بھی شامل ہیں۔

۵۔ یوم آخر یعنی قیامت۔

۱۔ اگرچہ حدیث میں ایک جہش بیخ کا ذکر بھی آیا ہے، یعنی وَالْقَدَمُ خَيْرٌ مِنْ شَرِّهِ وَشَرُّهُ مِنْ أَثَرِهِ تَعَالَى، لیکن دراصل یہ ایمان باللہ ہی کا ایک حصہ ہے اور قرآن میں اسی جہشیت سے اس کو بیان کیا گیا ہے۔ حدیث میں اس کے علاوہ ذکر کی وجہ مبرور ہے کہ ایمان باللہ کا یہ جزو اہم بھی ہے اور خفی بھی، اس لیے قیامت میں اس کو مستحضر رکھنے کی خاطر علاوہ ذکر کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔

یہ اجمال ہے۔ آگے چل کر بتایا جائے گا کہ ان میں سے ہر ایک کے متعلق تفصیل عقیدہ کیا ہے؟ ان میں باہم کیا تعلق ہے جس کی وجہ سے ان کو الگ نہیں کیا جاسکتا اور ایک کے انکار سے سب کا انکار لازم آتا ہے؟ اور ان میں سے ہر ایک کو ایمانیات میں داخل کرنے کا فائدہ کیا ہے؟

عقلی تنقید

یہ پانچوں ایمانیات امور غیب کے قبیل سے ہیں اور معلوم نہیں محل سے ماوراء، اس لئے ہماری تقسیم کے مطابق یہ مذہبی و دنیوی ایمانیات ہیں۔ لیکن ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام نے ان پر اپنے دنیوی نظام ہی کی نہیں بلکہ اخلاقی و سیاسی اور تمدنی نظام کی بھی بنیاد رکھی ہے اس نے دین اور دنیا دونوں کو باہم ملکر ایک ایسا نظام وضع کیا ہے۔ جس کے تحت انسانی زندگی کے تمام شعبے حرکت کرتے ہیں۔ اس نظام کو اپنے قیام و بقا اور اپنے تعمرات کے لئے جتنی طاقت کی ضرورت ہے وہ سب انہی پانچوں ایمانیات سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ اس کے لئے قوت کا ایک لامتناہی سرچشمہ ہیں جس کی مدد کبھی بند نہیں ہوتی۔ اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ جن ایمانیات سے اتنا بڑا کام کیا گیا ہے وہ عقل حیثیت سے کیا پایہ رکھتے ہیں؟ اور ان میں ایک ایسے ہمگیر اور ترقی پذیر نظام کے لئے اساس اور منبع قوت بننے کی کہاں تک صلاحیت موجود ہے؟

اس سوال کی تحقیق میں قدم آگے بڑھانے سے پہلے ہم کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اسلام ایک ایسی تہذیب کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے جو صحیح معنوں میں انسانی تہذیب ہو۔ یعنی اس کا تعلق کسی خاص ملک یا نسل کے لوگوں سے نہ ہو، نہ کوئی مخصوص رنگ رکھنے والی یا مخصوص

زبان بولنے والی قوم اس کے ساتھ احساس رکھتی ہو، بلکہ تمام نوع
انسانی کی فلاح اس کی مقصود ہو، اور اس کے زیر اثر ایک ایسا نظام
اجتماعی قائم ہو سکے جس میں ہر اُس چیز کو پرورش کیا جائے جو انسان
کے لئے بحیثیت انسان ہونے کے خیر و صلاح ہے، اور ہر اُس چیز
کو مٹایا جائے جو اس کے لئے شر اور فساد ہے۔ ایسی ایک خاص
انسانی تہذیب کی بنیاد ان ایمانیات پر نہیں رکھی جاسکتی جو عالم آب و
گل سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس لیے کہ مادیات اور محسوسات دو ممالک
سے خالی نہیں ہیں۔ یا تو وہ ایسے ہیں جن کے ساتھ تمام انسانوں کا
تعلق یکساں ہے، مثلاً سوچ، چاند، زمین، ہوا، روشنی وغیرہ۔ ایسے
ہیں جن کے ساتھ تمام انسانوں کا تعلق یکساں نہیں ہے، مثلاً وطن،
نسل، رنگ، زبان وغیرہ۔ پہلی قسم کی چیزوں میں تو ایمانیات بننے کی
صلاحیت ہی نہیں ہے، کیونکہ ان کے نفس وجود پر ایمان لانا تو محض
بے معنی ہے، اور ان پر اس حیثیت سے ایمان لانا کہ وہ انسان کی فلاح
میں کوئی اختیاری تاثیر رکھتے ہیں اندوئے ظلم و قتل لفظ ہے۔ علاوہ
ہذا ان پر کسی حیثیت سے بھی ایمان لانے کا کوئی نفع انسان کی دنیاوی
اخلاقی اور عملی زندگی میں مرتب نہیں ہوتا۔ دوسری قسم کی چیزیں
تو ظاہر ہے کہ وہ ایک مشرک انسانی تہذیب کے لیے اساس نہیں
بن سکتیں، کیونکہ وہ بنائے تفریق و تقسیم ہیں نہ کہ بنائے جمع و تائید۔
لہذا یہ قطعاً ناگزیر ہے کہ اس قسم کی تہذیب کی بنیاد ایسے ایمانیات پر
رکھی جائے جو مادیات و محسوسات سے ماوراء ہوں۔

لیکن ان کا محض مادیات و محسوسات سے ماوراء ہونا ہی کافی
نہیں ہے، اس کے ساتھ ضرورت ہے کہ ان میں چند اور خصوصیات
بھی پائی جائیں۔

۱۔ وہ خواہشات اور اوہام نہ ہوں بلکہ ایسے اُمور ہوں جن کی تصدیق پر عقل سلیم مانگ جو سکتی ہو۔

۲۔ وہ فوراً کاربائیں نہ ہوں بلکہ ہماری زندگی سے ان کا بہرہ تعلق ہو۔

۳۔ ان میں ایسی مصنوعی قوت ہو جس سے تہذیب کا نظام انسان کے قوائے فکر و عمل پر تسلط کرنے میں پوری طرح مدد حاصل کر سکے۔ اس لحاظ سے جب ہم اسلام کے ایمانیات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان تینوں آگاہیوں میں پورے اترتے ہیں۔ اولاً اسلام نے خدا، ملائکہ، وحی، رسالت اور عجم آخر کا جو تصور پیش کیا ہے اس میں کوئی استغناء عقل نہیں ہے۔ اس کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا صحیح ہونا غیر ممکن ہو۔ نہ کوئی ایسی بات ہے جس کو ملتے سے عقل سلیم انکار کرتی ہو۔ اس میں شکاٹ نہیں کہ عقل ان کا ابطال نہیں کر سکتی۔ اس کی کڑھک نہیں پہنچ سکتی۔ انکی حقیقتوں کو کا حشر نہیں کچھ سکتی۔ لیکن علم الہی، علم و حکمت نے اب تک جتنے تجرعات و مفارقات کی تصدیق کی ہے ان سب کا بھی ملال ہے تو انائی (انرجی)، حیات، جذب و کشش، نشو و ارتقار اور ایسے ہی دوسرے اُمور کی تصدیق ہم نے اس بنا پر نہیں کی ہے کہ ہم ان کچھ حقیقتوں کو پوری طرح سمجھ چکے ہیں، بلکہ اس بنا پر کی ہے کہ ہم نے جن مختلف قسم کے مخصوص آثار کا مشاہدہ کیا ہے ان کی توجہ و تعمیل کے لئے ہمارے نزدیک ان اُمور کا موجود ہونا ضروری ہے اور ظاہر اشیا کے باطنی نظام کے متعلق جو نظریات ہم نے قائم کیے ہیں وہ ان اُمور کے موجود ہونے کا اقتضا کرتے ہیں۔ پس اسلام جن تجرعات پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے ان کی تصدیق کے لئے بھی ضروری

نہیں ہے کہ ہماری عقل ان کی حیثیتوں کو پوری طرح سمجھ لے اور ان کا احاطہ کر لے، بلکہ اس کے لئے عقلی طور پر صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ کائنات اور انسان کے متعلق جو نظریہ اسلام نے پیش کیا ہے وہ خلافت عقل نہیں ہے، اس کا صحیح ہونا اغلب ہے اور وہ ان پانچوں امور کے وجود کا منطقی ہے جو اسلام نے ایمانیات کے طور پر پیش کیے ہیں۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ
۱۔ کائنات کا نظم ایک قادر مطلق ہستی کا قائم کیا ہوا ہے اور
وہی اس کو چلا رہی ہے۔

۲۔ اس قادر مطلق ہستی کے ماتحت بے شمار دوسری ہستیاں ہیں جو اس کے احکام کے مطابق اس وسیع کائنات کی تدبیر کر رہی ہیں۔
۳۔ انسان کے وجود میں اس کے خالق نے خیر اور شر دونوں کے میلانات رکھے ہیں۔ دائی اور تارائی، علم اور جہل دونوں کا اسکے اندر اجتماع ہے۔ غلط اور صحیح دونوں طرح کے راستوں پر وہ چل سکتا ہے۔ ان متضاد قوتوں اور مختلف میلانات میں سے جس کا ظہر ہوتا ہے اس کی پیروی انسان کرنے لگتا ہے۔

۴۔ اس تباہ و برباد خیر و شر میں خیر کی قوتوں کو مدد پہنچانے اور انسان کو سیدھی راہ دکھانے کے لئے اس کا خالق خود بخود انسان کی ہی سے ایک ہمترازی کو انتخاب کرتا ہے اور اس کو علم صحیح عطا کر کے لوگوں کی ہدایت پر مامور کرتا ہے۔

۵۔ انسان کوئی غیر ذمہ دار اور غیر مسئول ہستی نہیں ہے۔ وہ اپنے تمام اختیاری اعمال کے لئے اپنے خالق کے سامنے جوابدہ ہے۔ ایک دن اس کو ذمہ ذمہ کا حساب دینا ہوگا اور اپنے اعمال کے

اچھے یا بُرے نتائج دیکھتے ہوں گے۔

یہ نظریے خدا، ملائکہ وحی، رسالت اور یوم آخر پانچوں اُمود کے وجود کا مقتضی ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو عقلی محال ہو۔ نہ اس کی کسی چیز کو وہیمات و خرافات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ برعکس اس کے ہم اس پر جس قدر زیادہ غور کرتے ہیں اُسی قدر اس کی تصدیق کی جانب ہمارا میلان بڑھتا جاتا ہے۔

خدا کی حقیقت خواہ ہماری سمجھ میں نہ آئے، مگر اس کا وجود تسلیم کیئے بغیر چارہ نہیں۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر کائنات کا سوا کسی طرح حل نہیں ہوتا۔

ملائکہ کے وجود کی کیفیت ہم متعین نہیں کر سکتے مگر ان کے نفس وجود میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ تمام اہل علم و حکمت نے ان کو کتبِ ہستی کو کسی نہ کسی طور پر تسلیم کیا ہے۔ اگرچہ وہ ان کو اُس نام سے یاد نہیں کرتے جس سے قرآن انہیں موسوم کرتا ہے۔

قیامت کا آنا اور ایک نہ ایک دن دُنیا کے نظام کا زوال ہم پر عزم ہو جانا عقلی قیاسات کی نکتہ سے اغلب بلکہ قریب بہ یقین ہے۔

انسان کا اپنے خدا کے آگے جوابدہ ہونا اور اپنے اعمال کے پتے مستوجب جزا و سزا ہونا کسی قطعی دلیل سے ثابت نہیں کیا جاسکتا، مگر عقلی تسلیم اس حد تک تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ انسان کی موت اور موت کے بعد کی حالت کے متعلق جتنے نظریے قائم کیئے گئے ہیں ان میں سے سب سے زیادہ بہتر، تجرید خیز، اور اقرب الی الحقیقہ نظریہ یہ ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔

زبا وحی اور رسالت کا مسئلہ تو یہ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی ماضی نہ تھا نہ ثبوت نہیں پیش کیا جاسکتا۔ مگر جن کتالوں کو وحی الہی کی حیثیت سے

پیش کیا گیا ہے ان کے معافی، اور جن لوگوں کو خدا کا رسول کہا گیا ہے ان کی سیرتوں پر خود کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نوح انسانی کے افکار و اعمال پر ان کے برابر گہرے، وسیع پائیدار اور مفید اثرات کسی رہنما نے نہیں ڈالے۔ یہ بات اس امر کا یقین کرنے کے لئے کافی ہے کہ ان میں کوئی غیر معمولی بات ضرور تھی جو نہ انسانی تصنیفات کو ظہور سے ہے اور نہ معمول انسانی پیشوں کو۔

اس بیان سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام کے ایمان عقل کے خلاف نہیں ہیں۔ عقل کے پاس ان کی تکریب کے لئے کسی قسم کا مواد نہیں ہے۔ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ عقل اور عقل ارتقاء کے کسی مرتبہ پر پہنچ کر انسان ان کو نہ کر دیتے پرچھوڑ دے۔ بلکہ اس کے برعکس عقل ان کی اعلیٰیت کا حکم لگاتی ہے۔ ایمان اور تصدیق کا معاملہ، تو اس کا تعلق عقل سے نہیں ہے، وجدان اور ضمیر سے ہے۔ ہم جتنے مجربات اور فیضیات کو مانتے ہیں ان میں سے کسی تصدیق دراصل ہمارے وجدان پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر کسی امر غیبی کو ہم نہ ماننا چاہیں، یا ہملا دل اس پر نہ ٹھکتا ہو، تو کسی عقل دلیل سے ہم کو اس کی تصدیق پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر ایضاً وجود پر جتنے دلائل قائم کیے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس میں طوریہ اس کو ثابت کر دیتا ہو اور اس کی صحت میں شک کی گنجائش نہ چھوڑتا ہو۔ انہی دلائل کو دیکھ کر بعض اہل حکمت اس پر ایمان لے گئے ہیں، اور انہی کو بعض دوسرے حکماء نا کافی سمجھ کر ایمان نہ سے انکار کر دیتے ہیں۔ پس تصدیق و ایمان کا انحصار دراصل ضمیر و الطوبان اور وجدان کی گواہی پر ہے۔ البتہ عقل کا اس میں اتنا دخل ضرور ہے کہ جن کی تصدیق عقل کے خلاف ہوتی ہے ان کے بارے

میں وہ جان اور عقل کے درمیان کشمکش برپا ہوتی ہے اور ایمان ضعیف ہو جاتا ہے۔ اور جن کی تصدیق قیاسی عقلی کے خلاف نہیں ہوتی جن کی تصدیق میں عقل بھی ایک حد تک مددگار ہوتی ہے، ان کے ہلکے میں ضمیر کا اطمینان زیادہ بڑھ جاتا ہے اور اس سے ایمان کو قوت ملتی ہوتی ہے۔

ماہیاتی خیالات میں سے بیشتر ایسے امور ہیں جن کی حیثیت عقلی ہے لیکن ان سے ہماری عقلی زندگی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً ایٹھر (ETHER) ریونی، صورت مطلق، مادہ، فطرت و قانون فطرت، قانون علت و معلول، اور ایسے ہی بیسیوں عقلی مسئلہ یا مفروضات کہ ان کو سائنس دانوں نے ہماری زندگی کے معاملات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اسلام نے جن امور غیب پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے وہ ایسے نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت محض عقلی ہی نہیں ہے بلکہ ہماری اخلاقی اور عقلی زندگی سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ ان کی تصدیق اصل الاصول قرار دینے کی وجہ یہی ہے کہ وہ محض عقلی صدائیں نہیں ہیں بلکہ ان کا صحیح علم اور ان پر کامل ایمان ہمارے نفسانی امور اور خاصات پر، ہمارے شخصی اعمال پر، اور ہمارے اجتماعی معاملات و شہادت کے ساتھ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا تفصیلی بیان آگے آئے گا۔

مثلاً اسلام کے نظام تہذیب کو مختلف عقلی اور عقلی مراتب کے حامل وسیع انسانی آبادیوں پر ان کی زندگی کے عقلی اور جہنی سے جو شبہوں تک میں اپنی حکومت قائم کرنے اور اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے جس قوت کی ضرورت ہے وہ صرف انہی ایمانیات سے حاصل ہو سکتی ہے جن کی تصدیق کا اسلام نے مطالبہ کیا ہے۔ یہ تو ایک وسیع و بصر، قاهر و غالب، اور رؤوف و رحیم خدا کا ہے اور اس کا

ہے، اس کے بے شمار شکر ہر جگہ ہر جگہ موجود ہیں، نیز غیر اسی کا میجا ہوتا ہے، جو احکام اس نے ہم کو دیئے ہیں وہ اس نے خود نہیں گھڑے ہیں بلکہ سب کے سب خدا کی طرف سے ہیں، اور اپنی اطاعت یا سرکشی کا اچھا یا بُرا نتیجہ ہم کو ضرور دیکھنا پڑے گا، اپنے اندر وہ زبردست اور ہم گیر طاقت رکھتا ہے جو اس کے سوا کسی اور خدا سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ مادی طاقتیں صرف ہم کو ہلکا سکتی ہیں۔ تربیت اور تعلیم کے اخلاقی اثرات انسانی سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ صرف وہاں کام کر سکتا ہے جہاں اسکے کارندوں کی تربیت ہو۔ مگر حقیقت ہے جو دل اور روح پر قبضہ کرتی ہے۔ عوام اور خواص، جاہل اور عالم، دانشمند اور بے دانش، سب کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ جنگل کی تنہا نوں اور رات کی تاریکیوں تک میں اپنا کام کرتی ہے۔ جہاں گناہ سے بچنے والا، حتیٰ کہ اسن کو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا وہاں خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین، ہر فیئر کی دی ہوئی تعلیم کے برحق ہونے کا یقین، قیامت کی باز پرس کا یقین، وہ کام کرتا ہے جو نہ کوئی پوپیس کا سپاہی کر سکتا ہے، نہ عدالت کا حاکم، نہ پروفیسر کی تعلیم۔ پھر جس طرح اس یقین نے معنورۂ ارضی پر پھیلے ہوئے بے شمار مختلف و متضاد انسانی عناصر کو جمع کیا، ان کو ملا کر ایک قوم بنایا، ان کے تعلیمات، اعمال اور اطوار میں غایت درجہ کی یک جہتی پیدا کی، ان کے اندر اختلاف ظروف و احوال کے باوجود ایک تہذیب بھیلائی اور ان میں ایک اعلیٰ مقصد کے لئے فدا کاری کی وابہانہ روح پھونگی، اس کی مثال کہیں ڈھونڈنے نہیں مل سکتی۔

جہاں تک جو کچھ ثابت کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح

ہیں ایمان سے مُراد اللہ، ملائکہ، کُتُب، رُسُل اور یومِ آخر پر ایمان
 لانا ہے اور یہ پانچوں ایمانیات مل کر ایک ناقابلِ تجزیہ کُل بناتے
 ہیں، یعنی ان کے درمیان واسطہ ہے کہ اگر ان میں سے کسی ایک
 جز کا بھی انکار کیا جائے تو اُس سے کُل کا انکار لازم آتا ہے۔ پھر عقلی
 تنقید کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام میں قسم کی تہذیب قائم
 کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے صرف بھی اُممِ ایمانیات ہی سکتے ہیں
 اور انہی ایمانیات کی اس کو ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ ان میں کوئی چیز ایسی
 نہیں ہے جو عقل و عقلی ترقی کا ساتھ دے سکتی ہو۔

اب ہمیں تیسرے سوال کی طرف توجہ کرنی چاہیے، اور وہ یہ ہے
 کہ اسلام میں ایمان کی کیا حیثیت ہے؟ اور یہ حیثیت کون ہے؟ اس
 مسئلہ کو سمجھنے میں لوگوں نے بکثرت غلطیاں کی ہیں، اور بعض مشہور اہل
 علم و فضل اسباب میں اس میں غلو کر کھائے ہیں۔ اس لیے اسکو ذرا
 بسط کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے۔

اسلام میں ایمان کی اہمیت

اگر سوال کیا جائے کہ قرآن مجید کی دعوت کا اصلِ الاصول کیا ہے
 تو اس کا جواب صرف ایک لفظ میں دیا جاسکتا ہے، اور وہ ”ایمان“
 ہے۔ قرآن کے نزول اور نئی طرہِ الصلوٰۃ و الاستقام کی ہشت کا مقصد ہی
 ایمان کی طرف دعوت دینا ہے۔

(قرآن اپنے اپنے حلقہ مسات کہتا ہے کہ وہ ایمان
 کا منادی ہے۔ تَرْتَبَاتُنَا تَحْتًا مَّوَدَّاتُنَا دِيَارُ يَتَنَادِي رَلَا يَتَنَادِي۔
 (آل عمران۔ ۶۴))

اور خود اپنے حلقہ اعلان کرتا ہے کہ
 (وہ صرف ان لوگوں کو ہدایت کا راستہ دکھانے کا جو ضلالت کی

باتوں (یعنی انہی باتوں پر) لیجئے لائے کے لئے تیار ہوں۔ خدا ہی
 یَسْتَشْفِقُونَ الَّذِينَ يَنْفُكُونَ بِالْعَيْبِ (المعروہ: ۱)

وہ وحش ہے، تکلیفیں سے، وعدہ و وعید سے، بحث و استدلال
 سے، قصص و حکایات سے اسی کی طرف رجحان دیتا ہے۔ انسان سے
 اس کا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایمان لائے۔ اس کے بعد وہ تزکیہ
 نفس، اصلاح اخلاق اور وضع قوانین دینی کی طرف قدم بٹھاتا ہے۔
 اس کے نزدیک ایمان ہی حق، صدق، علم، کھدائی اور نور ہے۔ اور عدم
 ایمان، یعنی کفر کو وہ جہل، ظلم، باطل، کذب، غفلت اور ضلالت قرار
 دیتا ہے۔

قرآن حکیم نے ایک واضح خط فاسل کھینچ کر تمام دنیا کے انسانوں کو
 دو گروہوں پر تقسیم کر دیا ہے۔ ایک گروہ ایمان لائے والوں کا۔ دوسرا
 گروہ انکار کرنے والوں کا۔ پہلا گروہ اس کے نزدیک حق پرست ہے، علم
 اور نور سے بہرہ ور ہے، اس کے لئے ہدایت کا راستہ اور تقویٰ و
 پرہیزگاری کا حوالہ کھل گیا ہے، اور وہی فلاح پانے والا ہے۔
 دوسرا گروہ اس کے نزدیک کافر ہے، ظالم ہے، باطل ہے، تاریکی میں
 رہتا ہے، ہدایت کی راہیں اس کے لئے بند ہیں، تقویٰ اور
 پرہیزگاری میں اس کا کوئی حصہ نہیں، اور اس پر غمران و نامرادی کا
 فیصلہ ہو چکا ہے۔

(وہ ان دونوں طبقوں کی مثال اس طرح دیتا ہے کہ ان میں سے
 ایک اصحا اور بہرا ہے اور دوسرا وہ کھنکھنے اور سننے والا مثل الغیثین
 كَالْأَعْمٰی وَالْأَصْحٰو وَالْبَصِيْر وَالْشَّٰبِیْع۔ (ہود: ۲۰)
 (وہ کہتا ہے کہ ایمان کا راستہ ہی ہرراط مستقیم ہے۔ وَالْطَّرِيقُ لِقَوْلِي
 إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (الشوریہ: ۵))

(اور اس کے سوا جتنے راستے ہیں سب کا چھوڑ دینا ضروری ہے
وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ سِوَاهُ
(۱۹)۔

اس نے بلا کسی لاگ پیسٹ کے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ جو اللہ
اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کو ماننا ہے اس کے پاس ایک روشن
پہرا ہے جس کی مدد سے وہ سیدھے راستے پر چل سکتا ہے۔ اس پہرا
کی موجودگی میں اس کے لئے بہت کم ہمارے کا کوئی غور نہیں ہے۔ وہ
راہ راست کو ٹیڑھے راستوں سے متلاش کر کے دیکھنے لگا، اور پھر راست
خروج کی منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اور جو ایمان کی شمع نہیں رکھتا
اس کے پاس کوئی روشنی نہیں ہے۔ اس کے لئے سیدھے اور ٹیڑھے
راستوں کا فرق معلوم کرنا مشکل ہے۔ وہ اندھوں کی طرح اندھیرے
میں اُگلے سے ٹول ٹول کر پہلے گا۔ ممکن ہے کہ اتفاقاً اس کا کوئی قدم
سیدھے راستہ پر بھی پڑ جائے، مگر یہ راہ راست پر پہنچنے کا کوئی یقینی
ذریعہ نہیں ہے۔ غالب امکان اسی کا ہے کہ راہ راست سے ہٹ
جائے گا، کہیں غرق میں گرے گا اور کہیں کاٹھن میں جا پھنسے گا۔
پہلے گروہ کے متعلق اس کا قول ہے کہ۔

فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ، وَعَزَّرُوهُ وَلَعَزَّوْهُ وَاتَّبَعُوا
الشُّرَاطِينَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔

(الاحزاب: ۱۸)

”پس جو لوگ رسول پر ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی مدد و
حمایت کی اور اس نور کا ابتلا کیا جو اس کے ساتھ آگیا ہے۔ وہی
حاصل نجات پانے والے ہیں۔“

اور۔

اَتَقُوا اللَّهَ وَالْعَزَّوَجَالَہُ سَوَّلَہُ یُؤْتِکُمْ مِمَّا تَرْضَوْنَ مِنْ
رَحْمَتِہٖہٗ وَیَجْعَلَ لَکُم مِّنْہَا مَسَکُونًا ۖ وَیَخْفِزَ لَکُمْ
(العنکبوت - ۴)

”اے لوگو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لانا، اللہ تم کو
اپنی رحمت سے جو چاہے دے گا اور تمہارے لیے ایسی باتیں کرے گا
کہ تم میں امن ہو سکے اور تم کو اپنی رحمت سے لگا دے گا
اور دوسرے گروہ کے متعلق کہتا ہے۔“

وَمَا یُتْلٰی لَہُمُ الذِّکْرُ بِذَیْعُوْنَ ۚ وَمِنْ ذُوْلِ الْاَلْبَیْضِ کَاذِبٌ
اِنَّہٗ یُتْلٰی عَنِ الْاَلْبَیْضِ ۚ اِنَّہٗ هُوَ الْاَلْبَیْضُ ۚ
(القصص - ۲)

”جو لوگ قرآن کے سوا دوسرے شراک کو پکارتے ہیں، ہمارے
اللہ وہ نہیں کہیں کہیں وہی کہتے ہیں، وہ مروت گان کہیں وہی کہتے ہیں
میں ان کا کہتے ہیں۔“

اِنَّہٗ یُتْلٰی عَنِ الْاَلْبَیْضِ ۚ اِنَّہٗ هُوَ الْاَلْبَیْضُ ۚ
الْحَقُّ شَیْئٌ ۚ (القصص - ۲)

”وہ مروت گان کہیں وہی کہتے ہیں۔ اور گان کامل یہ ہے
کہ وہ حق کی غیبت سے کچھ بھی نہیں کرتا۔“

وَمِنْ اٰخِلِیْہِۓ مِثْلِ الْاَنۡبِیَآءِ ۚ ہُوَ اَسَدٌ یُّغۡدِیْہِ
مِنَ الْاَلۡبَیۡضِ ۚ اِنَّہٗ لَا یُغۡدِیۡہِ الْقَوۡمُ الْفٰلِیۡقُونَ
(القصص - ۵)

”اور اس شخص سے زیادہ گروہ کون ہوگا جس نے اس کی ہدایت
کے بغیر اپنے نفس کی خواہش کہیں وہی کہی؟ اللہ ایسے ظالموں کو کبھی
سیدھا راستہ نہیں دکھاتا۔“

وَمَنْ أَعَدَّ يَتَجَعَلَ اللَّهُ لَهُ كُفْرًا قَبْلَهُ وَمَنْ أَكُفْرًا

(التوبة)

”اور جس کو مشق و دشمنی کرے ہو اس کے لئے کفر ہو گا۔“

دشمنی خبیثہ

اس پھر سے مضمون کی تصریح سورۃ بقرہ میں ملتی ہے جس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان اور کفر کے فرق سے نور بشری کے ان دونوں گروہوں میں کتنا عظیم فرق ہو رہا ہے۔

لَا أَكْفُرًا فِي الْدِينِ، قَدْ تَجَيَّنَ الرَّشْدُ مِنَ
الْعَنِ، فَسَنُيَكْفُرُ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنُ بِاللَّهِ فَقَدْ
اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ
سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۚ اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمُ
مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ
الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ
أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ

(البقرہ۔ ۱۷۷)

”وہ ہیں جو کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت کا راستہ گمراہی سے
انک کر کے دکھایا گیا ہے۔ اب جو طاغوت کو چھوڑ کر اللہ پر ایمان لے
آیا اس نے ایک مضبوط دلی تھام لی جو ٹوٹنے والی نہیں ہے۔ اور
اللہ سب کچھ سنے اور جانتے والا ہے۔ اللہ ان لوگوں کا مددگار ہے
جو ایمان لائے۔ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال دیتا ہے اور
کافروں کو اللہ کے مددگار شیطان ہیں۔ وہ ان کو اللہ سے تاریکیوں کی طرف
پلے جاتے ہیں۔ وہ مددگار ہیں اور دوزخ میں جھٹے ہوئے نر جھٹے
کے“

عمل پر ایمان کا تقدم

پھر اسی ایمان اور کفر کے بنیادی فرق نے انسانی اعمال کے حصہ
بھی فرق کر دیا ہے۔ قرآن کے نزدیک نیکوکار اور پرہیزگار وہی شخص
ہو سکتا ہے جو ایمان لائے۔ وہ ان کے بغیر کسی عمل پر بھی نکوئی اور صلاح
کا اطلاق نہیں ہوتا، خواہ اہل دنیا کی نگاہ میں وہ عمل کتنا ہی نیک ہو۔
وہ کہتا ہے۔

وَالَّذِينَ جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَهُمْ يَقُولُونَ
النَّبِيُّونَ۔ (الزمر۔ ۴)

”اُس شخص کی بات لے کر آیا، اور جس نے اس کی تصدیق کی،
اس کی ایک قطی ہے۔“

هُدًى يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّونَ۔ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْبَيِّنَاتِ
وَالَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ السُّلُوٰةَ وَمَا اُنْزِلَتْهُمْ تَتَّبِعُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ
وَبِالْاُخْرٰى هُمْ يُؤْمِنُوْنَ۔ (البقرہ۔ ۱۷۷)

”قرآن ہدایت در کتاب ہے جسے سب کو حیب کی باتوں پر ایمان
لے رہے ہیں، نہ قائم کرتے اور بدلے لکھے ہوئے ہی کو نہیں دیتے
ہیں، اور جو اُس کتاب پر ایمان لے رہے ہیں وہ سب اُن کی آگاہی کرتے ہیں
اور ان کتابوں پر ہی جو لکھے ہوئے ہیں ان کی جائی ہیں، اور جو اُخرت
پر ایمان لکھے ہیں۔“

پس قرآن کی نگاہ میں ایمان ہی نکوئی کی جڑ اور پرہیزگاری کی اصل
ہے۔ جو شخص ایمان لائے ہے اس کے نیک اعمال اس طرح پھلتے اور
پھولتے ہیں جیسے طرح (جی زمین)، اور اسی آب و ہوا میں باغبان کے
لگائے ہوئے درخت سرسبز ہوتے اور پھل پھول لاتے ہیں۔ غلات

اس کے جو شخص ایمان کے بغیر عمل کرتا ہے وہ گویا ایک ٹیجر، چھری یا
 اور خراب آب و ہوا میں پانچ لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید
 میں ہر جگہ ایمان کو عملِ صالح پر مقدم رکھا گیا ہے، اور کہیں بھی نہ سُن
 عمل کو، ایمان کے بغیر، نہایت اور فلاح کا ذریعہ قرار نہیں دیا گیا ہے۔
 بلکہ اگر آپ قرآن کا خود سے مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ
 قرآن مجید نے جس قدر اخلاقی ہدایات اور قانونی احکام دیئے ہیں ان
 سب کے مخاطب صرف وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہوئے ہیں۔ اس سبب قسم کی
 تمام آیات یا تو یٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے شروع ہوتی ہیں، یا ائمائے
 ایمان میں کسی دیکھی طرح سے تصریح کر دی گئی ہے کہ خطاب صرف
 مومنین سے ہے۔ باقی رہے کفار تو ان کو عسلیٰ مل کی نہیں، صرف ایمان
 کی دعوت دی گئی ہے اور صاف کہہ دیا گیا ہے کہ جو لوگ مومن نہیں
 ان کے اعمال کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، وہ بے فائدہ ہیں۔
 حقیقت میں اور قطعاً خارج ہو جانے والے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَعْمٰۤاُ لِهٰذَا كِسٰۤاُۢبٍۭ
 يَّحْسَبُوْنَ اَلظُّلُمٰٓتُ مَآءٌ حٰقٍۭۢۙ اِذَا جَآءَهُمْ نَعۡيۡدُنَا
 شٰٓئِۡمًاۙ (النور: ۵)

”اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے شیل
 بہان میں سراب۔ پیسا فکد سے دیکھ کر سمجھتا ہے کہ پانی ہے مگر“

یہ مضمون قریب قریب اسی ٹیبل کے ساتھ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے، ملاحظہ
 فرمائیے: سورہ بقرہ: ۲۶۔

یہ ٹیبل کے طور پر ملاحظہ فرمائیے: (۳۸، ۳۹) النساء (۲۴) المائدہ (۲) الاحزاب (۲)
 اہل بدر (۳) آلہ (۲-۶) النبی۔ العصر۔

سب وہاں پہنچا ہے تو کچھ نہیں بچا

كُلُّ هَٰلِكٍ لَّدُنَّا وَآخِرُ الْأَوَّلِينَ
 ضَلَّ سَبِيلَهُ فِي الْخَلْقِ الْأَوَّلِ ۚ وَهَمَّ يَتَّبِعُوا
 آثَمُ يَحْسَبُونَ صُنْعًا ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ
 رَبِّهِمْ فَلَنُكَافِيَنَّاهُمْ بِعَمَلِهِمْ ۖ فَلَا نُؤَدُّهُمْ
 يُؤَمِّرُوا الْقِيَمَةَ ۖ وَنُنَا ۚ ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۖ أَكَفَرُوا
 وَاتَّخَذُوا إِلَٰهًا غَيْرَ اللَّهِ ۚ وَمَا سِوَى اللَّهِ عِندَ رَبِّكَ (الحجۃ۔ ۱۲)

ان سے کہو کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے لحاظ سے
 کون کون کس سے زیادہ نافرمان ہیں؟ وہ جوں کی توکھیں دیکھیں
 میں ہے کہ صرف یہ کہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہم بہت اچھے کام کر
 رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیات کا انکار
 کیا اور یہ قیام کر لیا کہ انہیں اس کے پاس ماضی ہوتا ہے۔ اس وجہ
 سے ان کے اعمال اکارت گئے۔ قیامت کے دن ہم ان کے اعمال
 کو کوئی وزن نہ دیں گے اور وہ دوزخ میں جائیں گے۔ یہ جلد ہے
 اس کا کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے رسولوں کو شک
 کیا

یہی مضمون سورۃ مائدہ (۱) (۲) (۳) (۴) (۵) (۶) (۷) (۸) (۹) (۱۰) (۱۱) (۱۲) (۱۳) (۱۴) (۱۵) (۱۶) (۱۷) (۱۸) (۱۹) (۲۰) (۲۱) (۲۲) (۲۳) (۲۴) (۲۵) (۲۶) (۲۷) (۲۸) (۲۹) (۳۰) (۳۱) (۳۲) (۳۳) (۳۴) (۳۵) (۳۶) (۳۷) (۳۸) (۳۹) (۴۰) (۴۱) (۴۲) (۴۳) (۴۴) (۴۵) (۴۶) (۴۷) (۴۸) (۴۹) (۵۰) (۵۱) (۵۲) (۵۳) (۵۴) (۵۵) (۵۶) (۵۷) (۵۸) (۵۹) (۶۰) (۶۱) (۶۲) (۶۳) (۶۴) (۶۵) (۶۶) (۶۷) (۶۸) (۶۹) (۷۰) (۷۱) (۷۲) (۷۳) (۷۴) (۷۵) (۷۶) (۷۷) (۷۸) (۷۹) (۸۰) (۸۱) (۸۲) (۸۳) (۸۴) (۸۵) (۸۶) (۸۷) (۸۸) (۸۹) (۹۰) (۹۱) (۹۲) (۹۳) (۹۴) (۹۵) (۹۶) (۹۷) (۹۸) (۹۹) (۱۰۰) (۱۰۱) (۱۰۲) (۱۰۳) (۱۰۴) (۱۰۵) (۱۰۶) (۱۰۷) (۱۰۸) (۱۰۹) (۱۱۰) (۱۱۱) (۱۱۲) (۱۱۳) (۱۱۴) (۱۱۵) (۱۱۶) (۱۱۷) (۱۱۸) (۱۱۹) (۱۲۰) (۱۲۱) (۱۲۲) (۱۲۳) (۱۲۴) (۱۲۵) (۱۲۶) (۱۲۷) (۱۲۸) (۱۲۹) (۱۳۰) (۱۳۱) (۱۳۲) (۱۳۳) (۱۳۴) (۱۳۵) (۱۳۶) (۱۳۷) (۱۳۸) (۱۳۹) (۱۴۰) (۱۴۱) (۱۴۲) (۱۴۳) (۱۴۴) (۱۴۵) (۱۴۶) (۱۴۷) (۱۴۸) (۱۴۹) (۱۵۰) (۱۵۱) (۱۵۲) (۱۵۳) (۱۵۴) (۱۵۵) (۱۵۶) (۱۵۷) (۱۵۸) (۱۵۹) (۱۶۰) (۱۶۱) (۱۶۲) (۱۶۳) (۱۶۴) (۱۶۵) (۱۶۶) (۱۶۷) (۱۶۸) (۱۶۹) (۱۷۰) (۱۷۱) (۱۷۲) (۱۷۳) (۱۷۴) (۱۷۵) (۱۷۶) (۱۷۷) (۱۷۸) (۱۷۹) (۱۸۰) (۱۸۱) (۱۸۲) (۱۸۳) (۱۸۴) (۱۸۵) (۱۸۶) (۱۸۷) (۱۸۸) (۱۸۹) (۱۹۰) (۱۹۱) (۱۹۲) (۱۹۳) (۱۹۴) (۱۹۵) (۱۹۶) (۱۹۷) (۱۹۸) (۱۹۹) (۲۰۰) (۲۰۱) (۲۰۲) (۲۰۳) (۲۰۴) (۲۰۵) (۲۰۶) (۲۰۷) (۲۰۸) (۲۰۹) (۲۱۰) (۲۱۱) (۲۱۲) (۲۱۳) (۲۱۴) (۲۱۵) (۲۱۶) (۲۱۷) (۲۱۸) (۲۱۹) (۲۲۰) (۲۲۱) (۲۲۲) (۲۲۳) (۲۲۴) (۲۲۵) (۲۲۶) (۲۲۷) (۲۲۸) (۲۲۹) (۲۳۰) (۲۳۱) (۲۳۲) (۲۳۳) (۲۳۴) (۲۳۵) (۲۳۶) (۲۳۷) (۲۳۸) (۲۳۹) (۲۴۰) (۲۴۱) (۲۴۲) (۲۴۳) (۲۴۴) (۲۴۵) (۲۴۶) (۲۴۷) (۲۴۸) (۲۴۹) (۲۵۰) (۲۵۱) (۲۵۲) (۲۵۳) (۲۵۴) (۲۵۵) (۲۵۶) (۲۵۷) (۲۵۸) (۲۵۹) (۲۶۰) (۲۶۱) (۲۶۲) (۲۶۳) (۲۶۴) (۲۶۵) (۲۶۶) (۲۶۷) (۲۶۸) (۲۶۹) (۲۷۰) (۲۷۱) (۲۷۲) (۲۷۳) (۲۷۴) (۲۷۵) (۲۷۶) (۲۷۷) (۲۷۸) (۲۷۹) (۲۸۰) (۲۸۱) (۲۸۲) (۲۸۳) (۲۸۴) (۲۸۵) (۲۸۶) (۲۸۷) (۲۸۸) (۲۸۹) (۲۹۰) (۲۹۱) (۲۹۲) (۲۹۳) (۲۹۴) (۲۹۵) (۲۹۶) (۲۹۷) (۲۹۸) (۲۹۹) (۳۰۰) (۳۰۱) (۳۰۲) (۳۰۳) (۳۰۴) (۳۰۵) (۳۰۶) (۳۰۷) (۳۰۸) (۳۰۹) (۳۱۰) (۳۱۱) (۳۱۲) (۳۱۳) (۳۱۴) (۳۱۵) (۳۱۶) (۳۱۷) (۳۱۸) (۳۱۹) (۳۲۰) (۳۲۱) (۳۲۲) (۳۲۳) (۳۲۴) (۳۲۵) (۳۲۶) (۳۲۷) (۳۲۸) (۳۲۹) (۳۳۰) (۳۳۱) (۳۳۲) (۳۳۳) (۳۳۴) (۳۳۵) (۳۳۶) (۳۳۷) (۳۳۸) (۳۳۹) (۳۴۰) (۳۴۱) (۳۴۲) (۳۴۳) (۳۴۴) (۳۴۵) (۳۴۶) (۳۴۷) (۳۴۸) (۳۴۹) (۳۵۰) (۳۵۱) (۳۵۲) (۳۵۳) (۳۵۴) (۳۵۵) (۳۵۶) (۳۵۷) (۳۵۸) (۳۵۹) (۳۶۰) (۳۶۱) (۳۶۲) (۳۶۳) (۳۶۴) (۳۶۵) (۳۶۶) (۳۶۷) (۳۶۸) (۳۶۹) (۳۷۰) (۳۷۱) (۳۷۲) (۳۷۳) (۳۷۴) (۳۷۵) (۳۷۶) (۳۷۷) (۳۷۸) (۳۷۹) (۳۸۰) (۳۸۱) (۳۸۲) (۳۸۳) (۳۸۴) (۳۸۵) (۳۸۶) (۳۸۷) (۳۸۸) (۳۸۹) (۳۹۰) (۳۹۱) (۳۹۲) (۳۹۳) (۳۹۴) (۳۹۵) (۳۹۶) (۳۹۷) (۳۹۸) (۳۹۹) (۴۰۰) (۴۰۱) (۴۰۲) (۴۰۳) (۴۰۴) (۴۰۵) (۴۰۶) (۴۰۷) (۴۰۸) (۴۰۹) (۴۱۰) (۴۱۱) (۴۱۲) (۴۱۳) (۴۱۴) (۴۱۵) (۴۱۶) (۴۱۷) (۴۱۸) (۴۱۹) (۴۲۰) (۴۲۱) (۴۲۲) (۴۲۳) (۴۲۴) (۴۲۵) (۴۲۶) (۴۲۷) (۴۲۸) (۴۲۹) (۴۳۰) (۴۳۱) (۴۳۲) (۴۳۳) (۴۳۴) (۴۳۵) (۴۳۶) (۴۳۷) (۴۳۸) (۴۳۹) (۴۴۰) (۴۴۱) (۴۴۲) (۴۴۳) (۴۴۴) (۴۴۵) (۴۴۶) (۴۴۷) (۴۴۸) (۴۴۹) (۴۵۰) (۴۵۱) (۴۵۲) (۴۵۳) (۴۵۴) (۴۵۵) (۴۵۶) (۴۵۷) (۴۵۸) (۴۵۹) (۴۶۰) (۴۶۱) (۴۶۲) (۴۶۳) (۴۶۴) (۴۶۵) (۴۶۶) (۴۶۷) (۴۶۸) (۴۶۹) (۴۷۰) (۴۷۱) (۴۷۲) (۴۷۳) (۴۷۴) (۴۷۵) (۴۷۶) (۴۷۷) (۴۷۸) (۴۷۹) (۴۸۰) (۴۸۱) (۴۸۲) (۴۸۳) (۴۸۴) (۴۸۵) (۴۸۶) (۴۸۷) (۴۸۸) (۴۸۹) (۴۹۰) (۴۹۱) (۴۹۲) (۴۹۳) (۴۹۴) (۴۹۵) (۴۹۶) (۴۹۷) (۴۹۸) (۴۹۹) (۵۰۰) (۵۰۱) (۵۰۲) (۵۰۳) (۵۰۴) (۵۰۵) (۵۰۶) (۵۰۷) (۵۰۸) (۵۰۹) (۵۱۰) (۵۱۱) (۵۱۲) (۵۱۳) (۵۱۴) (۵۱۵) (۵۱۶) (۵۱۷) (۵۱۸) (۵۱۹) (۵۲۰) (۵۲۱) (۵۲۲) (۵۲۳) (۵۲۴) (۵۲۵) (۵۲۶) (۵۲۷) (۵۲۸) (۵۲۹) (۵۳۰) (۵۳۱) (۵۳۲) (۵۳۳) (۵۳۴) (۵۳۵) (۵۳۶) (۵۳۷) (۵۳۸) (۵۳۹) (۵۴۰) (۵۴۱) (۵۴۲) (۵۴۳) (۵۴۴) (۵۴۵) (۵۴۶) (۵۴۷) (۵۴۸) (۵۴۹) (۵۵۰) (۵۵۱) (۵۵۲) (۵۵۳) (۵۵۴) (۵۵۵) (۵۵۶) (۵۵۷) (۵۵۸) (۵۵۹) (۵۶۰) (۵۶۱) (۵۶۲) (۵۶۳) (۵۶۴) (۵۶۵) (۵۶۶) (۵۶۷) (۵۶۸) (۵۶۹) (۵۷۰) (۵۷۱) (۵۷۲) (۵۷۳) (۵۷۴) (۵۷۵) (۵۷۶) (۵۷۷) (۵۷۸) (۵۷۹) (۵۸۰) (۵۸۱) (۵۸۲) (۵۸۳) (۵۸۴) (۵۸۵) (۵۸۶) (۵۸۷) (۵۸۸) (۵۸۹) (۵۹۰) (۵۹۱) (۵۹۲) (۵۹۳) (۵۹۴) (۵۹۵) (۵۹۶) (۵۹۷) (۵۹۸) (۵۹۹) (۶۰۰) (۶۰۱) (۶۰۲) (۶۰۳) (۶۰۴) (۶۰۵) (۶۰۶) (۶۰۷) (۶۰۸) (۶۰۹) (۶۱۰) (۶۱۱) (۶۱۲) (۶۱۳) (۶۱۴) (۶۱۵) (۶۱۶) (۶۱۷) (۶۱۸) (۶۱۹) (۶۲۰) (۶۲۱) (۶۲۲) (۶۲۳) (۶۲۴) (۶۲۵) (۶۲۶) (۶۲۷) (۶۲۸) (۶۲۹) (۶۳۰) (۶۳۱) (۶۳۲) (۶۳۳) (۶۳۴) (۶۳۵) (۶۳۶) (۶۳۷) (۶۳۸) (۶۳۹) (۶۴۰) (۶۴۱) (۶۴۲) (۶۴۳) (۶۴۴) (۶۴۵) (۶۴۶) (۶۴۷) (۶۴۸) (۶۴۹) (۶۵۰) (۶۵۱) (۶۵۲) (۶۵۳) (۶۵۴) (۶۵۵) (۶۵۶) (۶۵۷) (۶۵۸) (۶۵۹) (۶۶۰) (۶۶۱) (۶۶۲) (۶۶۳) (۶۶۴) (۶۶۵) (۶۶۶) (۶۶۷) (۶۶۸) (۶۶۹) (۶۷۰) (۶۷۱) (۶۷۲) (۶۷۳) (۶۷۴) (۶۷۵) (۶۷۶) (۶۷۷) (۶۷۸) (۶۷۹) (۶۸۰) (۶۸۱) (۶۸۲) (۶۸۳) (۶۸۴) (۶۸۵) (۶۸۶) (۶۸۷) (۶۸۸) (۶۸۹) (۶۹۰) (۶۹۱) (۶۹۲) (۶۹۳) (۶۹۴) (۶۹۵) (۶۹۶) (۶۹۷) (۶۹۸) (۶۹۹) (۷۰۰) (۷۰۱) (۷۰۲) (۷۰۳) (۷۰۴) (۷۰۵) (۷۰۶) (۷۰۷) (۷۰۸) (۷۰۹) (۷۱۰) (۷۱۱) (۷۱۲) (۷۱۳) (۷۱۴) (۷۱۵) (۷۱۶) (۷۱۷) (۷۱۸) (۷۱۹) (۷۲۰) (۷۲۱) (۷۲۲) (۷۲۳) (۷۲۴) (۷۲۵) (۷۲۶) (۷۲۷) (۷۲۸) (۷۲۹) (۷۳۰) (۷۳۱) (۷۳۲) (۷۳۳) (۷۳۴) (۷۳۵) (۷۳۶) (۷۳۷) (۷۳۸) (۷۳۹) (۷۴۰) (۷۴۱) (۷۴۲) (۷۴۳) (۷۴۴) (۷۴۵) (۷۴۶) (۷۴۷) (۷۴۸) (۷۴۹) (۷۵۰) (۷۵۱) (۷۵۲) (۷۵۳) (۷۵۴) (۷۵۵) (۷۵۶) (۷۵۷) (۷۵۸) (۷۵۹) (۷۶۰) (۷۶۱) (۷۶۲) (۷۶۳) (۷۶۴) (۷۶۵) (۷۶۶) (۷۶۷) (۷۶۸) (۷۶۹) (۷۷۰) (۷۷۱) (۷۷۲) (۷۷۳) (۷۷۴) (۷۷۵) (۷۷۶) (۷۷۷) (۷۷۸) (۷۷۹) (۷۸۰) (۷۸۱) (۷۸۲) (۷۸۳) (۷۸۴) (۷۸۵) (۷۸۶) (۷۸۷) (۷۸۸) (۷۸۹) (۷۹۰) (۷۹۱) (۷۹۲) (۷۹۳) (۷۹۴) (۷۹۵) (۷۹۶) (۷۹۷) (۷۹۸) (۷۹۹) (۸۰۰) (۸۰۱) (۸۰۲) (۸۰۳) (۸۰۴) (۸۰۵) (۸۰۶) (۸۰۷) (۸۰۸) (۸۰۹) (۸۱۰) (۸۱۱) (۸۱۲) (۸۱۳) (۸۱۴) (۸۱۵) (۸۱۶) (۸۱۷) (۸۱۸) (۸۱۹) (۸۲۰) (۸۲۱) (۸۲۲) (۸۲۳) (۸۲۴) (۸۲۵) (۸۲۶) (۸۲۷) (۸۲۸) (۸۲۹) (۸۳۰) (۸۳۱) (۸۳۲) (۸۳۳) (۸۳۴) (۸۳۵) (۸۳۶) (۸۳۷) (۸۳۸) (۸۳۹) (۸۴۰) (۸۴۱) (۸۴۲) (۸۴۳) (۸۴۴) (۸۴۵) (۸۴۶) (۸۴۷) (۸۴۸) (۸۴۹) (۸۵۰) (۸۵۱) (۸۵۲) (۸۵۳) (۸۵۴) (۸۵۵) (۸۵۶) (۸۵۷) (۸۵۸) (۸۵۹) (۸۶۰) (۸۶۱) (۸۶۲) (۸۶۳) (۸۶۴) (۸۶۵) (۸۶۶) (۸۶۷) (۸۶۸) (۸۶۹) (۸۷۰) (۸۷۱) (۸۷۲) (۸۷۳) (۸۷۴) (۸۷۵) (۸۷۶) (۸۷۷) (۸۷۸) (۸۷۹) (۸۸۰) (۸۸۱) (۸۸۲) (۸۸۳) (۸۸۴) (۸۸۵) (۸۸۶) (۸۸۷) (۸۸۸) (۸۸۹) (۸۹۰) (۸۹۱) (۸۹۲) (۸۹۳) (۸۹۴) (۸۹۵) (۸۹۶) (۸۹۷) (۸۹۸) (۸۹۹) (۹۰۰) (۹۰۱) (۹۰۲) (۹۰۳) (۹۰۴) (۹۰۵) (۹۰۶) (۹۰۷) (۹۰۸) (۹۰۹) (۹۱۰) (۹۱۱) (۹۱۲) (۹۱۳) (۹۱۴) (۹۱۵) (۹۱۶) (۹۱۷) (۹۱۸) (۹۱۹) (۹۲۰) (۹۲۱) (۹۲۲) (۹۲۳) (۹۲۴) (۹۲۵) (۹۲۶) (۹۲۷) (۹۲۸) (۹۲۹) (۹۳۰) (۹۳۱) (۹۳۲) (۹۳۳) (۹۳۴) (۹۳۵) (۹۳۶) (۹۳۷) (۹۳۸) (۹۳۹) (۹۴۰) (۹۴۱) (۹۴۲) (۹۴۳) (۹۴۴) (۹۴۵) (۹۴۶) (۹۴۷) (۹۴۸) (۹۴۹) (۹۵۰) (۹۵۱) (۹۵۲) (۹۵۳) (۹۵۴) (۹۵۵) (۹۵۶) (۹۵۷) (۹۵۸) (۹۵۹) (۹۶۰) (۹۶۱) (۹۶۲) (۹۶۳) (۹۶۴) (۹۶۵) (۹۶۶) (۹۶۷) (۹۶۸) (۹۶۹) (۹۷۰) (۹۷۱) (۹۷۲) (۹۷۳) (۹۷۴) (۹۷۵) (۹۷۶) (۹۷۷) (۹۷۸) (۹۷۹) (۹۸۰) (۹۸۱) (۹۸۲) (۹۸۳) (۹۸۴) (۹۸۵) (۹۸۶) (۹۸۷) (۹۸۸) (۹۸۹) (۹۹۰) (۹۹۱) (۹۹۲) (۹۹۳) (۹۹۴) (۹۹۵) (۹۹۶) (۹۹۷) (۹۹۸) (۹۹۹) (۱۰۰۰)

أَجَعَلْتُمْ سِحْرَ الْحَاكِمِ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ
 الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي
 سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عَمَلُ اللَّهِ وَلِلَّهِ لَا يَهْدِي

الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَابُوهَا وَأَوْحَاهَا بِذِكْرِهِ
فِي سَبْعِينَ آيَةً وَأَمَّا الْيَوْمُ وَاللَّيْلُ فَوَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آلِهَتِهِمْ أَتَقَدَّرُونَ فَذَرْهُمْ
بِحُكْمِ اللَّهِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْغَائِبُونَ۔ (التوبہ: ۳)

ہم انہوں نے ماریوں کو پانچ پانچ دنوں میں اس قدر مسخر کر دیا کہ وہ اس قدر
کچھ دے کہ اس قدر اس شخص کے لئے کہ یہ ہے جو اللہ اور ہم
پر ایمان لایا اور جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا؟ یہ دونوں اللہ کے
توکل ہرگز وہ نہیں اور اللہ ظالمین کو جہالت نہیں دیتا جو لوگ
ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جان و مال
سے جہاد کیا وہ اللہ کے توکل سے وہ دے دے ہیں اور وہ
کامیاب ہیں۔

خلاصہ

اس بیان سے اور قرآن مجید کی ان آیات سے جو اس کی تائید
میں پیش کی گئی ہیں۔ چند امور غیر مشتبہ طور پر ثابت ہوتے ہیں۔
۱۔ ایمان، نظام اسلامی کا شگ بنیاد ہے۔ اسی پر اس نظام کی
عمارت قائم کی گئی ہے۔ اور کفر و اسلام کا امتیاز صرف ایمان و عدم
ایمان کے بنیادی فرق پر مبنی ہے۔

۲۔ انسان سے اسلام کا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایمان لائے اس
مطالبہ کو قبول کرنے والا دائرہ اسلام میں داخل ہے، اور تمام اخلاقی
احکام اور دینی قوانین اسی کے لئے ہیں۔ اور جو اس مطالبہ کو رد کرے
وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے، اس سے نہ کوئی اخلاقی حکم متعلق ہوگا
ہے اور نہ کوئی دینی قانون۔

۳۔ اسلام کے نزدیک ایمان ہی عمل کی جڑ ہے۔ صرف وہی عمل
اس کی نگاہ میں قدر و قیمت اور وزن رکھتا ہے جو ایمان کی بنیاد پر ہو۔

اور جہاں دوسرے سے یہ خیالی موجود نہ ہو وہاں تمام اعمال بے اصل اور بے وزن ہیں۔

ایک اعتراض

ایمان کی یہ اہمیت بعض لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ کہتے ہیں کہ چند عقلی نظریات کا ماننا کوئی ایسی جوہریت نہیں رکھتا کہ اس کی بنیاد پر نوع انسانی کو وہ گروہوں پر تقسیم کیا جاسکے۔ ہمارے نزدیک اصل چیز اخلاق، سیرت اور کردار ہے۔ اسی پر اچھے اور بُرے، صیح اور غلط کا امتیاز قائم ہے۔ جو شخص عمدہ اخلاق، پاک سیرت اور نیک کردار رکھتا ہو وہ خواہ ان نظریات کو جنہیں اسلام نے ایمانیات قرار دیا ہے تسلیم کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، بہر حال ہم اس کو نیک کہیں گے اور متقین کے گروہ میں شمار کریں گے۔ اور جس میں یہ صفات نہیں ہیں اس کے بے ایمان اور کفر کا اعتقادی فرق بالکل بے اصل ہے۔ وہ خواہ کسی عقیدہ کا قائل ہو، ہم اس کو بُرا ہی کہیں گے۔ وہی یہ بات کہ اعمال کے وزن اور ان کی قدروقیمت کا انحصار ایمان پر ہے، اور یہ کہ ایمان کے بغیر کوئی عمل صالح نہیں ہو سکتا، تو یہ عقلی نظریہ ہے۔ کسی دلیل عقلی کے بغیر یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ محض خدا، یا رسول، یا کتب، یا قیامت کے متعلق اسلام سے مختلف عقیدہ رکھنے والے کے فضائل اخلاق اور اعمال حسنہ خالص ہو جاتے ہیں۔ اگر اسلام کسی عقیدہ کو صحیح سمجھتا ہے تو وہ بلاشبہ اس کی تبلیغ کا حق رکھتا ہے، لوگوں کو اس کی طرف بلا سکتا ہے، اس پر ایمان لانے کی دعوت دے سکتا ہے۔ مگر اعتقاد کے سوال کو اخلاق اور اعمال کے مفقود پر وسیع کرنا اور اخلاق کی فضیلت، سیرت کی پاکیزگی، اعمال کی بہتری کو ایمان پر منحصر کر دینا کہاں تک درست ہے؟

بظاہر یہ اعتراض اتنا ذرا ہے کہ بعض مسلمان بھی اس سے متاثر

ہو کر اسلام کے اصول میں ترمیم کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ مگر ایمان کی حقیقت اور سیرت و کردار سے اس کے تعلق کو سمجھ لینے کے بعد یہ اعتراض خود بخود رفع ہو جائے گا۔

اعتراض کی تحقیق

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ افراد نوع بشری کے درمیان خوب و شرشت کا امتیاز حاصل دو بھدا گانہ بنیادوں پر قائم ہے۔ ایک پیدائشی سرشت جس کا حسن و قبح انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ دوسرے اکتساب جس کا نیک یا بد ہونا عقل و فکر اور اختیار و ارادہ کے صحیح یا غلط استعمال پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ دونوں امور انسانی زندگی میں اپنی تاثیرات کے لحاظ سے باہم اس قدر غلط ملط ہیں کہ ہم ان کو اور ان کی تاثیرات کے حدود کو ایک دوسرے سے متلا نہیں کر سکتے۔ مگر نگری حیثیت سے اتنا ضرور ہانتے ہیں کہ انسان کی جماعت فکر و عمل میں حسن و قبح کی یہ دونوں بنیادیں الگ الگ موجود ہیں جو حسن و قبح سرشت کی بنیاد پر ہے وہ اپنی اصل کے لحاظ سے میزان عدل میں بے وزن کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ وزن صرف اس حسن و قبح کو حاصل ہونا چاہیے جو اکتساب کی بنیاد پر ہو۔ تعلیم، تلقین، تہذیب کے لیے جتنی

لے ٹیکس یہ بات ہے جو قرآن مجید میں لکھی ہے۔ لَا يَخْلُقُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا
وَسَعَهَا آثَانًا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (ہجروہ ۴) یعنی "اللہ کسی
مخلوق کو اس کی قسمت سے زیادہ کسی شے کا علف نہیں قرار دیتا اس نے جو کچھ
کسب کیا ہے اسی کا فائدہ اسی کو ملے گا اور اس نے جو کچھ اکتساب کیا ہے اسی کی
وزن داری اس پر ہوگی" دیکھیں پیدائشی سرشت تو اللہ نے جس کو ہمیں اپنی سرشت
بخش۔ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ (ہجروہ ۵) یعنی

کوششیں کی جاتی ہیں، ان سب کا تعلق پہلی دنیا (یعنی پیدا ہونے کی سرشت) سے نہیں ہے، کیونکہ اس کے ضمن کو حق سے خارج کو حق سے جدا کرنے کا عمل ہے، بلکہ ان کا تعلق دوسری دنیا (کتاب سے جدا کرنے کا عمل) سے ہے، اور صحیح تربیت کے ذریعہ سے حق کی جانب اور غلط تعلیم اور غلط تربیت کے ذریعہ سے حق کی جانب کی جا سکتی ہے۔

اس اصل کے لحاظ سے جو شخص انسان کی انسانی قوتوں کو حق کے طرف پھیرتا اور اسی راہ میں ترقی دیتا پاتا ہوتا ہو اس کے لئے صحیح طریقہ کار کیا ہو سکتا ہے؟ یہی کہ انسان کو علم سکھائے، اور اسی علم کی روشنی میں اس کے لئے ایک ایسا نظام تربیت وضع کرے جو اس کے اخلاقی اثرات اور کردار کو، جہاں تک اس کا تعلق کتاب سے ہے، ذکر سرشت سے، ایک بہتر سانچے میں ڈھال سکتا ہو۔ اس سانچہ میں علم کا تربیت پر مقدم ہونا لازمی ہے، اور کوئی صاحب عقل و دانش اس مقدم سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ علم ہی عقل کی بنیاد ہے۔ علم صحیح کے بغیر کسی عمل کا صحیح ہونا ممکن نہیں ہے۔

اب علم کو کیسے؟ علم کی ایک قسم تو وہ ہے جس کا تعلق ہماری زندگی کے جوئیات سے ہے، جس کو ہم مددوں میں پڑھتے، لکھتے، دیکھتے اور جوئے شمار علوم و فنون پر مشتمل ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو علم کلی، اور قرآن کی اصطلاح میں "العلم" کے نام سے موسوم ہے۔ جس کا تعلق ہمارے معاملات سے نہیں، بلکہ "ہم" سے ہے۔ جو اس سے بہت گہرا

(یعنی ماضیہ مفروضہ کا) یشاء (آئی قرآن) اور انسان کی زندگی اس کی سرشت اور اس کے کتاب کا بھروسہ ہے اس کو لکھا خوب جانتا ہے کہ اِنَّ الْعِلْمَ لَا يَخْلُقُ عَلٰی شَيْءٍ (آئی قرآن)

ہے کہ ہم کیا ہیں؟ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں اس میں ہماری
 حیثیت کیا ہے؟ ہنگو اور اس دنیا کو کس نے بنایا ہے؟ اس بنانے والے
 سے ہمارا کیا تعلق ہے؟ ہمارے لئے زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ
 زندگی اور سراپا مستقیم کیا ہے اور وہ ہمیں کیونکر معلوم ہو؟ ہمارے
 سفر حیات کی منزل مقصود کون سی ہے؟ علم کی ان دونوں قسموں میں سے
 یہی دوسری قسم اصل اور بنیاد کا حکم رکھتی ہے۔ ہمارے تمام جزئی علوم
 اس کی طرح ہیں اور اسی علم کے صحیح یا غلط ہونے پر ہمارے تمام
 تحقیقات اور معاملات کی صحت یا غلطی کا دارو مدار ہے۔ پس انسان کی
 تربیت و تہذیب کے لئے جو نظام بھی وضع کیا جائے گا۔ اس کی بنیاد
 اسی علم کلی پر قائم ہوگی۔ اگر علم کلی صحیح ہوگا تو تہذیب و تربیت کا نظام
 بھی صحیح ہوگا۔ اور اگر اس علم میں کوئی خرابی ہوگی تو لانا اس طریق سے
 تہذیب و تربیت کا نظام بھی خراب ہو جائے گا۔

قرآن مجید میں خدا، مالک، کتب، رسل اور عوم آخر کے متعلق جو
 مستندات پیش کیے۔۔۔ وہ اسی علم کلی سے متعلق ہیں، اور ان
 پر ایمان لانے کا مطالبہ اس قدر شدت سے اسی لئے کیا گیا ہے، کہ
 اسلام کا نظام تہذیب و تربیت اسی علم پر مبنی ہے۔ اسلام کے نزدیک
 انسان کی اکتسابی قوتوں کی تربیت اور تہذیب کا وہی نظام صحیح ہے جو
 صحیح علم کلی پر قائم ہو۔ کسی علم کلی کے بغیر جو نظام قائم کیئے گئے ہیں، یا
 جس کی بنیادیں صحیح علم پر نہیں رکھی گئی ہیں، وہ اسلئے غلط ہیں۔ ان کے تحت
 انسان کی اکتسابی قوتیں غلط راستوں پر ڈال دی گئی ہیں۔ ان راستوں سے
 میں انسان کی جو مساعی صرف ہوتی ہیں، وہ بظاہر کتنی ہی صحیح معلوم ہوتی
 ہوں، مگر حقیقت کے اعتبار سے ان کا صرف غلط ہے۔ ان کا انداز صحیح
 منزل مقصود کی جانب نہیں ہے۔ وہ کامیابی کے مقام تک نہیں پہنچ

سکتیں۔ اس لئے وہ ضائع ہو جانے والی ہیں اور ان کا کوئی قائمہ انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام صرف اپنے راستے کو "صراطِ مستقیم" کہتا ہے اور باقی تمام راستوں کو جو بلا علم یا غلط علم کی بنیاد پر اختیار کیے گئے ہیں، چھوڑ دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔

وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ
الَّتِي تَنفَرُّ عَنْ سَبِيلِهِ۔ (الانعام۔ ۱۶)

اور اسی لئے اسلام کہتا ہے کہ جس کا ایمان صحیح نہیں ہے اس کے تمام اعمال بے نتیجہ ہیں اور وہ آخر کار نامراد رہنے والا ہے۔

وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْآيَاتِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي
الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔ (الانعام۔ ۱۷)

اسلام نے جو ایسا نیات پیش کیے ہیں، وہی اس کے نزدیک عین علم، عین حق، عین صدق، عین ہدایت اور عین نور ہیں۔ اور جب وہ ایسے ہیں تو لازماً ان کے خلاف بہتے معتقدات ہیں وہ عین جہل، عین باطل، عین کذب، عین ضلالت، اور عین غفلت ہونے پائیں۔ اگر اسلام ان کو چھوڑ دینے کا مطالبہ اس قدر شدت کے ساتھ کرتا، اور اگر وہ ان غلط معتقدات کے قائلین کو صحیح ایمان رکھنے والوں کے برابر درجہ دیتا تو گویا وہ اس امر کا اقرار کرتا کہ اس کے ایسا نیات عین حق نہیں ہیں، اور اس کو ان کے صدق اور ہدایت اور نور ہونے کا خود ہی پتہ چلتا نہیں ہے۔ اس صحت میں اس کا ان ایسا نیات کو پیش کرنا، اور ان کی بنا پر حریت و تہذیب کا ایک نظام وضع کرنا، اور اس نظام میں شامل ہونے کے لئے لوگوں کو دعوت دینا، سب بے معنی ہوتا۔ اس لئے کہ اگر وہ یہ تسلیم کر لیتا کہ اس علم کلی کے خلاف دوسرے علوم بھی اسی کی طرف صحیح ہیں، یا دوسرے سے کسی علم کلی کے منظور ہونے میں بھی کوئی مضائقہ

نہیں ہے، تو اس علم کلی کو پیش کرنے اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دینے میں کوئی معنویت باقی نہ رہتی۔ اسی طرح اگر وہ یہ مان لیتا کہ اس علم کے خلاف دوسرے علوم کی بنیاد پر، یا کسی علم کلی کے بغیر، تہذیب و تربیت کے جو نظام وضع کیے گئے ہیں ان کے ذریعہ سے بھی انسان صلاح پاسکتا ہے، تو پھر نظام اسلامی کے اتباع کی طرف دعوت دینے میں کوئی وزن نہ رہتا۔

علاوہ بریں اگر وہ بحث آپ کے ذہن میں تازہ ہے۔ جو پہلے صفحات میں ایمان کی حقیقت پر کی گئی ہے، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام نے ایمان پر اس قدر زور کیوں دیا ہے؟ عقل کی دنیا میں سب سے فائدہ دہندہ، پانی پر، بلکہ ہوا پر بھی قہر تعمیر کئے گئے ہیں مگر اسلام ایک حکیمانہ مذہب ہے۔ وہ تہذیب و تربیت کی عمارت بودی بنیادوں پر تعمیر نہیں کر سکتا۔ وہ سب سے پہلے انسان کی روح اور اس کے قواسم کلی کی گہرائیوں میں مضبوط بنیادیں قائم کرتا ہے، پھر ان پر ایک ایسی عمارت بناتا ہے جو کہیں کے پلے نہیں ہٹ سکتی۔ وہ سب سے پہلے انسان کے ذہن نشین کرتا ہے کہ تیرے اوپر ایک خدا ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں تیرا حاکم ہے۔ جس کی حکومت سے تو کسی طرح نہیں بھل سکتا۔ جس کے علم سے چری کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اُس نے تیری ہدایت کے لئے رسول بھیجا ہے، اور رسول کے ذریعہ سے تجھ کو وہ کتاب اور وہ شریعت بھیجی ہے جس کے اتباع سے تو اس حاکم حقیقی کی رضا حاصل کر سکتا ہے۔ اگر تو اس کے خلاف عمل کرے گا تو خواہ تیری خلاف فہمی کیسی ہی ڈھکی چھپی ہو، وہ حاکم ضرور تیری گرفت کرے گا۔ اور تجھے سزا دے گا بغیر درجہ کے۔ یہ نفس انسان کے دل پر گہرا بٹھا دینے کے بعد وہ اخلاقی حسد کی تعلیم دیتا ہے، امر و نہی کے احکام دیتا ہے،

اور اسی نقش لیبانی کی قوت سے اپنی تعلیم کا اجماع اور اپنے احکام کی اطاعت کرنا ہے۔ یہ نقش ہٹا کر ہوگا، اجماع اتنا ہی کامل ہوگا، طاقت اتنی ہی مضبوط ہوگی، نظام تہذیب و تربیت اتنا ہی طاقتور ہوگا، اور اگر یہ نقش کمزور ہو، یا سرے سے موجود ہی نہ ہو، یا اس کے بدلے بہ کچھ دوسرے نقوش دل پر بہتے ہوئے ہوں، تو تعلیم الحقائق غرض نقش پر آب ہوگی، امر و نہی کے احکام بالکل بے زور اور بے ہوش ہوں گے، تہذیب و تربیت کا سارا نظام بچوں کا ایک گھر و عدا ہوگا، جس کے قیام و دوام کا کچھ اعتبار نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ خوشامیوز و مسخ ہو، بند ہو، مگر اس میں استحکام کہاں؟ اس بات کو قرآن حکیم میں ایک مثال کے طور سے واضح کیا گیا ہے۔

الَّذِي كُنْتُ خَشِبْتُ اللَّهُ مَثَلًا كَلِيمًا، طَلَبْتُهُ
كَشَجَرَةٍ طَلَبْتُهُ أَصْلَهَا ثَابِتٌ وَفُرْعُهَا فِي السَّمَاءِ
كُنُوتِي أَكَلَهَا كُلُّ حَبْوٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَلَيَضْرِبَنَّ اللَّهُ
الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝ وَمَثَلُ خَلِيمٍ
نَحِيشَةً كَشَجَرَةٍ نَحِيشَةٍ ۝ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ
الْأَرْضِ مِنْ مَّاءٍ مِنْ قَرَارٍ يَبْقَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا
بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ
وَيُخَلِّدُ اللَّهُ الظَّالِمِينَ وَيَعْمَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ

(ہود: ۳۰)

”کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کریم (امتداد میں) کی کبھی
مثال لکھی ہوئی ہوگی ایک چھا درخت ہے جس کی لا خوب ہی ہوئی ہے
اور شاخیں آسمان تک بلند ہیں۔ وہ اپنے پروردگار کے اقدار سے
بہر وقت پھل لے رہتا ہے۔ اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا

ہے تاکہ وہ سبق حاصل کریں اور گورنمنٹ (اسٹوڈنٹس) کی مثال ایک
 غلاب دولت کی سی ہے جو دین کے غلبے سے اُکھڑا ہوا ہے،
 کوئی جواز اور مضبوطی ہی نہیں دیکھتا۔ انسانوں کے لئے دلوں کو ایک
 قربت ثابت نہپے (استقامت) کے ساتھ دُعا و اُکھلت دونوں زندگیوں
 میں استقامت بخشتا ہے اور ظالموں کو یوں ہی ہلکتا چھوڑ دیتا ہے۔
 اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

اب تک ایسا نیا تفسیر پر یکمیت، انمولی فکر کی گئی ہے۔ اب
 تفصیل کے ساتھ دیکھنا چاہیے کہ ان پانچوں امور میں سے ہر ایک کے
 متعلق اسلام نے کیا عقائد پیش کیے ہیں؟ ہر عقیدہ کی ضرورت و مصلحت
 کیا ہے؟ انسان کی قوت فکری پر اس کا کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ اور
 دین میں اس کے جم جانے سے کس طرح ایک صالح اور نہایت مستحکم
 صورت کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے۔

ایمان باللہ

ایمان باللہ کی اہمیت

اسلام کے چوبیس اعتقادات اور عمل نظام میں پہلی اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے۔ باقی چھتے اعتقادات و ایمانیات میں سب سے پہلی ایک اصل کی فرع میں اور چھتے اعتقادی احکام اور تدبیری قوانین میں سب سے پہلی مرکز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہے اس کا مصداق اور مرجع اللہ کی ذات ہے۔ حالانکہ پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ کے مالک ہیں۔ کتابوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ کی نازل کی ہوئی ہیں۔ رسولوں پر ایمان اس لئے ہے کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ کے انعام کا دن ہے۔ فرائض اس لئے فرائض ہیں کہ اللہ نے ان کو مقرر کیا ہے۔ حقوق اس لئے حقوق ہیں کہ وہ اللہ کے حکم پر مبنی ہیں۔ اموال کا اشتغال اور نواہی سے احتساب اس لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے ہیں۔ غرض ہر چیز جو اسلام میں ہے، خواہ وہ عقیدہ ہو یا عمل، اس کی بنا پر ہر بات ایمان باللہ قائم ہے۔ اس ایک چیز کو مالک کہہ دیجئے، پھر وہ مالک کوئی چیز نہیں، عیسیٰ علیہ السلام، نہ رسول اتباع کے مستحق ٹھہرتے ہیں نہ ان کی لائی ہوئی کتابیں نہ فرائض و طاعات میں کوئی معنویت باقی رہ جاتی ہے نہ حقوق و واجبات ہیں، نہ اموال و نواہی کسی قوتِ خدا کے حامل رہتے ہیں اور نہ ضوابط و قوانین۔ اس ایک مرکز کے بٹھتے ہی یہ سارا کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ بلکہ سب سے اسلام ہی کسی چیز کا نام نہیں رہتا۔

ایمانِ باشد کا تفصیلی عقیدہ

یہ عقیدہ جو اس عظیم الشان فکری و عملی نظام میں مرکز اور ملیح قوت کا کام دے رہا ہے، محض اسی قدر نہیں ہے کہ "اللہ تعالیٰ موجود ہے" بلکہ وہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک مکمل اور صحیح تصور (جس حد تک انسان کے لئے ان کا تصور ممکن ہے) رکھتا ہے، اور اسی تصور صفات سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو انسان کی تمام فکری اور عملی قوتوں پر محیط اور حکمران ہو جاتی ہے۔ محض "سستی" باری کا اثبات وہ چیز نہیں ہے جسے اسلام کی امتیازی خصوصیت کہا جاسکتا ہو۔ دوسرے عقیدوں نے بھی ایسی ترکیبی طور سے باری تعالیٰ کے وجود کا اثبات کیا ہے البتہ جس چیز نے اسلام کو تمام مذاہب و ادیان سے ممتاز کر دیا ہے وہ یہی ہے کہ اس نے صفاتِ باری کا صحیح، مکمل اور مفصل علم بخشا ہے اور پھر اسی علم کو ایمان بلکہ اصل ایمان بنا کر اس سے حرکتِ نفس، اسرار، اخلاق، تعلیم اعمال، نشر و جمع شرع اور بنیادِ تمدن کا اتنا بڑا کام کیا ہے جو دنیا کے کسی مذہب و ملت نے نہیں کیا۔

ایمانِ باشد کی بحال صورت جس کے اقرارِ بالذہان اور تصدیقِ بالقلب کو دخولِ اسلام کی پہلی اور لازمی شرط قرار دیا گیا ہے، کلمہ "لا الہ الا اللہ" ہے۔ یعنی دل سے اس امر کی تصدیق اور زبان سے اس امر کا اعتراف کہ "الہ" بجز اس ایک، سستی کے اور کوئی نہیں ہے جس کا نام اللہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ "الوہیت" کو کائنات بحدہ اشیا سے سلب کر کے صرف ایک ذات کے لئے ثابت کیا ہے اور ان تمام ہذبات، تحلیلات، اختلاعات اور عبادات و طاعات کو "الوہیت" کے لئے مخصوص ہیں، اس ایک ذات سے متعلق کر دیا ہے۔ اس بحال کلمہ کے اجراء ترکیبی تین ہیں۔

ایک، اُلوہیت کا تصور۔

دوسرے، تمام اشیاء سے اس کی نفی۔

تیسرے، صرف اللہ کے لئے اس کا اثبات۔

قرآن مجید میں خدا کی ذات و صفات کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب انہی تینوں امور کی تفصیل ہے۔

اولاً اس نے "اُلوہیت" کا ایک ایسا مکمل اور صحیح تصور پیش کیا ہے جو دنیا کی کسی کتاب اور کسی مذہب میں ہم کو نہیں ملتا۔ اس سے شک نہیں کہ تمام قوموں اور ملتوں میں یہ تصور کسی مذہبی طور پر موجود ہے۔ لیکن ہر جگہ غلط یا نامکمل ہے۔ کہیں "اُلوہیت" نام ہے بعض اُلوہیت اور واجبیت کا۔ کہیں اس سے بعض مہدائیت مُراد لی گئی ہے کہیں اس کو قوت اور طاقت کا ہم معنی سمجھا گیا ہے۔ کہیں وہ بعض خوف اور ہیبت کی چیز ہے۔ کہیں وہ صرف محبت کا مرجع ہے کہیں اس کا مفہوم نفس، رفیع مہلکات اور اہیات و نباتات ہے۔ پھر کہیں وہ قابلِ تجرید و تقسیم ہے کہیں اس کو نجیم اور تشبیہ اور تامل سے اکوہہ کیا گیا ہے کہیں وہ آسمان پر شکن ہے۔ کہیں وہ انسانی بھیں ہل کر زمین پر آ کر آئی ہے۔ ان تمام غلط یا ناقص تصورات کی تصحیح اور تکمیل جس کتاب نے کی ہے وہ صرف قرآن ہے۔ اسی کتاب نے اُلوہیت کی تقدیس و تہدید کی ہے اسی نے بتایا ہے۔ کہ اگر صرف وہی ہو سکتا ہے جو بے نیاز، صمد اور قیوم ہو۔ جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے۔ جو قادر مطلق اور حاکم علی الاطلاق ہو۔ جس کا علم سب پر محیط، جس کی رحمت سب پر وسیع، جس سے کی طاقت سب پر غالب ہو۔ جس کی حکمت میں کوئی نقص نہ ہو جس کے حل میں علم کا شائبہ تک نہ ہو۔ جو زندگی پہنچنے اور وسائی حیات میاں کرنے والا ہو۔ جو نفع و ضرر کی ساری قوتوں کا مالک ہو۔ اس کی

بخشش اور نگہبانی کے سب محتاج ہوں۔ اسی کی طرف تمام مخلوقات کی بازگشت ہو۔ وہی سب کا حساب لینے والا ہو۔ اور اسی کو جزا و سزا کا اختیار ہو۔ پھر یہ اُکوبیت کی صفات نہ تجزیہ و تقسیم کے قابل ہیں کہ ایک وقت میں بہت سے ”اکثر“ ہوں اور وہ ان صفات یا ان کے ایک ایک حصے سے متصف ہوں نہ یہ وقتی اور زمینی ہیں۔ کہ ایک ”اللہ“ کہیں تو ان سے متصف ہو اور کہیں نہ ہو۔ نہ یہ قابل انتقال ہیں کہ آج ایک ”اللہ“ میں پائی جائیں اور کل دوسرے میں۔

اُکوبیت کا یہ کامل اور صحیح تصور پیش کرنے کے بعد قرآن اپنے اجتہادی اور بیان کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ کائنات کی جتنی اشیاء اور جتنی قوتیں ہیں ان میں سے کسی پر بھی یہ مفہوم راست نہیں آتا۔ تمام موجودات عالم محتاج ہیں، مستغنیوں، کائنات و فاسد ہیں۔ نالغ و ضار ہوتا تو درکنار خود اپنی ذات سے مزہ کو دفع کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ ان کے افعال اور ان کی تاثیرات کا سرچشمہ ان کی اپنی ذات میں نہیں ہے بلکہ وہ سب کی سب ہیں اور سے قوت وجود، قوت فعل اور قوت تاثیر حاصل کرتی ہیں۔ لہذا کائنات کی کوئی شے ایسے نہیں جو ”اُکوبیت“ کا شاخہ بھی اپنے اندر رکھتی ہو اور جس کو ہماری نیاز مند یوں میں سے کسی ایک حصہ کا بھی حق پہنچتا ہو۔

اس نفل کے بعد وہ ایک ذات کے لئے ”اُکوبیت“ ثابت کرتا ہے جس کا نام ”اللہ“ ہے، اور انسان سے مخاطب کرتا ہے کہ سب کو چھوڑ کر اسی پر ایمان لاؤ، اسی کے آگے جھکو، اسی کی تعظیم کرو، اسی سے محبت کرو، اسی سے خوف کرو، اسی سے امید رکھو جو کچھ مانگو، اسی سے توکل اسی پر کرو اور ہوشیار ہو کہ ایک طرف اس کے پاس واپس ہونا ہے، اس کو حساب دینا ہے، اور تمہارا اچھا

نہ اہم اسی کے فیصلہ پر منحصر ہے۔

ایمانِ بائبل کے اخلاقی فوائد

صفاتِ الہی کے اس تفصیلی تصور کے ساتھ جو ایمانِ بائبل انسان کے دل میں راسخ ہو جائے۔ وہ اپنے اندر ایسے غیر معمولی فوائد رکھتا ہے جو کسی دوسرے اعتقاد سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

وسعتِ نظر

ایمانِ بائبل کا پہلا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کے زاویہٴ نظر کو اتنا وسیع کر دیتا ہے جتنی خدا کی غیر محدود سلطنت وسیع ہے۔ انسان جب تک دنیا کو اپنے نفس کے تعلق کا اعتبار کرتے ہوئے دیکھتا ہے، اُس کی نگاہ اسی تنگ دائرے میں محدود رہتی ہے۔ جس کے اندر اس کی اپنی قدرت، اس کا اپنا علم، اور اس کے اپنے مطلقات محدود ہیں۔ اسی دائرے میں وہ اپنے لئے ماحبت و احسان کا شکر کرتا ہے اسی دائرے میں جو قوت دے ہیں ان سے ڈرتا اور دقتا ہے اور جو کمزوری ہیں ان پر فوقیت جتا ہے۔ اسی دائرے میں اس کی دوستی و دشمنی، محبت اور نفرت، تعظیم اور تحقیر محدود رہتی ہے جس کے لئے بجز اس کے اپنے نفس کے اور کوئی معیار نہیں ہوتا۔ لیکن خدا پر ایمان لانے کے بعد اس کی نظر اپنے ماحول سے نکل کر تمام کائنات پر پھیل جاتی ہے۔ اب وہ کائنات پر اپنے نفس کے تعلق سے نہیں بلکہ خدا کے تعلق سے نگاہ ڈالتا ہے۔ اب اس وسیع جہان کی ہر چیز سے اس کا ایک اور ہی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اب اس کو ان میں کوئی ماحبت روا، کوئی قوت والا، کوئی خدا یا کوئی نافع نظر نہیں آتا۔ اب وہ کسی کو تعظیم یا تحقیر، خوف یا امید کے قائل نہیں پاتا۔ اب اس کی دوستی یا دشمنی، محبت یا نفرت اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ خدا کیلئے

ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ میں جس خدا کو مانتا ہوں وہ صرف میرا یا میرے خاندان یا میری قوم ہی کا خالق اور پروردگار نہیں ہے بلکہ خالق انسانیت و الارض اور رب العالمین ہے۔ اس کی حکومت صرف میرے ملک تک محدود نہیں بلکہ وہ مالک الارض و سماء اور رب المشرق و المغرب ہے۔ یعنی کہ

(اس کی عبادت صرف میں ہی نہیں کر رہا ہوں بلکہ زمین و آسمان کی ساری چیزیں اس کے آگے ٹھکی ہوئی ہیں۔ وَلَیْسَ لَکُمُ الشُّرَکَآءُ شَیْءٌ ۚ وَالْاٰلَہُ مِنْ دُونِہٖ طُغٰی ۚ وَکَفَرُوْۤا ۚ (ان عین ۱۶)
(سب اس کی تسبیح و تحسین میں مشغول ہیں۔ فَسَبِّحْۤ لَکُمُ الشُّرَکَآءُ الشَّیْعَ وَالْاٰلَہُ مِنْ دُوْنِہٖ ۚ فَمَنْ یُّفْلِحُ ۚ (نہی اسرئیل ۱۵)

اس لحاظ سے جب وہ کائنات کو دیکھتا ہے تو کوئی اس کو غیر نظر نہیں آتا، سب اپنے ہی اپنے دکھائی دیتے ہیں۔ اسکی ہمدردی اس کی محبت، اس کی خدمت کسی ایسے فائزے کی پابند نہیں رہتی جس کی ہمدردی اس کے اپنے نفس کے تعلقات کے لحاظ سے کی گئی ہو۔

پس جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ کسی تنگ نظر نہیں ہو سکتا۔ اس کی وسیع المشرقی کے لئے ”بَیِّنَاتٌ لِّاٰلِہٖمَیْسَ“ کی اصطلاح جو تنگ ہے۔ اس کو تو حقیقت میں ”آفاق“ اور ”کائنات“ کہنا چاہیئے عزت نفس

پھر یہی ایمان باللہ انسان کو اپنی دولت سے اٹھا کر خود داری عزت نفس کے بلند ترین عروج پر پہنچا دیتا ہے۔ جب تک اس خدا کو نہ پہچانا تھا، دنیا کی ہر طاقت و چیز، ہر نفع یا ضرر پہنچانے والی ہر شاندار اور بزدل چیز کے سامنے ٹھکتا تھا۔ اس سے خوف کھاتا تھا

اس کے آگے ہاتھ پھیلاتا تھا۔ اس سے اُمیدیں وابستہ کرنا تھا۔ مگر جب اس نے خدا کو پہچانا تو معلوم ہوا کہ

(جہن کے آگے وہ ہاتھ پھیلا رہا تھا وہ خود تھکتا ہے۔ يَتَبَخَّرُونَ اِلٰى رَبِّهِمْ خُفًّا يَوْمَ يَكُونُ يَوْمُ الْاَوَّلٰى) (نہی سرائیکہ ۱۶)

(جہن کی وہ بندگی کر رہا تھا وہ خود اس کی طرح بند ہے۔ اِنَّ الْاَوَّلٰى تَذٰعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اٰلِهٰٓہٗا عِبَادًا اَمَّا الْاٰخِرٰتُ) (الاعرات ۲۲)

(جہن سے وہ مدد کی اُمیدیں رکھتا تھا وہ اس کی مدد تو درکنار آپ اپنی ہی مدد نہیں کر سکتے۔ لَا يَسْتَطِيعُوْنَ نَصْرَكَ وَلَا اَلْفُھُفُّ يَنْصُرُوْنَ) (الاعرات ۲۳)

(حقیقی طاقت کا مالک تو خدا ہے، اِنَّ الْقُوَّةَ يَلٰہِا جَمِیْعًا) (الہنقرہ ۶۰)۔

(وہی حکمران اور صاحب امر ہے، اِنَّا الْخٰلِقُ اِلٰہًا يَلٰہِا) (الاحقاف ۷۰)۔

(سہمی و مددگار اس کے سوا کوئی نہیں، وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اٰلِهٰٓہٗ مِنْ وَلٰٓئٍ وَلَا نٰصِرٍ) (الہنقرہ ۱۲)

(مدد اس کی جانب سے ہوتی ہے، وَمَا اَنْصَرُاۤلَا وَمِنْ عِنْدِ اٰلِهٰٓہٗ الْعَزِیْزِ الْخٰكِيْنَ) (الکہن ۱۳)۔

(بدلتی دینے والا وہی ہے، اِنَّ اٰلِهٰٓہٗا هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِّیْنِ) (القدرت ۳)

(زمین و آسمان کی گنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں، لَمَّا مَقَالَتْ السُّلُوْمُ وَالْاَمْرٰتُ) (الشوریٰ ۲)

مارنے اور ہلانے والا وہی ہے یعنی کہ
(اُس کے اذن کے بغیر نہ کوئی کسی کو مار سکتا ہے نہ بھاسکتا)

ہے، وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ۔ (آل عمران-۱۵)
 (اور زندہ کرنے اور مارنے والا اللہ تعالیٰ ہے، وَاللَّهُ يَخَيُّ
 وَيُؤَيِّتُ۔ (آل عمران-۱۷)

(نفع و ضرر پہ پہلانے کی اصل طاقت اسی کے ہاتھ میں ہے،
 وَإِنْ يَسْأَلْكَ اللَّهُ بِشَيْءٍ فَلَا تَحِثُّ لَهٗ إِلَّا هُوَ وَإِنَّكَ لَآتٍ
 بِشَيْءٍ فَلَا تَرَأَىٰ لِلْغَيْبِ شَيْئًا۔ (یونس-۱۱)

یہ جلم حاصل ہونے کے بعد وہ تمام دنیا کی قوتوں سے بے
 نیاز اور بے خوف ہو جاتا ہے۔ خدا کے سوا اس کی گردن کسی کے
 آگے نہیں جھکتی۔ خدا کے سوا اس کا ہاتھ کسی کے آگے نہیں پھیلتا۔
 خدا کے سوا کسی کی حاکمیت اس کے دل میں نہیں رہتی۔ خدا کو چھوڑ کر
 وہ کسی دوسرے سے امید یا وابستہ نہیں کرتا۔
 انکسار و خضوع

لیکن یہ خودداری وہ جھوٹی خودداری نہیں ہے جو اپنی قوت،
 دولت یا قابلیت کے گھنڈ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ عزت نفس وہ عزت
 نفس نہیں ہے۔ جو ایک بر خود غلط انسان میں نخوت و غرور اور تکبر
 کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ نتیجہ ہے خدا کے ساتھ اپنے اور
 اور تمام موجودات عالم کے تعلق کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے کا۔ ایسے
 خدا پر ایمان رکھنے والے میں خودداری انکسار کے ساتھ، اور عزت
 نفس خشوع و خضوع کے ساتھ ہم رشتہ ہوتی ہے۔ وہ جاننا ہے کہ
 خدا کی طاقت کے سامنے میں بالکل بے بس ہوں۔ ارشاد ہے۔

وَهُوَ الْعَظِيمُ فَوقَ وَمِثْلِهِ۔ (الاحقاف-۱۷)

خدا کی فرمائروائی سے ٹھکانا میرے اور کسی ہستی کے بس میں
 نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

يَا مَعْشَرَ الْجِبِّ وَالْأَرْضِ ابْنَ اسْطَغْفِرْ لِي تَنْفَعُوا
 مِنْ أَثْقَابِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ قَائِدًا قَائِدًا
 تَنْفَعُونَ إِلَّا يَسْلُطِي۔ (احزاب۔ ۲)

(میں کیا تمام عالم خدا کا محتاج ہے اور خدا بے نیاز ہے، واللہ
 الغنی وَأَسْتَغْفِرُ الْقَوْمَ۔ (محمد۔ ۱۳)
 (زمین و آسمان میں جو کچھ ہے خدا کا ہے، اللہ مافی السَّمَوَاتِ
 وَمَا فِي الْأَرْضِ۔ (احزاب۔ ۳))

اوسے مجھے یوں جو نعمت ملی ہے خدا سے ملی ہے، وَمَا يَكْفُرِينَ
 بِعِصْيَا رَبِّهِمْ الْأَثَلُ۔ (النمل۔ ۷)

اس عقیدہ کے بعد خود بخود کہاں رہ سکتا ہے۔ ایمان باللہ کا تو
 خاصہ لازم یہ ہے کہ وہ انسان کو سراپا اکسار بنا دیتا ہے۔
 وَجِبَادَ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَتَنَشَّؤْنَ عَلَى الْأَرْضِ
 هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا۔

(الفرقان۔ ۶)

”خدا کے رعبان کے خاص، جسے تو وہ زمین و آسمان پر فروتنی
 کے ساتھ چلتے ہیں اور جب ان سے جہالت کی باتیں کرتے
 ہیں تو وہ سلام کے الگ ہو جاتے ہیں۔“

غلط توقعات کا ابطال

خالق اور مخلوق کے تعلق کی صحیح معرفت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے
 کہ اس سے ان تمام غلط توقعات اور جھوٹے بہر و سوسوں کا خاتمہ ہو
 جاتا ہے جو عدم معرفت کا نتیجہ ہیں اور انسان خوب سمجھ لیتا ہے کہ
 اس کے لئے اعتقاد صحیح اور عمل صالح کے سوا فلاح و نہایت کا اور
 کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ جو لوگ اس معرفت سے محروم ہیں ان میں سے

کوئی سمجھتا ہے کہ خدا کے کاموں میں بہت سے اور چھوٹے چھوٹے
خدا بھی شریک ہیں۔

(ہم ان کی خوشامد کے سفارش کرا لیں گے، وَنَعْبُدُكَ وَنَعْبُدُكَ
شَفَعَاؤُنَا بِحَقِّكَ اللَّهُ۔ (یونس۔ ۱۲)

کوئی سمجھتا ہے کہ خدا و خدا رکشا ہے اور اس بیٹے نے ہمارے لئے
کفارہ بن کر سزا کے کا حق منسوخ کر دیا ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ
(ہم خود اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں، قَالَتِ الْيَهُودُ
وَالنَّصَارَى نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُكُمْ۔ (المائدہ۔ ۱۲)

ہم خواہہ کچھ کریں، ہمیں سزا نہیں مل سکتی۔ اسی ہی اور بہت سی
غلط توقعات ہیں جو لوگوں کو ہمیشہ گناہ کے چکر میں پھنسانے رکھتی ہیں
کیونکہ وہ ان کے جبر و سرپر اپنے نفس کی پاکیزگی اور عمل کی اصلاح سے
قائل ہو جاتے ہیں۔ لیکن قرآن جس ایمان یا اللہ کی تعظیم دیتا ہے۔ اس
میں غلط توقعات کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی
قوم خدا کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتی۔

(سب اس کے مخلوق ہیں اور وہ سب کا خالق، بَلْ أَنتُمْ شَرٌّ
بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقْنَا۔ (المائدہ۔ ۱۳)

(بزدلی اور اختصاص جو کچھ ہے فتویٰ کی بنا پر ہے، إِنَّ الْوَسْطَانِ
بِحَقِّكَ اللَّهُ أَفْضَلُكُمْ۔ (الحجرات۔ ۲)

(خدا نہ اولاد رکھتا ہے نہ کوئی اس کا شریک و مددگار ہے، لَمْ
يَشْهَدْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهَا شَرِيكٌ فِي الْمَلَكُوتِ وَلَمْ يَكُنْ لَهَا
وَلِيٌّ مِّنَ الدُّنْيَا۔ (نحی اسرائیل۔ ۱۲)

(جن کو تم اس کی اولاد بناؤ اس کا شریک سمجھتے ہو وہ سنت اللہ کے
بندے اور غلام ہیں، بَلْ لَّمَّا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ خَلَقْنَا

قَابِشُونَ۔ (المعروہ۔ ۱۲)

(کبھی میں جرات نہیں کر اس کے ان کے بغیر سفارشی کر سکے،

مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَكَ إِلَّا بِإِذْنِكَ۔ (المعروہ۔ ۲۲)

(اگر تم نا فرمانی کرو گے تو کوئی سفارشی اور مددگار نہیں اس کی

پاداش سے بچا سکے گا، وَإِذَا أَسَأَا إِلَى اللَّهِ فَتُومِرُ سُوءَ فَلَا مَنَّةَ

لَهُ وَمَا هُمْ بِمُعْتَدِينَ۔ (المعروہ۔ ۲۷)

رجائیت اور اطمینان قلب

اسی کے ساتھ ایمان باللہ انسان میں ایک ایسی رجائی کیفیت پیدا

کر دیتا ہے جو کبھی حال میں یا ہوس اور شکستہ دلی سے مغلوب نہیں

ہوتی۔ مومن کے لئے ایمان امیدوں کا ایک لازوال خزانہ ہے جس

سے قوت قلب و تسکین روح کی دائمی اور غیر متقطع رسد اس کو پہنچتی

رہتی ہے۔ چاہے وہ دنیا کے تمام دروازوں سے ٹھکرا دیا جائے،

سارے اسباب کا رشتہ ٹوٹ جائے، وسائل و فرائض ایک ایک کر

کے اس کا ساتھ چھوڑ دیں، مگر ایک خدا کا سہارا اس کا ساتھ کبھی

نہیں چھوڑتا اور اس کے بل پر وہ ہمیشہ امیدوں سے بھرپور رہتا ہے

اس لئے کہ جس خدا پر وہ ایمان لایا ہے وہ بکارت ہے کہ

(میں تمہارے قریب ہوں اور تمہاری پکار سنتا ہوں، وَإِذَا

سَأَلْتَهُ بِمَا دَعَايَ أَقْبَىٰ قُرْبَىٰ أَجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا

دَعَاكَ۔ (المعروہ۔ ۱۳)

(مجھ سے ظلم کا خوف نہ کرو کہ میں ظالم نہیں ہوں، وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي

بِغَلَاظِ الْبَصَرِ۔ (آل عمران۔ ۱۷)

بلکہ میری رحمت کے امیدوار ہو کہ

(میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے، وَمَا تَشِيعُ وَبَعَثَ كُلِّ

مشقی: (احزاب-۱۹)

(میری رحمت سے مانگو تو وہ ہوتے ہیں جو تم پر ایمان نہیں لکھے، اِنَّكَ لَا يَسْتَحْيِي مِنْ شَرِّهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ۔)
(یوسف-۱۰)

زبا مومن تو اس کے پنے دوسری کا کوئی مقام نہیں۔
(اگر اس نے کوئی قصور کیا ہو تو تم سے معافی مانگے، میں اس کو معاف کر دوں گا، وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيُخْرِجْهُ مِنْهُ مَخْرَجًا طَيِّبًا۔ (احزاب-۴۹)

اور
قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى اَنفُسِكُمْ لَا تَقْلُبُوْا
وَسْوَءَ ظَنِّهِ اِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذَّنْبَ جَمِيْعًا۔
(الحجرات-۶)

(اگر دنیا کے اسباب اس کا ساتھ نہیں دیتے تو وہ ان پر ضرور چھوڑ کر میرا دامن تمام۔۔۔ ہر خوف و حزن اس کے پاس بھی سہا پہنکے گا، اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْهِمُ السَّلٰطَةُ اِلَّا تَتَّقُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا۔ (طہ-۴۰)
(میری مدد وہ چیز ہے جس سے دلوں کو سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے، اِلَّا يَذْكُرِ اللّٰهُ ظُلُمًا۟ۢ ثُلُوْثًا۔ (المد-۱۴)

صبر و توکل

پھر یہی رہائش ترقی کے صبر و استقامت اور توکل علی اللہ کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں مومن کا دل ایک سنگین پریشان کی طرح مضبوط و مستحکم ہو جاتا ہے، اور ساری دنیا کی مشکلیں، دشمنیاں، تکلیفیں، مفرتیں اور مخالفت طاقتیں مل کر بھی اس کو اپنی جگہ سے نہیں

ہلا سکتیں۔ یہ قوت انسان کو بجز ایمان باللہ کے اور کسی قدرے عاجل نہیں ہوتی۔ کیونکہ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتا اس کا ہر وہ ان لہوی یا وہی اسباب و وسائل پر ہوتا ہے جو خود کسی طاقت کے مالک نہیں ہیں۔ ان کے کل پر سینے والا گویا ہمارے حکیموت کا سہارا بیکار ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:-

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ
كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بِعِثًّا وَإِنَّ أَوْهَنَ
الْحَيَوتِ لَبِعِثُ الْعَنكَبُوتِ (حکیموت۔ ۴)

(اے کزور سہاروں پر جس کی زندگی کا دار، ہو اس کا کزور ہو جانا تو یقین ہے، خففت الطالب والسطلوب۔ (الح۔ ۱۱))

(مگر جس کا ہر وہ خدا پر ہے، جس نے خدا کا دامن تمام سہا ہے، اس کا سہارا ایسا مضبوط ہے کہ وہ کبھی ٹوٹ ہی نہیں سکتا، وَمَنْ يَتَّخِذْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا فُتْرَاصَ لَهَا۔ (البقرہ۔ ۲۵۷))

(اس کے ساتھ تو رب السموات والارض کی طاقت ہے، اس پر کون سی طاقت غالب آسکتی ہے؟ اِنْ يَتَّخِذْ كُفْرًا لِّلَّهِ فَلَا خَالِيبَ لَکُمْ۔ (الح۔ ۱۷))

اس کو تو تمام جہان کی محبتیں مل کر بھی مہر و ثبات اور پامردی و استقامت کے مقام سے نہیں ہٹا سکتیں۔ کیونکہ

(اس کے نزدیک سب بڑا اور جملا اللہ کی طرف سے ہے، قُلْ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ۔ (احزاب۔ ۵۷))

(جو محبت بھی آتی ہے تقدیر الہی کے تحت آتی ہے اور اگر کائنات والہ بھی بجز اللہ کے کوئی نہیں ہے، قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا

مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُؤْمِنُونَ۔ (التوہ۔ ۱)۔

انبیاء علیہم السلام نے جس فوق البشری قوت سے دنیا کی ہر تک
مصیبتوں کا مقابلہ کیا تھا، تنہا بڑی بڑی سلطنتوں اور طاقتور قوموں سے
غیر و اکراما ہوئے، اسباب و قوی کے بغیر دنیا کو مسخر کرنے کا عزم سے
کر گئے، اور مشکلات کے طوفانوں میں بھی اپنے مشن سے نہ ہٹے،
وہ بھی مبروہ قوت کی قوت علی۔ حضرت ابراہیمؑ کو دیکھئے۔ اپنے
ملک کے تیار فرماں روا سے مناظرہ کرتے ہیں، بے خوف آگ میں
کو دھڑکتے ہیں۔ اور آخر اِنِّیْ ذَا صِبْغٍ اِلٰی مَرْبِّیْ سُبْحٰنَہٗ کہہ کر کسی
سرو سامان کے بغیر وطن سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ حضرت یحییٰؑ
کو دیکھئے۔ کسی طرح ماد کی نذر دست قوت کو چھین دیتے ہیں۔
لَکِنِّیْکَ وَابْنِیْ جَمِیْعًا شَہْدَ لَا تُشْکِرُوْنَ اِلَیَّیْ تُوْکَلِّفُ
عَلٰی اللّٰہِ مَرْبِّیْ وَرَہْجُکُمْ مَّا مِیْن ذٰلِکَ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ (یوسف۔ ۵)

”تم سب مل کر اپنی چالیں چل دیکھو اور سبکے ہرگز جلتے نہ
دو۔ میں تو اس خدا پر مبروہ سا کر چکا ہوں جو میرا اور تمہارا سب سے
بڑا مالدار ایسا نہیں ہے جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔“
حضرت موسیٰؑ کو دیکھئے۔ خدا کے مبروہ سے یہ فرعون کی نذر دست
طاقت سے مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ قتل کی دھمکی دیتا ہے تو جواب دیتے
ہیں کہ میں یہ حکمران کے مقابلہ میں اس کی پناہ لے چکا ہوں جو میرا اور تم سب
کا رب ہے، اِنِّیْ اُحْذَرُکَ ہٰذَا وَرَہْجُکُمْ مِّنْ کُلِّیْ مُشْکِیْمًا (القصص۔ ۲۰)
بصر سے نکلنے وقت فرعون اپنی نذر دست طاقت کے ساتھ ان کا پیچھا کرتا
ہے۔ ان کی نذر دست قوم گھبرا کر کہتی ہے کہ دشمنوں نے ہم کو آگیا، اِنَّا

لَمَّا تَرَكُونِ۔ مگر وہ انتہائی سکون قلب کے ساتھ کہتے ہیں ہرگز نہیں
 اللہ میرے ساتھ ہے، وہی مجھ کو سلامتی کی راہ پر لگا دے گا۔ کَلَّا
 اِنَّ مَعِيَ تَرْبَوَاتٍ مِّنْ بَيْنِ (الشوریہ ۴) سب سے آخر میں نبی عربی علیہ
 الصلوٰۃ والسلام کو دیکھئے۔ ہجرت کے موقع پر ایک غار میں تشریف
 رکھتے ہیں۔ ہجرت ایک رفیق ساتھ ہے۔ خون کے پیالے کنارہ
 پہنچتے ہیں۔ مگر آپ اس وقت بھی مضطرب نہیں ہوتے۔ اپنے
 ساتھی سے فرماتے ہیں، لَا تَحْزَنَنَّ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ (البقرہ ۶)۔
 ”ہرگز نہ گھبراؤ اللہ ہم کے ساتھ ہے“ یہ ناقابلِ تفسیر قوت، یہ آہستہ عزم،
 یہ پہاڑ کی سی استقامت، بجز ایمان باللہ کے اور کس چیز سے حاصل
 ہو سکتی ہے؟
 شہادت

اس سے ملتی جلتی ایک اور صفت بھی ہے جو ایمان باللہ سے
 غیر معمولی طور پر پیدا ہوتی ہے، یعنی جرأت و بہادری اور شہادت
 شہادت۔ انسان کو دو چیزیں نڈر دل بناتی ہیں۔ ایک محبت جو وہ اپنی
 جان، اپنے اہل و عیال اور اپنے مال سے رکھتا ہے۔ دوسری قوت
 جو یہ سمجھتا ہے اس غلط اعتقاد کا نقصان پہنچانے اور جاک کر دینے
 کی قوت و حاصل ان اشیاء میں ہے جو محض آکر کے طور پر استعمال ہوتی
 ہیں۔ ایمان باللہ ان دونوں چیزوں کو دل سے نکال دیتا ہے۔ مومن
 کے دل میں یہ اعتقاد سرایت کر جاتا ہے کہ خدا سب سے زیادہ
 محبت کا حق رکھتا ہے، فَاَلَّذِينَ اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ۔ (البقرہ ۲۰)
 اس کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ مال اور اولاد سب دنیا کی
 زینتیں ہیں جن کا کبھی نہ کبھی خاتم ہونا یقینی ہے، کبھی نہ خاتم بھونے
 والی چیز وہ ہے جو خدا کے ہاں بیٹھی۔ اَلْاِنْسَانُ وَالْاِنْسَانُ جَانِبُهُ

اور اگر موت کا کھا بڑا وقت آئے پہنچے تو پھر وہ کسی کے ٹلنے کی نہیں
 سکتی، قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْ بَعْدِهِ لَتَلَذَّ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ
 إِلَيْكُمْ مَتَاعًا جَمِيعًا۔ (آل عمران: ۱۶)۔ پس جب معاملہ یہ ہے تو لوگوں کو
 سے ڈرنے کے بجائے خدا سے ڈرنا چاہیئے۔ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْا اللَّهَ
 إِنَّ كُنتُمْ تَحِبُّونَ۔ (آل عمران: ۱۸) وہی حقیقت میں ایسی تھی ہے
 جس سے ڈرنا چاہئے، وَاللَّهُ أَكْبَرُ إِنَّ تَحْشَدَكُمْ (الاحزاب: ۵) راو خدا
 میں لڑنے سے ہی بڑا تھا تو ان کا کام ہے جن کے دل میں ایمان نہیں،
 اس لئے کہ وہ خدا سے زیادہ بندوں سے ڈرتے ہیں، يَخْشَوْنَ
 النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً۔ (النساء: ۱۱) اور جو ہم سے
 مومن ہیں وہ تو دشمنوں کے دل بادل دیکھ کر بھانے لگنے کے اور
 زیادہ ڈیر ہو جاتے ہیں، کیونکہ ان کا بھروسہ و نوری طاقت پر نہیں
 تھا پس ہے۔

الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ
 فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ
 الْوَكِيلُ۔ (آل عمران: ۱۷)

قناعت و استغناء

پھر بھی ایمان باللہ انسان کے دل سے حرص و ہوس اور رشک
 حسد کے وہ رکیک جذبات بھی دھڑک رہا ہے۔ جو اس کو ہلکے منت کیلئے
 دیر نہ بھارتھ جائے اختیار کرنے پر آمادہ اور بنی نوع انسان کو یہ غلبہ پر کھلتی ہی
 ایمان کیساتھ انسان میں قناعت اور استغناء پیدا ہوتا ہے۔ وہ دوسروں سے
 متعلقہ اناقت نہیں کرتا، ظلم و ستم کی وارداتوں میں دھڑ دھوپ نہیں کرتا
 ہمیشہ باعزت طریق سے اپنے رب کا فضل تلاش کرتا ہے۔ اور جو
 نقص یا بہت مل جاتا ہے اس کو خدا کی دین سمجھ کر قناعت کر لیتا ہے۔

مومن کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ فضیلت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کو چاہتا ہے بخشا ہے، قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔ يُخْتَصُّ بِرُحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ۔ (اکیسویں)۔

مذاق اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کو جتنا چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ يُنْصُطُّ التَّوْبَتِ بِيَدِهِ يَشَاءُ وَيُفْتِي سَاء۔ (اردو ۲)۔ حکومت اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے حکمران بنادے، إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ مِنْ بَيْنَادِهِ (احول ۱۵) عزت و دولت اسکے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے عزت بنادے اسی سے چاہے ذلیل کر دے۔ لَعَلَّ مَنْ يَشَاءُ وَذَلِيلٌ مَنْ يَشَاءُ بِيَدِكَ الْغُيُوثُ تَكَثَّرَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ ۚ فَلْيُؤَيِّدْ۔ (اکیسویں)۔ پھر دُنیا کا یہ نظام کہ عزت و دولت قوت، حسن، ناموری اور دوسرے مواہب کے اعتبار سے کوئی گشتا ہوتا ہے اور کوئی بڑھا ہوا، دراصل اللہ ہی کا قائم کردہ ہے۔ لَعَلَّ اِخْتِصَالَ مَسْلُكِي كُوْنُوْهُ بَهْتَرُ مَا تَحْتَ اِيْدِهِ۔ اس کے بنائے ہوئے نظام کو ہلنے کی کوشش کرنا نہ تو انسان کے لئے مناسب ہے اور خاص میں کامیابی ممکن ہے۔ وَاللَّهُ لَنَنْصُرَنَّكَ عَلَى بَعْضِ الْوَيْلِ (احول ۱۰)۔ وَلَا تَسْتَوُوا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بَيْنَهُ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ۔ (النار ۵)

اصلاح اخلاق و تنظیم اعمال

ان سب سے زیادہ اہم فائدہ وہ ہے جو ایمان باللہ سے تمیز کے پہنچتا ہے۔ اس سے انسانی جماعت کے افراد میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ نفوس میں پاکیزگی اور اعمال میں پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کے باہمی معاملات درست ہوتے ہیں۔ پابندی قانون کی میں پیدا ہوتی ہے۔ اطاعت امر اور ضبط و نظم کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور افراد ایک دہر دست باطنی قوت سے اللہ ہی احمد شکر کر ایک صالح اور

منظم سوسائٹی بنانے کے لئے مستعد ہو جاتے ہیں۔ یہ دراصل ایمان
 باللہ کا معجزہ ہے اور اسی کے لئے مخصوص ہے۔ دنیا کی کسی ملک یا
 قوت، یا تعلیم و تربیت، یا وعظ و تلقین سے اصلاح اخلاقی اور تنظیم
 احوال کا کام آئے وسیع ہی آنے اور اتنی گہری بنیادوں پر انہام نہیں
 پاسکتا۔ دُعاوی قوتوں کی رسانی نوح تک نہیں صرف جسم تک ہے
 اور جسم پر بھی ان کی گرفت ہر جگہ اور ہر وقت نہیں ہے۔ تعلیم و تربیت
 اور وعظ و تلقین کا اثر بھی صرف عقل و فکر تک محدود رہتا ہے اور
 وہ بھی ایک مدت تک۔ رہا نفس امارہ قوت نہ صرف خود اس سے
 غیر متاثر رہتا ہے بلکہ عقل کو بھی مغلوب کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا۔
 لیکن ایمان وہ شے ہے جو اپنی اصلاحی اور تنظیمی قوتوں کو اپنے دلوں
 انسان کے قلب و نوح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور وہاں ایک
 ایسے طاقتور اور بیدار ضمیر کو نشوونما دیتا ہے جو ہر وقت ہر جگہ انسان
 کو تقویٰ اور طاعت کی سیدھی راہ دکھاتا رہتا ہے اور شر سے شرم
 نفوس میں ہی اپنی طامستوں اور سرزنشوں کا کچھ نہ کچھ اثر پہنچائے بغیر
 نہیں رہتا

یہ عظیم الشان فائدہ علم الہی اور قدرت خداوندی کے اس اعتقاد
 سے حاصل ہوتا ہے جو ایمان کا ایک ضروری جز ہے۔ قرآن مجید میں
 بلکہ انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ کُفرا کا علم ہر چیز پر مادی ہے۔ اور
 کوئی بات اس سے چھپ نہیں سکتی۔

وَاللّٰهُ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَآيُنَا تُؤَلُّوْا فَنُفِثُ

وَجَعَلْنَا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ قَاسِمٌ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ (البقرہ: ۱۴)

”مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کا ہے تم ہر چیز کو دے

اور اللہ مجھ دے، جیسا اللہ دہی وسعت والا اور جاننے والا

ہے۔

أَيُّهَا أَكْلُوا لَوْ أَنَّمَا يَكْتُمُ اللَّهُ حَبِيبَاتٍ لِّلَّهِ

عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (المعارج: ۱۷)

”اے میرا کون میں جو اللہ تم سب کو پکڑ رکھتا ہے، یقیناً

اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا

فِي السَّمَاءِ۔ (آل عمران: ۱)

”یقیناً اللہ سے کوئی چیز چھپا نہیں ہے نہ زمین میں اور نہ

آسمان میں۔“

وَعِندَكَ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ

وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّيْرِ وَالْبَحْرِ وَمَا كُنْتَ مِنْ ذَمَرِهِ

إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا خَبْرَةَ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا يُطِيقُ

وَلَا يَأْتِيهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ۔ (الأنعام: ۵)

”اور اس کے پاس غیب کی کھلیں ہیں جن کا علم اس کے سوا کسی

کو نہیں۔ اور جو زمین اور بحر میں چھپا ہو وہ جانتا ہے۔ ایک چیز میں

گم نہی ہو اگر کتب تو اللہ کو اس کا علم ہو جائے اور زمین کھ

تائیک تھوں میں کوئی دھند و سامان اور غلط و بر چیز ایسی نہیں

جو ایک کتب نہیں میں لکھی ہوئی موجود نہ ہو۔“

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَعِّدُونَ

بِهِ نَفْسُكَ وَالَّذِينَ أَحْبَبْتَ إِلَيْنَا مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلِلَّهِ

(نہ: ۲)

”ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے، اور ہم وہ باتیں کہتے

ہیں جن کا دوسروں کے نفس میں آگاہ ہے۔ ہم اس کی شراک سے

یہی زیادہ اس سے قریب ہے۔

مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ سَامِعٌ بِهِنَّ
وَلَا خَفِيَةٍ إِلَّا هُوَ سَاهِمٌ بِهِنَّ وَلَا أَذَى مِنْ
خَلْفٍ وَلَا أَكْثَرُ إِلَّا هُوَ مُعَهِدٌ بَيْنَ مَا كَانُوا

(المجاد-۳)

”کوئی سرگوشی تین آدمیوں میں ایسی نہیں ہوتی۔ جس میں جو تمنا
ہو، اور کوئی سرگوشی پانچ آدمیوں میں ایسی نہیں ہوتی جس میں
پہنائی نہ ہو۔ اور نہ اس سے کم یا زیادہ آدمیوں کا کوئی اجتماع
ایسا ہے جس میں وہ ان کے ساتھ نہ ہو، خود وہ کہیں ہو۔“

يَسْتَفْهِنُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَحْفُظُونَ مِنَ
اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُكَيِّدُونَ مَا لَا يَنْزِلُ مِنَ
الْقَوْلِ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَفْعَلُونَ مُخِيطًا۔ (النمل-۹)

”وہ لوگوں سے چُھپ سکتے ہیں، مگر خدا سے نہیں چُھپ
سکتے۔ خدا اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ اس کی
مدد کے خلاف باتوں کو چُھپ کر باتیں کرتے ہیں اور وہ جو کچھ
بھی کرتے ہیں اس پر لکھا ٹھہرتا ہے۔“

أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُرْسُونَ وَمَا
يُغْلِبُونَ۔ (البقرہ-۹)

”کیا وہ نہیں جانتے کہ وہ خفیہ اور ظاہر جو کچھ بھی کرتے ہیں
خدا کو اس کا علم ہے۔“

إِذْ يَثْلُثِي السُّلُوكِ مِنَ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ
مُجِيبٌ، مَا بَلِغَتْ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ۔
(آل عمران-۴۱)

”جو عہدہ کرنے والے فرشتے ہر شخص کے درمیں اور انھیں
بھیجے جہاد کی ہے، کوئی بات زبان سے ایسی نہیں نکلے کہ کوئی بگڑانی
کرنے والا اس کو نکلنے کے لئے تیار نہ ہو۔“

سَوَاءٌ أَقَاتَكُمُ مِّنْ أَسْرَ الْعَوْنِ وَمَنْ جَهَنَّمِ
وَمَنْ هَلُو مَسْخَفِ بِاللَّيْلِ وَسَائِرِهَا الْقَهَارِ كَمَا
مُعَقَّبَاتٍ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهَا وَحِثِّ خَلْقٍ يَخْتَلِفُونَ
وَمِنْ أَمْرِ اللَّهِ (المعد: ۲)

”خواہ تم میں سے کوئی چٹا کر بات کرے یا ہلکب دلی،
اور خواہ کوئی رات کی تاریکیوں میں پوشیدہ ہو یا دن کی روشنی میں
پہل نہا ہو، ہر حال اس کے آگے اور پیچھے خدا کے ہاتھوں
ہوئے ہیں جو خدا کے حکم سے اس کی گہرائی کرتے ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی خوب اچھی طرح انسان کے ذہن
نشیں کر دی گئی ہے کہ ایک دن ضرور خدا کے سامنے حاضر ہونگے
وَاعْلَمُوا أَنكُم مَّلَكُوتُ (البقرہ: ۲۸) وَاعْلَمُوا أَنكُم لَآئِبٌ
تُخَشَرُونَ (البقرہ: ۲۵)۔ اور اس کو ہر چیز کا حساب دینا ہے إِنَّ اللَّهَ
كَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ حَاسِبًا (النساء: ۵) اور اللہ کی ہر بڑی سخت
ہے، إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ (البقرہ: ۲۵)۔

یہ عقیدہ جس کو طرح طرح سے دل میں بٹانے کی کوشش کی گئی
ہے، وہ اصل اسلام کے پورے قانون کی قوت نافذ ہے۔ اسلام
نے حرام و حلال کے جو حدود بھی مقرر کیے ہیں، اخلاق، معاشرت اور
معاملات کے متعلق ہر احکام بھی دیتے ہیں، ان کے نفاذ کا اصل
انحصار نہ قوت اور پولیس پر ہے، اور نہ تعلیم و تلقین پر۔ بلکہ وہ نفاذ
کی قوت اس عقیدہ سے حاصل کرتے ہیں کہ ان کا مقرر کرنے والا

ایمان بالملائکہ

ایمان بالملائکہ کا مقصد

فرشتوں پر ایمان حاصل ایمان باللہ کا تتمہ اور اس کا ضمیمہ لازم ہے۔ اس کا مقصد غرض یہی نہیں ہے کہ ملائکہ کے وجود کا اثبات و اقرار کیا جائے، بلکہ مقصد اصلی یہ ہے کہ نظام وجود میں ان کی صحیح حیثیت کو سمجھ لیا جائے، تاکہ ایمان باللہ خاص توحید پر قائم ہو، اور شرک و جہالت ماسوائے اللہ کے تمام شائبوں سے پاک ہو جائے جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، لہذا کایک بھالی تصور تمام جنوں اور بندہوں میں کسی نہ کسی طرح موجود رہا ہے۔ اسی تصور پر مختلف مذاہب نے مختلف اعتقادات کی عمارتیں قائم کر لی ہیں۔ کسی کے نزدیک وہ نوا میں فطرت اور قدرت کی وہ طاقتیں ہیں جو نظام کائنات کے مختلف شعبوں کو چلا رہی ہیں۔ کسی کے خیال میں وہ دیوتا ہیں جن میں سے ہر ایک کارگاہ عالم کے ایک ایک حکمران صائب ہے، مثلاً کوئی ہوا کا مالک، کوئی بارش کا، کوئی روشنی کا اور کوئی حرارت یا آگ کا۔ کسی کے اعتقاد میں وہ خدا کے نائب اور مددگار ہیں۔ کسی کے نزدیک وہ ارباب الانواع ہیں۔ کسی کے خیال میں وہ عقلی ہیں۔ کسی کی رائے میں وہ خدا کے تصورات ہیں۔ اور کوئی ان کو خدا کی اولاد سمجھتا ہے۔ پھر کسی نے ان کا مادی جسمانی وجود مانا ہے۔ کسی نے ان کو مجربات و معارفات میں سے شمار کیا ہے۔ کسی نے ان کو سیارات و نیرات کے ساتھ متحد و موجود کر لیا ہے۔ اور کسی نے ان کے

”کافروں نے کہا کہ ہمارے کئی کو بیٹا بنایا ہے۔ پاک ہے
اس کی ذات۔ وہ (فرشتے) تو اس کے سوا کسی سے ہیں، اس کے
آگے بڑھ کر بات تک نہیں کر سکتے اور یہی وہی کرتے ہیں جس کا
وہ حکم دیتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے
پیچھے ہے سب کو کھانا مانا ہے۔ وہ کبھی سفارش نہیں کر سکتے
نہ اس کے جسے ناپسند فرماتا ہو اور وہ جلالی خداوندی
سے ڈرتے رہتے ہیں۔“

ان کی حیثیت تدبیرات امر کی ہے (الاعلام: ۱) یعنی وہ صرف
ان امور کی تدبیر کرتے ہیں جو اللہ نے ان کے سپرد کر دیے ہیں۔ انسانی
میں شریک ہونا تو درکنار ان میں اتنی جہالت ہی نہیں کہ اس کے حکم
سے یک سر نو تجاوز کر سکیں۔ ان کا کام تو محض اطاعت اور عبادت
ہے۔ ایک لڑکے نے بھی وہ اپنے ولیفدے سے غافل نہیں ہوتے
اور ہر دم اپنے رب کی تسبیح و تہلیل کرتے رہتے ہیں۔
يُسَبِّحُ الرَّبَّ عَزَّ وَجَلَّ وَالْمَلَائِكَةُ بَيْنَ يَدَيْهِ
(المع: ۲)

”یہی حمد و ثناء کے ساتھ اس کی بزرگی بیان کرتے ہیں۔ اور
فرشتے عورت کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں۔“

وَاللَّهُ يَجْعَلُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ
مِنْ ذَاتٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ،
يَتَخَفُونَ رَبَّهُمْ حِينَ قُورِئُوا وَلَيَعْلَمُونَ مَا يُؤْمَرُونَ۔
(الحمل: ۶)

”اللہ کے لئے سزیموں میں وہ جو آسمانوں میں ہیں اور زمین
میں پختے پھرتے ہیں، اور ملائکہ، وہ سرکاری نہیں کرتے اپنے رب

سے جو ان سے بالاتر ہے، ٹھہرتے ہیں، اور وہی کہتے ہیں میں
لاکھ روپے لکھتا ہوں»

وَلَمَّا مَنَّ فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ مَنْ
بَعْدَكَ لَا يَسْكُنُ يَرْوَنَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْقِرُونَ
يَسْقِرُونَ الْقَيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْقَهُونَ۔ (الانبیاء: ۲)
» اسی کے ملوک ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں
ہیں اور جو اس کے پاس (مغرب) ہیں۔ وہ اس کی بندگی سے
سر باز نہیں کرتے۔ نکلے نہیں، شب و روز اس کا تسبیح میں
لگے رہتے ہیں اور سستی نہیں کرتے»

لَا يَعْصُونَ أَمْرًا مَّا أَمَرَهُمْ وَيَعْصُونَ مَّا
يُؤْمَرُونَ۔ (الحج: ۱)

» کہیں اس حکم کی نفی دیتی نہیں کہتے جو خدا
نے ان کو دیا ہے، اور وہی کہتے ہیں اس کا انہیں حکم دیا جاتا
ہے»

اس قصہ نے شرک کے بے کوئی ثبوت باقی نہ رکھی۔ کیونکہ
جن پر خدا کی کا لگان کیا جا سکتا تھا وہ سب ہماری طرح عاجز و
ورماندہ بندے ثابت ہو گئے۔ اس کے بعد ہماری عبادتوں، ہماری
نیاز مند یوں، ہماری استعانتوں اور ہمارے اعتماد و توکل کا سرچ
بجز خدا کی ذات کے اور کون جو سکتا ہے؟
انسان اور فرشتوں کی انسانی حیثیت

پھر یہی نہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر قرآن مجید نے انسان اور
ملائکہ کی انسانی حیثیت بھی بتادی ہے تاکہ انسان ان کے مقابلہ میں
اپنے مرتبے کو اچھی طرح سمجھ لے۔ کلام الہی میں جہاں تخلیق آدم کا

ذکر کیا گیا ہے وہاں اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا تو ملائکہ کو ان کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا اور بجز ابلیس کے اور سب نے ان کو سجدہ کیا (بقرہ۔ ۳۔ اعراف۔ ۲۰۔ بنی اسرائیل۔ ۷۰۔ کہف۔ ۷۰۔ طہ۔ ۷۰۔ ص۔ ۸۰)۔ ملائکہ نے اپنی تسبیح و تقدیس کی بنا پر آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنی فضیلت کا دعویٰ کیا تو حق تعالیٰ نے ان کے اسٹی دعویٰ کو رد فرما دیا اور امتحان لے کر ثابت کر دیا کہ ہم نے آدم کو تم سے زیادہ علم بخشا ہے۔ ابلیس نے اپنے ملائکہ خلیق کو بتائے فضیلت قرار دے کر آدم کی بزرگی تسلیم کرنے اور ان کے آگے سر جھکوانے سے انکار کیا تو اسے ہمیشہ کے لیے سائنۂ جہنم کر دیا گیا۔ یہ چیز ایک طرف انسان میں عزت نفس کا احساس پیدا کرتی ہے، اور دوسری طرف اس کے تمام جذبات عبودیت کو خدا پرستی کے مرکز پر سمیٹ لاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام وجود میں کوئی شے بجز حق تعالیٰ کے انسان سے افضل نہیں ہے۔ ملائکہ اگرچہ عِلَّٰہُ فَلَکَہُم مَّوَدَّہٌ ہیں اور تمام دوسری اشیاء پر فضیلت رکھتے ہیں، مگر انسان کے آگے وہ بھی سر جھکوا دھوپکے ہیں۔ پھر انسان کا مسجود، اس کا معبود، اس کا مستعان و مجیب الدعوات، حضرت حق کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟

اس طرح ایمان بالملائکہ کے صحیح علم و معرفت پر قائم ہو جانے سے ایمان باللہ بالکل خالص اور منزہ ہو جاتا ہے۔

ایمان بالملائکہ کا دوسرا مقصد

ملائکہ کی دوسری حیثیت جو قرآن مجید میں بتائی گئی ہے، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی کے ذریعہ سے اپنے پیغمبروں کے پاس اپنا کلام

اور اپنے احکام بھیجتا ہے، اور انہی کے ذریعے سے اس امر کا اہتمام فرماتا ہے کہ انبیاء طہیم السلام کو یہ پیغام ہر آمیزش، ہر التجاس، ہر اشتباہ اور ہر غارتگی و غل اندازی سے پاک رہ کر پہنچ جائے۔ یہ فرشتے اول تو پہلے خود قرآن بردار اور ایک خلعت ہیں۔ ہر قسم کے بُرے رجحانات اور نفسانی اغراض سے معزوم ہیں۔ اللہ سے ڈرنے والے اور اس کے حکم کی بے چوں و چرا اطاعت کرنے والے ہیں۔ اسی لئے جو پیغام ان کے ذریعے بھیجا جاتا ہے اس میں کسی قبہم کی کمی و بیشی وہ اپنی طرف سے نہیں کرتے اور نہیں کھینچ سکتے۔ دوسرے وہ اس قدر طاقتور ہیں کہ ان کی پیغام رسانی اور نگرانی میں کوئی شیطانی قوت ذرہ برابر بھی دخل نہیں ڈال سکتی۔ یہ مضمون قرآن مجید میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔

إِنَّا سَخَّطْنَا لَكَ فِي هَذِهِ مَسْئِلَةً وَمَا كَانَ لَنَا بِكَ قُوَّةٌ وَظَنَّكَ رُوحُ الْقُدُسِ مِنَّا مَكْرًا مُّبِينًا

مَسْئِلَةً كَيْتَابٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ (یس)

”وہ ایسے معزز اور بلند پایہ اور پاک مہمان میں مستند ہے جو بڑے ذی عزت اور پاک کاموں کے داعیوں کے لئے ہے۔“

إِنَّمَا يَقُولُ سَاسُؤْلُكَ رِيحٌ قَوْوَةٌ مِّنَ الْعَرْشِ ذِي الْكَرْسِيِّ طَاعِ طَعْرًا مِّنَ (الحجر)

”یہ ایک ذی کبریتہ کا یہاں سے جو ذی قوت طاقت ہے، صاحب عرش کے پاس ذی عزت و کبریتہ طاع ہے۔ اور وہاں کا صیبر ہے۔“

طَاعَ الْعَرْشِ فَلَا يُطَاعُ عَلَىٰ شَيْءٍ إِلَّا مَنَ أَمَرَ تَعَالَىٰ مَن تَسْأَلُ فَإِنَّمَا يَسْأَلُكَ مَن تَدِينُ

يَذَرِيهِمْ وَ مِنْ خَلْقِهِمْ مَنْ يَعْلَمُ اَنْ قَدْ
اَبْلَغُوا مِنْ سُلَيْبٍ سَأَلْتَهُمْ وَ اَخَاطُ بِمَا لَدَيْهِمْ
وَ اَخْصِي حَقْلَ شَيْءٍ عِنْدَا۔

(الجن۔ ۲)

”وہ (اللہ) جیب کا ہاتھ نکالتے والا ہے اور وہ اپنے جیب
پر کسی کو مطلع نہیں کرتا بجز اس رسول کے جس کو اس نے
پسند کیا ہو، پھر وہ اس کے گود میں نگران فرشتے رکھ دیتا
ہے تاکہ یہ اطمینان کرے کہ پیغام پہنچانے والوں نے اپنے
رب کے پرمات ٹھیک ٹھیک پہنچا دیئے اور اللہ تعالیٰ ان
کے اوپر محیط ہے اور ہر چیز کا شہاد کرتا ہے۔“

قُلْ اِنَّ مَوْحِ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ۔

(الزلزلہ۔ ۱۱)

”اے نبی اللہ کی (پاکیزگی کی نوح) نے میرے رب
کی طرف سے ٹھیک ٹھیک نازل کیا ہے۔“

اِنَّمَا تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ الْغَلِيْبِ
الزُّوْمِ الْاَوَّلِ۔ (الاحزاب۔ ۱)

”بے شک یہ رب العالمین کی نازل کردہ کتاب ہے۔“

چھپے کر رہتا اولین (مات دار نوح) آتا ہے۔“

اِنَّمَا نُفَخُّكَ اَنْ تَكُوْنُ فِيْ كِتَابٍ مَّكْنُوْنٍ
يَسْمَعُ اِلَّا السُّهْرُوْنَ تَنْزِيْلُ مَنْ ثَابِتِ

الْغَلِيْبِ۔ (الفتح۔ ۲)

”بالیقین یہ معزز قرآن ہے، ایک پوشیدہ نوشتہ میں
لکھا ہوا، اس کو پاک (فرشتوں) کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا،

نابل کیا ہو اور سب انسانوں کی طرف سے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان بالاسلام صرف ایمان باللہ ہی کے لئے نہیں بلکہ ایمان بالکتاب اور ایمان بالرسول کے لئے بھی ضروری ہے۔ ملائکہ پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُس خدیسے کو قابلِ اعتماد تسلیم کریں جس سے خدا کا پیغام اُس کے رسولوں تک پہنچا ہے اُس پیغام پر اور اس کے پیش کرنے والے رسولوں پر ہمارا اعتماد مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اُس درمیانی واسطے پر بھی ہم پوری طرح اعتماد نہ کریں جو خدا اور اس کے رسولوں کے مابین کام کرتا رہا ہے تیسرا مقصد

اس کے علاوہ ملائکہ کی ایک اور حیثیت بھی قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی سلطنت کے کارکن ہیں۔ ساری کائنات کا انتظام اپنے جن ملازموں سے اللہ تعالیٰ کرا رہا ہے وہ ملائکہ ہی ہیں اللہ کی سلطنت میں ان کا مقام گویا وہ ہے جو دنیا کی حکومتوں میں ان کی ملازمتوں (Services) کا ہوتا ہے انہی کے ذریعے سے وہ کسی پر عذاب نازل کرتا ہے اور کسی پر رحمت۔ کسی کی توبہ قبض کرتا ہے اور کسی کو زندگی بخشتا ہے۔ کسی جگہ بارش برساتا ہے اور کہیں قحط ڈھوادیتا ہے۔ وہ ہر انسان کے اعمال، اقوال اور خیالات تک کا پتلا رکھتا رہتا ہے اور ایک ایک جنبش کی نگرانی کر رہے ہیں۔ آخری جب تک خدا کی دی ہوئی مہلت کے اندر کام کر رہا ہے، یہ تمام کارکن اس کی ساری بُری بھلی باتوں سے واقف ہونے کے باوجود، امرِ اچھی کے تحت اس کے ساتھ تعاون کرتے رہتے ہیں اور اس کے سارے کام بنانے چلے جاتے ہیں۔ مگر جو شخص کہ اس کی مہلتِ عمل ختم ہوئی، پھر وہ

علوم اس کو گرفتار کر لیتے ہیں جو ایک لمحہ پہلے تک اس کی خلافت کا
 کارخانہ چلا رہے تھے۔ وہی ہوا جس کے بل پر آدمی جی رہا تھا،
 یکایک اس کی بستیوں کو اکٹ کرتی ہے۔ وہی پانی جس کا سینہ
 آدمی چیرتا پھر رہا تھا، اپنا ایک اسے طوق کر دیتا ہے۔
 وہی زمین جس پر آدمی ماں کی گود جیسے اطمینان کے ساتھ بس رہا تھا،
 یک لخت ایک جھٹکے میں اسے بیوند خاک کر دیتی ہے۔ ایک حکم
 کی دیر ہے، اور اس کے آتے ہی خلیفہ صاحب کا قریب ترین
 اہل ان کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دیتا ہے۔ یہ نقشہ قرآن مجید
 میں جگہ جگہ بڑی تفصیل کے ساتھ کھینچا گیا ہے۔

اس لحاظ سے ایمان بالملک، ایمان باللہ کا ایک لازمی حصہ ہے۔
 اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی سلطان کائنات کے ساتھ ساتھ اسکی
 عبادتوں کو بھی تسلیم کرے۔ اس کے بغیر اس سلطنت میں آدمی
 نہ اپنی پوزیشن صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے اور نہ اس پوزیشن کا پتہ
 شعور رکھتے ہوئے کام کر سکتا ہے۔

ایمان بالرسول

حقیقت رسالت

توحید کے بعد اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ "رسالت" ہے جس طرح اعتقاد کی جہت میں توحید اصل دین ہے اسی طرح اقبال کی جہت میں رسالت اصل دین ہے۔ رسالت کے لغوی معنی پیامبری کے ہیں۔ جو شخص کسی کا پیغام کسی دوسرے شخص کے پاس پہنچائے وہ "رسول" ہے۔ مگر اسلام کی اصطلاح میں رسول اس کو کہتے ہیں جو خدا کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچائے، اور خدا کے حکم سے راہِ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرے۔ اسی لئے قرآن میں رسول کے لئے "ہادی" کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے، یعنی وہ جو سیدھا راستہ دکھائے۔

خدا نے ایک رہبر تو انسان کے اپنے نفس میں مقرر کر رکھا ہے جو الہام الہی کی بنا پر اپنے اور دوسرے خیالات، غلط اور صحیح اعمال کے درمیان تمیز کر کے انسان کو فکر و عمل کا سیدھا راستہ دکھاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: **وَالنَّفْسُ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا** (الشمس)۔ لیکن چونکہ اس رہنمائی ہدایت واضح نہیں ہے، اور اس کے ساتھ بہت سی ذہنی اور خاموشی قوتیں ایسی بھی لگی ہوئی ہیں جو انسان کو دوسرے اعمال کی طرف کھینچتی رہتی ہیں، اور ان وجہ سے تنہا اس جہلی رہنمائی کی ہدایت بے شمار ٹیڑھے راستوں میں سے حق کی سیدھی راہ نکال لینے

اور اس پر بے خطر چلنے میں انسان کے لئے کافی نہیں ہو سکتی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے غارت سے اس کی کوٹھڑا کیا اور انسان کی طرف اپنے پیغامبر بھیجے تاکہ وہ علم و معرفت کی روشنی سے اس باطنی تاریکی امداد کریں، اور اُس مبہم خطری الہام کو آیات و بینات کے ذریعہ سے واضح کر دیں جس کی روشنی جہالتوں اور گمراہ کن قوتوں کے بھرم میں مذہم پڑ جاتی ہے۔

یہی منصب رسالت کی اصل ہے جو لوگ اس منصب پر سرفراز کیے گئے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک غیر معمولی علم اور نور بصیرت عطا کیا گیا ہے جس سے وہ ظن و تخمین کی بنا پر نہیں بلکہ علم یقین کی بنا پر ان امور کی حقیقت جان گئے ہیں جن میں عام انسان اختلاف کرتے ہیں اور اس نور بصیرت سے انہوں نے شرعے راستوں میں سے حق کا سیدھا اور صاف راستہ دیکھ لیا ہے۔

رَسُول اور عام رہنماؤں کا فرق

خارجی رہنما کی ضرورت ہر زمانہ میں انسان نے تسلیم کی ہے۔ کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ انسان کے لئے علم، اس کے اپنے باطنی رہنما کی ہدایت کافی ہے۔ آباؤ اجداد، خاندان، ادرقیطے اور قوم کے بزرگ، اساتذہ، اہل علم، مذہبی پیشوا، سیاسی لیڈر، اجتماعی مسلمین اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کو جن کی دانشمندی پر جروسہ کیا جاسکتا تھا، ہمیشہ رہنما کا منصب دیا گیا ہے اور ان کی تقلید کی گئی ہے۔ لیکن جو چیز ایک رَسُول کو ان دوسری قسم کے رہنماؤں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ علم ہے۔ دوسرے رہنماؤں کے پاس علم نہیں ہے۔ وہ محض ظن و تخمین کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہیں اور اس رائے میں بھائے نفس کے عناصر بھی شامل ہو جاتے

ہیں۔ اس لیے جو عقائد و قوانین وہ وضع کرتے ہیں ان کے اعداد
حق اور باطل دونوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ پھر پھر حق ان کے
قائم کیے ہوئے طریقوں میں نہیں ہوتا۔ اسی حقیقت پر قرآن مجید
بار بار متنبہ کرتا ہے۔

إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ۔

(الجم۔ ۱)

”و میں چیز کی پیروی کرتے ہیں وہ ہمارے خواہشات
فہم کے اور کچھ نہیں ہے۔“

وَمَا الظُّنُّ بِحُكْمٍ وَلَا بِإِلْمٍ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ
وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يَصْلِحُ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔ (الجم۔ ۲)

”اور ان کے پاس حقیقت کا کوئی علم نہیں ہے۔ وہ صرف
گمان کی پیروی کرتے ہیں اور گمان کمال ہے کہ وہ حق کی ضرورت
کو کچھ بھی نہیں کرتا۔“

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهْوَاءَ ضُلُّهُمْ فَلَا يَصِفُوا۔

(الجم۔ ۳)

”مگر ظالموں نے اپنی خواہشات فہم کی پیروی کی پھر ان کے
کہ ان کے پاس کوئی علم ہو۔“

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَاهِدُ فِي اللَّهِ وَيُنَافِیْهِمْ وَلَا
يُحِیْ وَلَا يَمُوتُ مَبْغُضًا وَلَا مُبْغُضًا لِّیُخْلِفَ عَنْ سَبِيلِ
اللَّهِ۔ (الجم۔ ۴)

”اور لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو اللہ کے ساتھ لڑے
موتے ہوئے نہ ہو۔ اللہ کے واسطے ہی لڑے کہ جس کی جگہ وہ لڑے
میرے جگہ۔ یہ لڑاؤ اللہ کے ساتھ ہے بھلا ہے۔“

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ اتَّبَعَ هَوَاهُ بَعْدَ إِهْدَانِي قَوْمًا
 اللَّهُمَّ (الحسن-۵)

”اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جس نے اللہ کی طرف

سے آئی ہوئی ہدایت کے پھارے اپنی خواہش کا اتباع کیا؟

بجلاف اس کے رُخسول کو اللہ کی طرف سے ”علم“ عطا کیا جاتا ہے۔ اس کی رہنمائی گمان اور حواسِ نفس کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ وہ خدا کے بخشے ہوئے نورِ علم سے جس سیدھے رستے کو صاف اور واضح دیکھتا ہے اسی کی طرف ہدایت کرتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں جہاں کہیں انبیاء علیہم السلام کو ”رسالت“ کے منصب پر سرفراز کرنے کا ذکر آتا ہے وہیں یہی کہا جاتا ہے کہ ان کو ”علم“ بخشا گیا۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ سے نبوت کا اعلان اس طرح کرایا جاتا ہے:-

يَا اِبْرٰهِيْمُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ اِمٰمًا عَلٰى الْعٰلَمِيْنَ
 يَا اِبْرٰهِيْمُ اٰتَيْنٰكَ الْوَحْيَ اٰتٰىكَ جِسْرًا عَلٰى سَوِيٍّ

(مریم-۳)

”اے ابراہیم! ہم نے تجھ کو میرے پاس سے ”علم“ عطا کیا ہے۔“

میرے پاس نہیں آیا، لہذا تو میری طرف سے نہیں تجھے سیدھے راستہ

پر چلاؤں گا۔“

نورِ تعلیمِ اسلام کو نبوت بخشنے کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے:-

وَلَوْ هَآءِ اَنْتُمْ اَخْلٰتُمْ حٰكِمًا وَّجَلِيْلًا (النہار-۵)

”اے لوگو! اگر تم نے قوتِ اہلِ اہلِ علم نہ ملتا۔“

حضرت موسیٰؑ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:-

وَلَمَّا يَلْمُؤْ اَشَدُّكَ وَاَسْتَوٰى اَنْتُمْ اَخْلٰتُمْ حٰكِمًا

وَجَلِيْلًا (الحسن-۲)

”اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو بیٹھا اور پورا آدمی بن گیا
تو ہم نے اسے نبوت فیصلہ اور علم عطا کیا۔“
داؤد و سلیمان علیہما السلام کے نبوت پر سرفراز ہونے کا ذکر
بھی اسی طرح کیا جاتا ہے۔

وَكَلَّأْنَا دَاوُدَ وَصُلَيْمَانَ حُكْمًا وَعِلْمًا۔ (الانبیاء: ۵۸)

”ان میں سے ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم عطا کیا۔“
نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جاتا ہے۔
وَلَقَدْ رَاسِدْنَ اثْنَيْتَيْ أَفْهُوَ أَفْهَمُ تَعْنَى الْوَيْ جَاءَتْكَ
وَمِنَ الْجُلُودِ الْكَافَّةِ مِنَ اللَّهِ وَمِنَ الْقُلُوبِ وَلَا تُبْصِرُ۔
(البقرہ: ۱۲۹)

”اور اگر تم نے اس حکم کے بعد جو تمہارے پاس آتا ہے
کی طور پر بات کی پیروی کی تو اللہ سے تم کو بھانسنے والا کوئی ماہی
و مسدود نہ ہوگا۔“

منصب رسالت، اور عام رہنماؤں کے مقابلہ میں رسول کے
امتیازی مقام کی توضیح کے بعد اب ہمیں اُن اصولی امور کف
طرف توجہ کرنی چاہیے جو رسالت کے بارے میں قرآن مجید نے
پیش کیے ہیں۔

ایمان پائند اور ایمان بالرسول کا تعلق

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جب رسول کے پاس حکم کا ایسا
ذریعہ ہے جو لوگوں کو حاصل نہیں ہے، اور خدا کی طرف سے اس کو
بصیرت کا وہ نور عطا کیا گیا ہے جس سے عام انسان محروم ہے، تو
خدا کے بارے میں بہت سی اعتماد صحیح ہو سکتا ہے جو رسول نے
پیش کیا ہے۔ اگر کوئی شخص خود اپنے غورو فکر یا دوسرے عقائد و

سکھار کی تعلیمات پر کوئی اعتماد قائم کرے تو نہ صرف خدا کے بارے میں اس کا عقیدہ درست نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ان دوسرے امور اور حقیقت کے بارے میں بھی کوئی ہی واقعیت ہم نہیں پہنچا سکتا جو دین کے بنیادی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں اور عام انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔ پس جملہ ایمانیات اور معتقدات کی صحت کا کلی انحصار ایمان بالقرآن پر ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ہم اس واسطے سے قطع تعلق کر کے علم صحیح سے دامن فکر کو وابستہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ ایمان بالقرآن پر زور دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

وَكَلَّمَ بَنِي إِسْرَءِيلَ فَقَالَ أُولَئِكَ خَلَقْتُكُمْ وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَعَالَى ۖ الَّذِي يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (الحلقہ - ۲)

”اور کئی ہی بستیوں پر آسمانوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے علم سے سربللی کی تو بہتے ان سے سخت سزا دیا اور انہیں بڑی بڑی سزا دی۔ میں نے انہوں نے اپنے لیے کام کیا جگہ کیا اور انکار ان کا انجام تباہی رہا۔“

إِنَّ الدِّينَ يُكْمَلُ بِاللَّهِ وَاللَّهُ يَمُنُّ بِاللَّهِ وَنُفُسُ الْكَافِرِينَ هُمْ أُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ خَقًا وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا، وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاللَّهُ يَمُنُّ بِاللَّهِ وَنُفُسُ الْكَافِرِينَ هُمْ أُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ خَقًا

أُولَٰئِكَ سَوِّتَ لِقَوْمِهِمْ أَجْتَوَاهُمْ وَقَعَدَ اللَّهُ
عَلَيْهِمْ أَلْحِقَ الْفِتْنَةَ (النساء: ۸۱)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے ٹکر کرتے ہیں اور
اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق کھینچتے ہیں اللہ کہنے والی کہ تم
بعض کو بائیں لے گا اور بعض سے الگ کر دیں گے اور چاہتے ہیں
کہ اس کے درمیان کی کوئی راہ نکالیں، وہ یقیناً کافر ہیں۔ اور
کافروں کے لیے ہم نے ایک سوائے خواب جہنم کا ہے اور
جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر اور ان میں
سے کسی کے درمیان انہوں نے تفریق نہ کی ان کو مقرب اللہ
ان کے اور عطا فرمائے گا اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے
والا ہے۔

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ
لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُسْلِمِينَ
فُوًّا مَّا تَوَلَّىٰ وَتُصْلَبُ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا
(النساء: ۸۲)

* اور جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول سے
جھگڑ کرے اور ایمان لانے والوں کے راستے کو چھوڑ کر کسی
اور راستے پر پھلے اس کو ہم اسی راستے پر پھیر دیں گے جس پر وہ
خود پھیر گیا ہے اور ان کو لٹا کر اسے جہنم میں بھونک دیں گے اور
جہنم ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

یہ اور ایسی ہی سینکڑوں آیات ہیں جن میں صاف صاف
کہا گیا ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا تعلق ناقابل انتطاع
ہے۔ جو شخص خدا کے رسولوں کا انکار کرتا ہے۔ اور ان کی تعلیم کو

قبول نہیں کرتا، وہ چاہے خدا کو ماننے یا نہ مانے دونوں حالتوں میں اس کی گمراہی یکساں ہے، کیونکہ خدا کے بارے میں جو اعتقاد علم کے بغیر قائم کیا جائے گا وہ ہرگز صحیح نہ ہوگا، خواہ وہ عقیدہ تو حید ہی کیوں نہ ہو۔

وحدتِ کلمہ

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ صرف ایمان بالمرسل ہی وہ چیز ہے جو بنی نوع انسان کو ایک عقیدہ پر جمع کر سکتی ہے۔ اختلاف کی بنا واصل جہالت ہے۔ لوگ جس چیز کی حقیقت سے واقف نہ ہوں گے اس کے متعلق گمان کی بنا پر قیاس آرائیاں کریں گے اور لامحالہ ان کے درمیان اختلاف پائے ہوگا کیوں کہ گمان اور قیاس کی مدد سے رائے قائم کرنا اسکل ایسا ہی ہے جیسے اندھیرے میں ٹٹولنا۔

جہاں روشنی نہ ہوگی وہاں پیماس آدمی ایک چیز کو ٹٹول کر پیماس مختلف رائیں ظاہر کریں گے۔ مگر روشنی آنے کے بعد کوئی اختلاف باقی نہ رہے گا اور سب آنکھوں والے ایک ہی نتیجہ پر پہنچ سکیں گے۔ پس جب انبیاء علیہم السلام کو "علم" کی نعمت اور بصیرت کے نور سے بہرہ ور کیا گیا ہے تو ممکن نہیں ہے کہ ان کی آراء میں اختلاف ہو، ان کی تعلیمات میں اختلاف ہو یا ان کے طریقوں میں اختلاف ہو۔ اس لئے قرآن مجید کہتا ہے کہ تمام انبیاء ایک ہی گروہ ہیں، سب کی تعلیم ایک ہے، سب کا دین ایک ہے، سب ایک ہی صراطِ مستقیم کی طرف بلانے والے ہیں اور مومن کہے گئے سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جو شخص انبیاء میں سے کسی ایک نبی کی بھی تکذیب کرے گا وہ گویا تمام انبیاء کی تکذیب کا مجرم ہوگا اور

اس کے دل میں ایمان باقی نہ رہے گا۔ کیوں کہ جس تعلیم کو وہ جملہ زما
ہے وہ محض اس ایک نبی کی تعلیم نہیں ہے بلکہ بجنسہ وہی تعلیم تمام
انبیاء کی ہے۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُّوَا مِن طَيِّبَاتِ مَا أُسْلُوا صَالِحًا
إِلَىٰ بِمَا تَسْأَلُونَ عَلَيْهِ فَإِنَّ هَذِهِ أَتَمَّتْكُمْ أَمَدًا
وَأَجَدَةً فَإِنَّا هُنَا نَقُوتُ قَاتِلُكُمْ فَتَقَطُّعُوا أَمْرَهُمْ
بَيْنَهُمْ شَرًّا كُلَّ جَزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔
(المؤمن - ۳۰)

(مُحَمَّدؐ کے پیروں سے فرمایا کہ) اے پیغمبرو! پاک چیزوں میں
سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ تم جو کچھ کہتے ہو اسے میں مانا ہوں
اور یقیناً تمہارا گروہ دراصل ایک ہی گروہ ہے اور میں تمہارا رب
ہوں، پس تم مجھ سے ڈرتے رہو۔ مگر بعد میں لوگوں نے آپس
میں اختلاف کر کے اپنے مذہب الگ الگ بنائے، اور اب
حال یہ ہے کہ جس گروہ کے پاس جو چیز ہے اسی پر وہ خوش
ہے۔

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَلِمًا أَزْجَيْنَا إِلَىٰ نَوَاجِدٍ
مِّن نَّبْعِهِ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ
وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ
وَيُوسَىٰ وَهَارُونَ وَسَلْمَانَ وَاتِّمَّازًا ذَاوَدَ وَنُوحًا
وَمَا سَلَّا قَدْ فَصَّلْنَا هُم عَلَىٰكَ مِن كُلِّ فِرْعَوْنٍ
لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَا لَدَا مُوسَىٰ تَكْلِيمًا۔

(النمل - ۱۱۳)

”اے محمدؐ! ہم نے اسی طرح تمہاری طرف وہی بھیجے جیسے

انبیاء کے متعلق قرآن کی یہ تعلیم ہے عکس ہے۔ کسی مذہب میں ایسی تعلیم موجود نہیں ہے۔ یہ صداقت قرآن کی مدشّن دلیل ہے اور نئی نوع انسانی کے لئے اس میں عالمگیر اتفاق اور وحدت کلمہ کا ایک سکون بخش پیغام مضمر ہے۔

اتباع و اطاعت رسول

رسالت کے اعتقاد کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف عقائد اور عبادات میں بلکہ زندگی کے تمام عملی مسائل میں بھی اُس طریقہ کی پیروی کی جائے جس پر خدا کے رسول پہلے ہیں۔ کیونکہ خدا نے جس ”علم“ اور نورِ نبوت سے ان کو بہرہ ور فرمایا تھا اس سے غلط اور صحیح طریقوں کا فرق یقینی طور پر انہیں معلوم ہو جاتا تھا، اس لئے وہ جو کچھ ترک یا اختیار کرتے تھے اور جو کچھ حکم دیتے تھے، وہ سب خدا کی طرف سے تھا۔ غلامِ انسان سا ہر سال بلکہ قرنہا قرن کے تجربات کے بعد بھی غلط اور صحیح کے امتیاز میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوتے۔ اُن جو تھوڑی بہت کامیابی نصیب ہو بھی جاتی ہے تو وہ یقین کامل کی ٹھوس بنیادوں پر قائم نہیں ہوتی، بلکہ اس کی بناء محض قیاس و استقراء پر ہوتی ہے جس میں بہر حال غلطی کا اندیشہ باقی رہتا ہے۔ بخلاف اس کے انبیاء علیہم السلام نے زندگی کے معاملات میں جو طریقے اختیار کیے اور جن پر اپنے کی تعلیم دی وہ ”علم“ کی بناء پر اختیار کیے گئے تھے، اپنے ان میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید بار بار انبیاء کی اطاعت اور ان کے اتباع کا حکم دیتا ہے، ان کے قائم کیے ہوئے طریقے کو شریعت اور مہنات اور صراطِ مستقیم کہتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ تمام دوسرے لوگوں کا اتباع ترک کر کے صرف انبیاء کا اتباع کرو اور انہی کے طریقے پر چلو، کیونکہ ان کی اطاعت میں

خدا کی اطاعت ہے، اور ان کا اتباع میں مرضیات الہی کا اجماع۔
 وَمَا آتَيْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِمَا ذُرِّ
 انعام۔ (المائدہ)

”اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی نے یہ بھیجا ہے کہ حکم
 خدا اس کی اطاعت کی جائے۔“

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ۔ (انعام)
 ”میں نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔“
 قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ
 اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔
 قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ
 لَا يُهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ۔ (آل عمران۔ ۲)

”اے خدا! کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا
 اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخشتے گا۔“
 اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ یہ دعا ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت
 کو ہم اگر وہ دعا مانگی کریں تو یقین رکھو کہ اللہ کافروں کو ہدایت
 نہیں کرتا۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ
 وَلَا تَوَلَّوْا عَصَاً وَأَنْتُمْ تَسْتَعِينُونَ وَلَا تَكُونُوا
 كَالَّذِينَ قَالُوا سُبْحَانَ وَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ۔ إِنَّ شَرَّ
 الدِّينِ أَنْتَ عِنْدَ اللَّهِ الظُّمُورُ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا
 يَعْقِلُونَ۔ (الاحزاب۔ ۳)

”اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت
 کرو اور اس سے ہرگز نہ گھٹنا دو کہ وہ جبکہ تم اس کا حکم سن چکے

ہو۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ
حاکم وہ ہے جو اپنے حق کے نزدیک بدتر ہے جولوہ وہ جسے لوگ
میں جو کچھ نہیں سمجھتے۔

وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِأَنَّهُ مُوَدَّعٌ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ
وَمِنْ سُوْلَةٍ أَمْرًا أَن يَكُوْنُوا لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ
وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا
(الاحزاب: ۵)

”اے نبی! میں تم پر اور تمہاری امت کے لیے دوست نہیں ہے کہ
جب بھی تمہارا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول کریم سے تو ان کے لیے
اپنے محلے میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے۔ اور میں
نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی وہ صریح گواہی میں ہے کہ
فَإِنْ لَّمْ يَتَّبِعُوا لَكَ فَأَعْلَمُوا أَنَّمَا يُتَّبِعُونَ
أَهْوَاءَهُمْ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ
هُدًى مِّنَ اللَّهِ۔ (النساء: ۵)

”پھر اگر وہ بدتر راستہ لیں تو ہمارے کہ وہ نفس اپنی
خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اس شخص سے زیادہ گمراہ
کون ہوگا جس نے خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کی پیروی
کئے۔“

ایسی اور بیسیوں آیات ہیں جن میں اتباع و اطاعت رسول پر
نہر دیا گیا ہے۔ پھر سورۃ احزاب میں اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے
کہ رسول اللہ کی زندگی ان لوگوں کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ ہے جو
اللہ سے بخشش کی اور یوم آخر میں کامیابی کی امید رکھتے ہیں۔ لَقَدْ
كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ

وَالْيَوْمَ لَا يَخْزَىٰ كُزَامُهَا كَثُفًا. (مکتبہ ۳)

عقیدہ رسالت کی اہمیت

اطاعت و اتباع کے ان احکام کے ساتھ رسالت کا عقیدہ قدر حقیقت اس تہذیب کی ہمارے اس کی روح حیات اور قوت بقا، اور اس کے امتیازی عناصر کی بنائے اصلی ہے جسے اسلام نے قائم کیا ہے۔

ہر تہذیب اور نظام تمدن میں تین چیزیں اساس کا حکم رکھتی ہیں، ایک طریق فکر، دوسرے اصول اخلاق اور تیسرے قوانین ملکی دنیا کی تمام تہذیبوں میں یہ تینوں چیزیں تین مختلف ذرائع سے آتی ہیں۔ طریق فکر ان مفکرین اور اہل حکمت کی تعلیمات سے بخود ہوتا ہے جنہوں نے کسی نہ کسی وجہ سے نئے نئے انسانی گروہوں کی ذہنیت پر قابو پایا ہے۔ اصول اخلاق ان رہنماؤں، مصلحوں، اور پیشواؤں سے لئے جاتے ہیں جن کو مختلف زمانوں میں خاص خاص قوموں پر اقتدار حاصل ہوا ہے۔ اور قوانین ملکی کے وضع کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی مہارت پر زندگی کے مختلف شعبوں میں اعتماد کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے جو نظام تمدن قائم ہوتا ہے۔ اس میں لازمی طور پر تین بنیادی خامیاں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ ان تین مختلف ذرائع سے جو عناصر فراہم ہوتے ہیں ان سے ایک ایسی محسوس مرکب تیار ہوتی ہے جس کا مزاج کہیں صدیوں میں جاگہ قائم ہوتا ہے، اور پھر بہت سی بے رہنمائی، بے اعتدالیات اور نامناسبیتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ مفکرین اور اہل حکمت بہت سے ہیں۔ سب کے طریق فکر جدا جدا اور ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں۔ عموماً وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کو کہیں انسانی زندگی کے عملی

مسائل سے کسی قسم کا مس نہیں رہا ہے، بلکہ ان میں سے اکثر اپنی مروج
 بڑائی کے لیے مشہور رہے ہیں۔ اس ماخذ سے الٹی دُنیا اپنا طریق فکر
 حاصل کرتے ہیں۔ دوسرا عنصر جس گروہ سے لیا جاتا ہے۔ اس میں بھی
 انفرادی تجلیات و افکار اور ذہنیاتوں کے اعتبار سے کافی اختلاف پایا
 جاتا ہے، اور اگر اس گروہ میں کوئی بڑے مشترک ہے تو وہ صرف وہ ہے
 کہ اس کے تمام افراد تجلی کی دُنیا میں رہنے والے اور پُر جو شس
 جذباتی لوگ ہوتے ہیں جو ٹھوس عملی مسائل سے بہت ہی کم تعلق
 رکھتے ہیں۔ دبا تیسرا عنصر تو اس کے ماخذ بھی باہم مختلف ہیں اور
 ان میں یہ چیز مشترک ہے کہ جذباتِ لطیف کی ان کے اندر بہت کمی
 ہے، ضرورت سے زیادہ عملیت نے ان کو قسّی الحس اور خشک بنا
 دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے متضاد عناصر میں صبح اور مطلق اختلاف
 قائم ہونا بہت مشکل ہے اور ان کا تضاد اپنا رنگ نمایاں کئے بغیر
 نہیں رہ سکتا۔

۲۔ ان ذرائع سے جو عناصر پرکار حاصل ہوتے ہیں ان میں نہ
 طویل حیات کی قوت ہوتی ہے، نہ توسیع کی استعداد۔ مختلف قوموں
 پر مختلف مفکروں، رجحانوں اور معتقوں کے اثرات پڑتے ہیں اور
 ان کی وجہ سے ان کے طریقہ رائے فکر، اصول اخلاق اور قوانین مدنی
 میں اصولی اختلافات واقع ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک قوم پر بھی تمام
 زمانوں میں انہی خصوصیات منکروں رجحانوں اور معتقوں کا اثر قائم نہیں رہتا
 جنہوں نے ابتدا میں اس پر اثر ڈالا تھا، بلکہ اختلاف زمانہ کے ساتھ یہ
 مؤثر اور ان کے اثرات بدلتے رہتے ہیں۔ اس طرح جہنم میں ایک
 طرف تو قومی بن جاتی ہیں، اور ان کے اختلاف سے قومیتوں کا وہ اختلاف
 برآگیزہ ہوتا ہے جو دراصل زمین اس کو پھونک دینے والی بجلی کا رجولی

ہے۔ دوسری طرف ہر قوم میں بھی بھائے خود تہذیب و تمدن کا نظام
 دائماً ایک ہیسانی کیفیت میں رہتا ہے اور اس میں ایک خط مستقیم پر
 نشوونما ہونے کے بجائے ہمیشہ اسی تفرقات واقع ہوتے رہتے
 ہیں جن کا میلان کبھی ارتقاء کی جانب ہوتا ہے اور کبھی انقلاب کی
 جانب۔

جو عناصر غلطی کے ان مہادی میں سے کسی میں بھی تقدس کا شائبہ
 نہیں ہوتا۔ قوم اپنے مفکرین سے جو طریق فکر، رہنماؤں سے جو اصول
 اخلاق اور واضعین قانون سے جو قوانین منی لیتی ہے وہ سب انسانی
 اجتہاد کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور ان کے نتیجہ اجتہاد انسانی ہونے کا
 خود ان کے متبعین کو بھی احساس رہتا ہے۔ اس کا لازمی اثر ہے
 کہ اجتماع کبھی کامل نہیں ہوتا۔ متبعین اپنے اجتہادی اجتماع کی حالت میں
 بھی ایمانی کیفیت سے محکف نہیں ہونے پاتے۔ وہ خود یہ سمجھتے ہیں
 کہ ان کی تہذیب کے عناصر اسلئے میں غلطی کا امکان اور اصلاح کی
 ضرورت ہے۔ ہر قرابت میں رفتہ رفتہ ان کی غلطیاں ثابت کرتے رہتے
 ہیں جن سے شک اور تذبذب کی حالت رونما ہو جاتی ہے اس طرح
 کبھی کسی طریق فکر یا اصول قانون کو قوم پر اپنی پوری گرفت قائم
 کرنے اور نظام تمدن کو مستحکم کر دینے کا موقع نہیں ملتا۔

ایمان دار رسول کی بنیاد پر جو تہذیب قائم ہوتی ہے وہ ان تینوں
 خرابیوں سے پاک ہوا کرتی ہے۔

اولاً اس میں تہذیب کے تینوں عناصر ایک ہی مبداء سے آتے
 ہیں۔ ایک ہی شخص طریق فکر بھی مقرر کرتا ہے، اصول اخلاق بھی متعین
 کرتا ہے اور قوانین منی کے اصول بھی وضع کرتا ہے۔ وہ ایک وقت
 دیکھائے فکر، عالم اخلاق اور جہان عمل تینوں کا صدر انجمن ہوتا ہے۔

تینوں کے مسائل پر اس کی نظر یکساں رہتی ہے۔ اس میں ٹکڑا، ہڈیا، لطیف اور حکمت مٹی تینوں کی ایک معتدل آمیزش ہوتی ہے۔ اور ان تینوں عنصروں میں سے ہر ایک کی مناسب مقدار لے کر وہ تہذیب کے مرکب میں اس طرح شامل کر دیتا ہے کہ کسی چیز میں کئی ریش نہیں ہوتی، اجزاء میں کوئی باہم بے ربطی اور پائنا سہت نہیں پائی جاتی، اور مرکب کا مزاج غایت درجہ معتدل ہوتا ہے۔ یہ امر درحقیقت انسان کی استطاعت سے بالاتر ہے۔ فاطر کائنات کی ہدایت کے بغیر اس کا انجام پانا کس طرح ممکن نہیں۔

ثانیاً اس میں کوئی عنصر قومی یا زمانی نہیں ہوتا۔ خدا کا اصول جو طریق فکر، جو اصول اخلاق اور اصول قانون مقرر کرتا ہے وہ قومی رجحان یا زمانی خصوصیات پر نہیں بلکہ صداقت اور حق پر مبنی ہوتے ہیں اور حق و صداقت وہ شے ہے جو مشرق اور مغرب، سیاہ اور سفید، سامی اور آفریں، قدیم اور جدید کے جملہ فرقوں سے بالاتر ہے۔ جو چیز ہستی اور برحق ہے وہ دنیا کے ہر گوشے، دنیا کی ہر قوم، اور وقت و زمانہ کی ہر گردش میں یکساں ہے اور برحق ہے۔ آفتاب جاپان میں بھی آفتاب ہے اور جبل الطارق میں بھی۔ ہزار برس پہلے بھی آفتاب تھا اور ہزار برس بعد بھی آفتاب ہی رہے گا۔ پس اگر کوئی تہذیب عالمگیر، بشری اور دائمی تہذیب بن سکتی ہے تو وہ اصولی خدا کی قائم کی ہوئی تہذیب ہی ہے، اور اسی میں یہ قابلیت موجود ہے کہ اپنے اصول و اساس کو بدلے بغیر ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے کے مناسب حال ہو سکتی ہے۔

ثالثاً یہ تہذیب پوری تقدس کی شان نہیے ہوئے ہے۔ اس کا منبع یہ اعتقاد بلکہ ایمان رکھتا ہے کہ جس نے اس تہذیب کو قائم کیا

ہے وہ خدا کا رسول ہے۔ اس کے پاس خدا کا بکشا ہوا علم ہے، اس کے علم میں شک کا شائبہ تک نہیں۔ (لَا تَأْتِيهِ فِتْنَةٌ)، اس کے ہاتھوں میں نہ علم و تحقیق کو دخل ہے اور نہ ہوائے نفس کو، وہ جو کچھ پیش کرتا ہے خدا کی طرف سے پیش کرتا ہے، اس کے بھٹک جانے اور غلط راستوں پر چلنے کا کوئی امکان نہیں۔ مَا خَلَقْنَا مِنْكُمْ فِتْنًا أُولَئِكَ مِنْكُمْ إِلَّا قَلِيلٌ مِّنْهُمْ هُوَ الَّذِي هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ۔ (آل عمران) یہ یقین و ایمان جب متبع رسول کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے تو وہ پورے ایمانی قلب کے ساتھ رسول کا اتباع کرتا ہے۔ اس کے دل میں کوئی شک اور تذبذب نہیں ہوتا۔ اس کے دل میں یہ اندیشہ کبھی غلبہاں پیدا نہیں کرتا کہ شاید یہ طریقہ صحیح نہ ہو، کوئی اور راستہ برحق یا کم از کم اس سے زیادہ بہتر ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی تہذیب قایت درجہ پائیدار ہوگی۔ اس کا اتباع نہایت مضبوط ہوگا۔ اس میں دشمنی تہذیبوں سے زیادہ ڈھکنا پلایا جائے گا۔ اس کے طریق فکر، اصول اخلاق اور قوانین مدنی میں زیادہ اہتمام ہوگا۔

انبیاء علیہم السلام اسی تہذیب کے موافق تھے۔ صدیوں تک وہ دنیا کے ہر غلطے میں اس کے لیے زمین تیار کرتے رہے۔ اور جب تک زمین پختہ نہ ہو جاتی تھی تو محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اگر اس کی عمارت مکمل کر دی۔

رسالت محمدیؐ کے امتیازی خصائص

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ رسالت کے عام احکام سے متعلق تھا۔ مگر ان کے علاوہ چند امور ایسے بھی ہیں جو خاص طور پر رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ بلاشبہ نفس

منصب رسالت کے لحاظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء میں کوئی فرق نہیں ہے، اور قرآن مجید کا صریح فیصلہ ہے کہ رسولوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق جائز نہیں۔ لَا تَفَرِّقُوا بَيْنَ آخِيهِمْ (سورۃ مائدہ ۲۰) پس جہاں تک اصول کا تعلق ہے، تمام انبیاء اس میں مشترک ہیں کہ سب کے سب اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں سب کو ”مسلم“ اور ”علم“ عطا کیا گیا ہے، سب ایک ہی طرابط مستقیم کھے طرف لانے والے ہیں، سب نئی لوہے انسان کے ہادی و رہنما ہیں سب کی اطاعت فرض اور سب کی سیرت بنی آدم کے لئے نمونہ عقیدہ ہے۔ لیکن عملاً اللہ تعالیٰ نے چند امور میں نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں ایک خاص امتیاز عطا فرمایا ہے۔ اور یہ امتیاز محض سنی نہیں ہے کہ اس کو ملحوظ رکھنے کا درکھنے کا کوئی اثر نہ ہو، بلکہ درحقیقت اسلام کے نظام دینی میں اس کو ایک ایسی حیثیت حاصل ہے، اور عملاً اسلام کے تمام معتقدات اور قوانین کی بنیاد رسالت محمدی کی اسی امتیازی حیثیت پر قائم ہے۔ اس لئے رسالت کے متعلق کسی کا وہاں اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس مخصوص امتیازی حیثیت کو ملحوظ رکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہ لائے۔

پہلی نبوتوں اور رسالت محمدی کا فرق

اس مضمون کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے چند امور ذہنی نشین کر لینے ضروری ہیں۔۔۔

۱۔ اشارات قرآنی، روایات، ماثورہ، اور قیاس عقل، تینوں سے بھی مستنبط ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعداد ہزاروں سے تجاوز ہوتی چاہیے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ وَاِنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ خَلَا فِيْهَا

مَنْ يَزِدْ (فالرم) کوئی است کسی نہیں ہوئی ہے جس میں کوئی مختلفہ کرنے والا نہ گنرا ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نوع بشری کی اتنی اچھی دُنیا میں گزر چکی ہیں کہ تاریخ کا علم ان کا احاطہ نہ کر سکا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔ لہذا ہر اُمت کے لئے اگر ایک مَوسَل بھی آیا ہو تو دُستوں کی تعداد ہزاروں سے تجاوز ہوئی چاہئے۔ اسی کی تائید بعض اعدادِ مِث بھی کرتی ہیں۔ جن میں انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار تک بتائی گئی ہے۔ لیکن اس جہِ غفیر میں سے قرآن مجید میں جن انبیاء کے نام بتائے گئے ہیں ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ اگلے ساتھ اگر ہم ان پیشوایانِ اقوام کو بھی شامل کر لیں جن کی نبوت کے متعلق کوئی اشارہ قرآن میں نہیں ہے، تب بھی یہ تعداد دُعا یوں سے متجاوز نہیں ہوتی۔ اس طرح بے شمار انبیاء کا نام و نشان تک مٹ جاتا، اور ان کی تعلیمات کے آثار کا غو ہو جاتا، اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کی بشتِ خاص زمانوں اور خاص خاص قوموں کے لئے ہوئی تھی، اور ان کے پاس کوئی ایسی شے نہ تھی جو ثبات اور دوام بخشنے اور عالمگیر وسعت حاصل کرنے کے قابل ہوئی۔

پھر جن انبیاء اور پیشوایانِ اقوام کے نام ہم کو معلوم بھی ہیں ان کے حالات اور تعلیمات پر افسانوں اور تحریکات کے لئے پڑے پڑے ہوئے ہیں کہ ان کے متعلق ہماری علم کو ہمارے جہل سے کوئی نسبت نہیں۔ ان کے جس قدر آثار اس وقت دُنیا میں موجود ہیں۔ انہیں غنی اُمتوں سے قلع نظر کر کے خاص خاص نکتہ کے معیار پر جانچے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جس پر اتفاق کیا جا سکتا ہو۔ ہم ان کا یہ گمان نہ تک متعین نہیں کر سکتے۔ ہم ان کے صریح ناموں تک سے ناواقف ہیں۔ ہم قطعی طور سے یہ بھی نہیں کہہ

سکتے کہ وہ فی الواقع دُنیا میں موجود بھی تھے یا نہیں۔ بودھ، زردشت، اور مسیح جیسی مشہور ہستیوں کے متعلق بھی مؤرخین نے شک کیا ہے کہ آیا وہ تاریخی ہستیاں ہیں یا غرضی۔ پھر ان کی سیرتوں کے متعلق جو بہ کثرت معلومات سامنے پاس ہیں۔ اتنی جمل اور مبہم ہیں کہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی ان کو نوڈ تعلیم نہیں بتایا جاسکتا۔ اور یہی حال ان کی تعلیمات کا ہے۔ جو کتابیں یا جو تعلیمات ان کی طرف منسوب ہیں ان میں سے کسی کی سند ان تک نہیں پہنچی، اور نہایت قوی شہادتیں اندرونِ اے و بیرونِ اے دونوں قسم کی ایسی موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں بحکرت قرینات ہوئی ہیں۔ یہ امور اس امر کا یقین کرنے کے لیے کافی ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہونے انبیاء اور پیشوا گئے ہیں ان کی رسالت اور پیشوائی ختم ہو چکی ہے۔

جو قریب قریب تمام انبیاء اور پیشواؤں کے متعلق یہ بات ثابت ہے کہ ان کی تعلیم ان مخصوص اقوام کے لیے تھی جن میں سے وہ آئے تھے۔ بعض نے خود اس کی تصریح کی، اور بعض کے متعلق واقعات نے اس کو ثابت کر دیا۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، کنفیوشس، زردشت، اور کرشن کی تعلیم بھی ان کی قوم کے باہر نہیں گئی یہی حال سامی اور آریہ اقوام کے دوسرے نمونوں اور پیشواؤں کا ہے البتہ بودھ اور مسیح کی تعلیم کو ان کے بیرونوں نے دوسری اقوام تک پہنچایا مگر خود انہوں نے بھی نہ اس کی کوشش کی، اور نہ یہ کہا کہ ان کا پیغام تمام عالم کے لیے ہے۔ بلکہ مسیح علیہ السلام سے تو خود انجیل میں یہ قول منقول ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے گئے تھے۔

۴۔ تمام انبیاء اور پیشوا یا ان ام میں تہما محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

جن کی سیرت اور تعلیم کے متعلق ہماری ہاس اس قدر صحیح، مستند اور حقیقی معلومات موجود ہیں کہ ان کی صحت میں شک کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ بلاطوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کی کسی تاریخی شخصیت کے متعلق آج معلومات کا اتنا صحیح اور قائل احتمال ذخیرہ موجود نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی مشکوک اس کی صحت میں شک کرے تو اس کو تمام دنیا کا تاریخی ذخیرہ تدریجاً کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اتنے مستند ذخیرے کی صحت میں شک کرنے کے بعد تو یہ ماننا لازم آتا ہے کہ تاریخ کھنڈراتم جھوٹ کا ایک انبار ہے اور اس کے ایک لفظ پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

۱۔ اسی طرح تمام انبیاء اور پیشواؤں میں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کی سیرت اور زندگی کے حالات پوری تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ نہ صرف پیشوایانِ اہم بلکہ دنیا کی تمام تاریخی شخصیتوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جسکی سیرت اتنی جزئی تفصیلات کے ساتھ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو۔ آنحضرتؐ کے جہد اور جدائی کے ساتھ جہد میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف اتنا ہے کہ اس زمانہ میں آنحضرتؐ اپنی حیاتِ جہانی کے ساتھ موجود تھے، اور اب نہیں ہیں۔ لیکن اگر زندگی کے ساتھ جہانی زندگی کی قید نہ لگائی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ آج بھی زندہ ہیں، اور جب تک دنیا میں آپ کی سیرت موجود ہے اس وقت تک آپ زندہ رہیں گے۔ احادیث اور پیغمبرؐ کی کتابوں میں دنیا آج بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اتنے ہی قریب سے دیکھ سکتی ہے جتنے قریب سے آپ کے جہد کے لوگ دیکھ سکتے تھے۔ پس یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ انبیاء اور پیشوایانِ ادیان میں سے اگر کسی کا صحیح اور مکمل طور پر اہل

کیا جاسکتا ہے تو وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

۶۔ یہی حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا ہے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، انبیاء اور پیشواؤں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی لائی ہوئی کتاب، اور جس کی ہوئی تعلیم آج اپنی صحیح شکل میں موجود ہو، اور قابلِ تہنیت و اعتقاد طریقے سے اپنے لئے ولے اور ہمیشہ کرنے والے کی طرف منسوب کی جاسکتی ہو۔ یہ شرف تہنیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب، قرآن، بیونہ انہی الفاظ کے ساتھ موجود ہے جن الفاظ میں آنحضرت نے اس کو پیش کیا تھا۔ اور قرآن کے علاوہ جو ہدایات آپ نے اپنی راہِ حق پر بیان سے دی تھیں، وہ بھی قریب قریب اپنی صحیح صورت میں آج تک محفوظ ہیں اور اللہ اللہ ہمیشہ محفوظ رہیں گی۔ پس رسولوں اور پیشواؤں میں سے اگر کسی کی تعلیم کا اتباع یعنی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے تو وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

۷۔ پچھلے زمانے کے انبیاء اور پیشواؤں کی تعلیم اور سیرت کے متعلق جو ذخیرہ اس وقت دنیا میں موجود ہے اس سب پر نظر ڈال جائیے۔ اس میں حق اور صداقت، خیر اور صلاح، حسن اخلاق اور حسنِ معاملات کے جتنے پاکیزہ نمونے آپ کو ملیں گے وہ سب کے سب آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کی سیرت میں پائے جاسکتے ہیں اسی طرح آپ کے بعد نوبِ بشری کے جتنے رہنما پیدا ہوئے ہیں ان کی تعلیم اور سیرت میں بھی آپ کو ایسی کوئی چیز نہ ملے گی جو حق اور صدق، نیکی اور بہتری ہو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور سیرت میں موجود نہ ہو۔ پھر آنحضرت کی تعلیم اور سیرت میں آپ کو علم حق، عمل صالح، اور اصولِ خیر کا ایک دافرِ ذخیرہ ایسا بھی ملے گا جو دنیا کے کسی اچھے اور

پچھلے پیشوا کی تعلیم اور سیرت میں نہیں پایا جاتا۔ ان سب پر مزید یہ کہ علم الہی اور اخلاق و معاملات کو نبوی کے متعلق کوئی ایسی صحیح بات انسان سوچ نہیں سکتا جو اسلام سے باہر ہو۔ پس یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور سیرت تمام غیرت کی جامع ہے۔ حتیٰ جو کچھ تقاضا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر کر دیا۔ صراطِ مستقیم جس چیز کا نام تقاضا آپ نے روحِ کبر کے کر کے دکھا دی۔ جملہ انفرادی اور اجتماعی حیثیات سے انسان کے اخلاق اور معاملات کو درست رکھنے اور دنیا میں صحیح طور پر زندگی بسر کرنے کے لئے جتنے اصولی حقائق ہو سکتے تھے وہ سب آپ نے واضح طور پر پیش کر دیئے۔ اب ان پر کسی اضافہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

۸۔ انبیاء اور پیشوایانِ اویان کے پورے گروہ میں جتنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں جنہوں نے دعویٰ کیا کہ ان کی دعوت تمام نفعِ انسانی کے لئے ہے، اور علماء میں بھی ہوا کہ آپ نے اپنی زندگی میں شاہانِ اقوام کو دعوتِ نامے بھیجے اور آپ کی دعوتِ رسولی کے زمین کے ہر گوشے اور جی اہم کی ہر قوم میں پہنچی۔ یہ خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ بعض نے تو نہ مالگیری کا دعویٰ کیا اور نہ ان کو مالگیری نصیب ہوئی۔ اور بعض کے مذاہب کو مالگیری تو نصیب ہوئی، مگر خود انہوں نے نہ اس کا بھی دعویٰ کیا نہ اس کی کوشش کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ایسا اور کوئی نہیں ہے جس نے مالگیری کا دعویٰ ہی کیا ہو، اس کے لئے کوشش ہی کی ہو، اور جسے بالفعل مالگیری نصیب ہی ہوئی ہو۔

۹۔ دنیا میں انبیاء کی آمد کے عین ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی قوم کی ہدایت کے لئے پہلے کوئی نبی نہ آیا ہو اور لائقِ قنوع

ہذا کی بنا پر اس کے لئے ایک نئی یا ایک سے زیادہ انجیل کی ضرورت ہو۔ دوسرے یہ کہ پہلے کوئی نئی آیا تھا، مگر اس کی رسالت کے آثار محو ہو گئے، اس کی تعلیم اور اس کی لائی ہوئی کتاب میں تحریر ہو گئی، اس کی سیرت کے نشانات اس طرح مٹ گئے کہ لوگوں کے لئے اس کی پیروی کرنا اور اس کے اسوہ حسنہ کی تقلید کرنا ممکن نہ رہا۔ تیسرے یہ کہ پہلے نئی یا انجیل کی تعلیم اور ہدایت مکمل نہ ہو اور اس میں مزید اضافہ کی ضرورت ہو۔ ان تین اسباب کے سوا انجیل کی حقیقت کا کوئی اور قضا سبب نہ ہے اور نہ عقلاً ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی قوم کے لئے نئی ایجاد ہو، اس کی تعلیم اور اس کی سیرت اپنی صحیح شکل میں محفوظ ہو، اس میں کسی اضافہ کی ضرورت بھی نہ ہو، اور پھر اسکے بعد کوئی دوسرا نئی ذبح دیا جائے۔ نبوت کا منصب محض ایک شخصیت نہیں ہے کہ وہ کسی حسین عمل کے سلسلے میں بطور انجام دیا جاتا ہو، بلکہ وہ ایک خاص خدمت ہے جس پر ایک مخصوص کام کیلئے ضرورت کسی کو سامور کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہ منصب اتنا چھوٹا اور ادنیٰ درجہ کا بھی نہیں ہے کہ کسی گندے ہوئے نئی کی تعلیم کی طرف محض توجہ دلانے کے لئے اسے قائم کیا جائے۔ اس کام کیلئے علماء حق اور محدثین کی جماعت بالکل کافی ہے۔ میں عقل قطعیست کیساتھ

لے ایک اور قضا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک نئی کے ساتھ اس کی مدد کیلئے دوسرا نئی مبعوث کئے کی ضرورت ہو، جس کی بعض مثالیں قرآن پاک میں ملتی ہیں۔ لیکن جہاں یہ صورت زیر بحث نہیں ہے، کیوں کہ خدا کی کھلی نبوت اسی نبوت کا خیر بخاتی ہے جس کی مبعوث شدہ اسے وزیر کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے۔

یہ حکم نکلتی ہے کہ جب تک مندرجہ بالا اسباب ثلاثہ میں سے کوئی بھی سبب دعائی نہ ہو کوئی نئی نہیں آسکتا، اور ہمارے پچھلے بیان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ تینوں دعائی مرتفع ہو چکے ہیں۔ آپ کی دعوت تمام نوع بشری کیلئے ہے، لہذا اب نہ خدا تو مومنوں کے لئے نہیں کسی کی ضرورت نہیں۔ آپ کی فانی ہوئی کتاب اور آپ کے جملہ آثار رسالت اپنے صحیح شکل میں محفوظ ہیں، لہذا کسی نئی کتاب یا نئی ہدایت کے آنے کی بھی ضرورت نہیں، آپ کی تعلیم اور ہدایت کل اور جامع ہے، علم حق میں سے کوئی چیز پوشیدہ نہ گئی ہے اور عمل صلی کیلئے ہدایت اور نور، تعلیم و ہدایت کرنے میں کوئی کسر باقی ہے، لہذا اس پر کسی اضافہ کرنے والے کی بھی ضرورت نہیں۔ چہرے تینوں دعائی موجود نہیں ہیں، اور بعثت انبیاء کے دعائی انہی تین میں منحصر ہیں، تو لا محالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ قطعاً بند ہو چکا ہے۔ اگر اب یہ دروازہ کھلا رہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا تعالیٰ بعثت بھی کرتا ہے، حالانکہ خدا اس سے پاک اور منزہ ہے کہ اس سے کوئی بے کار فعل صادر ہو سکے۔

اس لئے اور معاملہ بصورت اختاری نہیں ہے کہ بلا ضرورت ایک نئی مبعوث کرنا ایک فعل بعثت ہے، بلکہ حریف دعا کی وہ غلط فہمکت ہی ہے۔ نبوت کے کام کی تکمیل ہو جانے کے بعد تو اس دروازے کو بند ہی ہو جانا چاہیے تاکہ ایک ہی کے ابتداء پر ساری دنیا جمع ہو سکے۔ ورنہ اگر یہ دروازہ پھر بھی کھلا رہے تو ہر نئے نبی کی آمد پر لوگوں میں پھرتے پھرتے کفر و ایمان کی تفریق نہ ہوا ہوگی اور یہی سقشہ لوگ پھر منقسم ہونا شروع ہو جائیں گے۔

رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی وہ امتیازی حیثیات ہیں جن کو قرآن مجید نے پوری تفصیل و توضیح کے ساتھ پیش کیا ہے۔

دعوتِ عام
قرآن کہتا ہے کہ :-

كُلُّ رِأْيَئِهَا النَّاسُ إِلَى سَأْئُولِ اللَّهِ إِلَيْكَ
جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ
لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَلَا مَكْرَآءَ بِاللَّهِ
وَسَأْئُولُ الْغَيْبِ الْغَيْبِ الَّذِي يُؤْتِي
بِالْأَنفُسِ وَيَخْتَارُ وَأَشْهُوَةٌ لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔

(الاعراف - ۳۰)

”اے خدا! کہو کہ لوگو میں تم سب کی طرف اس نما کا ہوا ہوا
پیغام نہ رہوں جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے،
جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو زندہ کرنے اور مارتے والا
ہے۔ پس اسی کا ذکر اللہ پر اور اس کے ان پڑھ رسول و انبی پر
جو اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کی
پیروی کو تاکر تم سیدھا راستہ پاؤ۔“

وَمَا أَمْرًا سَلَمَكَ إِلَّا كَالْهَامِ إِلَيْنَا بَشِيرًا
وَنَذِيرًا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔

(سجده - ۳)

”اور اے خدا! ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لئے خوشخبری
دینے والا اور ڈھانے والا بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ اس سے
طاہفت ہیں۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ
 وَمِنْ رَبِّكُمْ فَلَا تُؤْمِنُوا خِلَافًا لَّكُمْ وَإِنْ تَكَفَّرُوا فَإِنَّ
 اللَّهَ مُبِيتُ السُّبُوتِ وَالْآسَافِ (النصار: ۲۳)

”اے لوگو، تمہارے آپ کی طرف سے یہ رسول تمہارے
 پاس حق کے ساتھ آیا ہے پس ایمان لاؤ، یہ تمہارے لیے بہتر
 ہے اور اگر کفر کرتے ہو تو خوب جان لو کہ اللہ ہی آسمانوں اور
 زمین کا مالک ہے۔“

وَمَا أَسْأَلُكَ إِلَّا سَخِيحَةً لِّلْعَالَمِينَ۔

(الانبیاء: ۷)

”اے میرا ہم نے تم کو تمام اہل عالم کے لیے رحمت بنا کر

بھیجا ہے۔“

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْغُرْثَانَ عَلَى عَبْدِهِ
 لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا۔

”پاک ہے وہ جس نے حق و باطل میں فرق کرنے والی

کتاب اپنے بندے پر آندی تاکہ تمام اہل عالم کے لیے تنبیہ

کرنے والا بنے۔“

اس سے چند انجور مستنبط ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کسی زمانے یا کسی قوم
 یا ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ آپ ہمیشہ کے لیے تمام نوع
 بشری کے ہادی و رہنما ہیں۔

دوسرے یہ کہ تمام نوع انسانی آپ پر ایمان لانے اور آپ کا
 اتباع کرنے کے لیے مکلف ہے۔

تیسرے یہ کہ آپ پر ایمان لانے بغیر اور آپ کا اتباع کیے بغیر

ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔

یہ تینوں انکود ایمانیات میں داخل ہیں، کیونکہ اسلام جس عالم گیر بشری جہدِ رب کا نام ہے اس کی عالمگیری اور آفاقیت اسی اختلاف پر مبنی ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے باہر بھی ہدایت میسر آ سکتی ہے تو دعوتِ اسلام سے اس کی عمومیت سلب ہو جاتی ہے اور اسلام کی عالمگیری ختم۔

تکمیلِ دین

رسالتِ محمدی کا دوسرا امتداد جو قرآن مجید نے پیش کیا ہے، یہ

ہے۔

هُوَ الَّذِي أَنشَأَ رِسْوَلًا بِأَنفُسِي وَرِثِي

الْحَقِّ يُظَاهِرُكَ عَلَى الدِّينِ عَظِيمِ۔ (توبہ۔ ۵)

”جی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کیساتھ

بجھا کر اسے میری جہدِ دین پر غالب کر دے۔“

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ

نِعْمَتِي وَأَتِمَمْتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا۔ (المائدہ۔ ۱)

”آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم

پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے دینِ اسلام کو پختہ کیا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت جس چیز کا نام ہے، اور دینِ حق کا

اطلاق جس چیز پر ہوتا ہے وہ تمام وکال و رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم

کے ذریعے ہی دی گئی ہے۔ الدین (یعنی جہنمِ دین) پر آپ کی

رسالتِ کلیۃً حاوی ہو چکی ہے۔ آپ کے ذریعے دین کو مکمل کر دیا

گیا ہے اور ہدایت کی وہ نعمت جو پہلے انبیاء کے توسط سے تصویبی

تصویری کر کے عطا کی جا رہی تھی، اب انعام کو پہنچا دی گئی ہے۔ اس

کے بعد ہدایت، اور دین، اور علم حق میں سے کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہی ہے جسے ظاہر کرنے کے لئے کسی اور نبی یا رسول کے آنے کی حاجت ہو۔ ان واضح الفاظ کے ساتھ جس تکمیل دین اور احکام نبوت کا اعلان کیا گیا ہے اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ پہلی نبوتوں کے ساتھ اطاعت اور اتباع کا تعلق مستطیع ہو اور آئندہ کیلئے نبوت کا دروازہ بند ہو جائے۔ یہ دونوں امور یعنی نسخ اور ابان سابقہ اور ختم نبوت، رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیازی خصائص ہیں اور قرآن مجید میں ان دونوں کو صاف طور پر پیش کر دیا گیا ہے۔

نسخ اور ابان سابقہ

نسخ اور ابان سابقہ سے مراد یہ ہے کہ پہلے انجیا سنے جو کچھ پیش کیا تھا وہ اب منسوخ ہو گیا۔ ان کی نبوت و صداقت پر اجمالی اعتقاد رکھنا تو ضروری ہے، کیونکہ وہ سب اسلام ہی کے والی تھے، اور ان کی تصدیق حاصل اسلام ہی کی تصدیق ہے، لیکن عملاً اطاعت اور اتباع کا تعلق اب ان سے منقطع ہو کر صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور اسوۂ حسنہ کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے۔ اس سے کہہ سکتے ہیں کہ اول تو اصولاً کمال کے بعد ناقص کی ضرورت نہیں رہی، دوسرے انجیا سابقین کی تعلیم اور سیرت کے آثار تحریمت و نسیان کی تدریج کے ہیں، جس کی وجہ سے عملاً ان کا مسلک اتباع ممکن نہیں رہا۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں جہاں کہیں رسول کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔

الرَّسُولَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔ (آیہ مائدہ - ۳۲) اور أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَذُرُوا الْآفْرَاقَ۔ (آئندہ - ۸) اور مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ

اللہ (السلامہ) پھر بھی وہ ہے کہ ان قوموں کو بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کا اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے سامعین میں سے کسی کے سامنے والی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ
لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْلَمُونَ
عَنِ الْكَثِيرِ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ
مُبِينٌ يَهْدِي اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ بِرَحْمَتِهِ
مُبِينَ السُّلُوكِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى
النُّورِ بِإِذْنِهِ وَفِي ذَلِكَ بَيِّنَاتٍ لِقَوْمٍ
يُتَّقُونَ (المائدہ-۳)

”اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا ہے۔ جو تم سے بہت سی باتیں بیان کرے گا جو تم کتاب میں سے چھپاتے تھے، اور وہ بہت سی باتوں سے صاف ہو جائے گی کہ تمہارے پاس اس کی طرف سے روشنی اور کھول کر بیان کرنے والی کتاب آگئی ہے جس کے ذریعہ سے اللہ ان لوگوں کو جو اس کی روشنیوں کا اتباع کریں گے، سلامتی کے راستوں کی طرف ہدایت فرمائے گا اور انہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال دے گا اور یہی راستے کی طرف ان کی رہنمائی کرے گا۔“

اور۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ
الَّذِي يَجِدُ أَهْلًا مَكْتُوبًا جَدُّهُمَا فِي التَّوْرَةِ
وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْعَرَفِ وَيَنْهَاهُمْ
عَنِ النَّكْرِ وَيُجَلِّ لَهُمُ الْبَيِّنَاتِ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ

الْخَبِيثَاتِ وَيَعْتَمِدُنَّ غَنَاهُمْ إِسْرَهُنَّ وَالْأَعْلَانِ السَّيِّئَاتِ
 كَانَتْ عَلَيْهِنَّ فَإِذَا زَيَّغْنَ أَغْنَيْنَ امْتَوَيْنَ بِهِ وَغَرَّهُنَّ
 وَغَصَّبْنَهُنَّ وَأَفْلَحُوا الْفُتُورَ الَّذِي أَنْزَلَ مَعَهُ
 أُولَئِكَ هُمُ الْفَاحِشُونَ ، قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي
 رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ بِبَيِّنَاتٍ مِمَّا لَدَى اللَّهِ مُلْكُ
 السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ
 فَأَمُوتُوا بِإِلَهِهِ وَهُوَ سَوَّلُوا الشَّيْءَ الْكَاذِبَ الَّذِي
 يُؤْتِيهِنَّ بِإِلَهِهِ وَكَلِمَتِهِمْ فَأَفْجَعُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْقَهُونَ

(الاحزاب ۱۹-۲۰)

* اہل کتاب میں سے وہاں تک وہ ہیں جو اس ان پڑھ رکھوں
 نبی کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ اپنے ہاں تورات اور
 انجیل میں لکھا تھا پاتے ہیں۔ وہ انہیں ملنے کا حکم دیتا ہے، وہی
 سے لکھتے، پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا ہے، ناپاک
 چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے، اور ان سے اس درجہ اور اچھے
 بندہ ہونے کو اُتار دیتا ہے جو ان پر مسلط تھیں۔ پس جو لوگ اس پر
 ایمان لائے اور اس کی حاکمیت اور صدا کی، اور اس نور کا اعلان
 کیا جو اس کے ساتھ آگیا گیا ہے، وہی نجات پائے والے ہیں۔
 اسے نہ کہہ دے کہ لوگو! میں تم سب کی طرف اس نوحا کا بھیجا
 ہوا پیغامبر ہوں جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے
 جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو زندہ کرتے اور مارتے والا
 ہے۔ پس ایمان لانا اللہ اس کے ان پڑھ رکھوں و نبی پر محمد اللہ
 اور اس کے کلمات پر ایمان لانا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ
 تم سبھی راستہ پاؤ۔

ان آیات و قنات میں نوح اور ابراہیم علیہ السلام کی تصریح بھی ہے، اسکے
 سنی بھی بتا دیئے گئے ہیں، اس کی وجہ بھی ظاہر کر دی گئی ہے، اسکے
 منطقی نتائج سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے، یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اب
 ہدایت اور نجات کا دامن نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ہاتھ
 سے وابستہ ہے، اور یہ بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ نبی امی کا دین حاصل
 اسی دین کی اصلاح اور تکمیل ہے جو تورات اور انجیل کے ماتے والوں
 اور دنیا کی دوسری قوموں کے پاس بھیجا گیا تھا۔

ختم نبوت

اسی طرح تکمیل دین کے دوسرے نتیجہ، یعنی ختم نبوت کو بھی
 قرآن مجید میں بالفاظ صریح بیان کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ قَوْمٍ فَجَاءَ بِكُفْرٍ وَلَكِن
 تَسْوَنَ اللَّهُمَّ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ

عَلِيمًا۔ (احزاب-۵)

”لو کہ اسے مومنوں میں سے کسی کے آپ بھی ہیں، مگر وہ

اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں، اور اللہ ہر چیز کو جانتے والا

ہے۔“

نبوت کے سد باب کا یہ اٹھا واضح اور کھلا ہوا اعلان ہے کہ اگر
 کسی کے دل میں تاریخ اور کبھی نہ ہو تو اس اعلان کے بعد وہ اسلام میں
 نبوت کے فتح باب کی گنجائش کبھی طرح نہیں نکال سکتا۔ عاقبت کو خواہ وہ کتنے
 مفتوح پڑ جائے یا بتائے مکسور، دونوں مسودوں میں نتیجہ ایک ہی ہے،
 اور وہ یہ ہے کہ نبوت کا حوالہ اس خدا کے علم میں ہمیشہ کیلئے
 بند ہو چکا ہے جس کے علم کے غلاف کوئی امر واقع نہیں ہو سکتا۔

عقیدہ رسالت محمدیؐ کے لازمی اجزاء

مکمل دین، پنج ادیان سابقہ، اور ختم نبوت کے یہ تینوں عقیدے دراصل اسلام کے ایمانیات میں داخل، اور عقیدہ رسالت محمدیؐ کے لازمی اجزاء ہیں۔ اسلام کی دعوت عام اس بنیاد پر قائم ہے کہ نوع انسانی کے لئے دعوت محمدیؐ کی ضرورت میں ایک ایسا مکمل مذہب پیش کر دیا گیا ہے جس میں پہلی تمام دعوتوں کی کمی پوری کر دی گئی ہے، اور آئندہ کے لئے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی گئی جس کو پورا کرنے کی کسی ضرورت پیش آئے۔ اس مکمل دین نے ہمیشہ کے لئے اسلام اور کفر، حق اور باطل کے درمیان ایسا متعین اور مستقل امتیاز قائم کر دیا ہے کہ اب قیامت تک اس میں کسی قسم کا گھٹاؤ اور بڑھاؤ نہیں ہوگا جو کچھ اسلام اور حق ہے اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کر دیا۔ اب اس جنس کی کوئی مزید چیز آنے والی نہیں ہے کہ آئندہ کسی زمانے میں انسان کا مسلم اور حق پرست ہونا اس نئی چیز کو تسلیم کرنے پر موقوف ہو۔ اور جس چیز کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر اور باطل قرار دے دیا ہے وہ ہمیشہ کے لئے کفر اور باطل ہے، اس میں سے کوئی چیز نہ اب حق اور اسلام ہو سکتی ہے اور نہ اس کے سوا کسی دوسری چیز پر کفر اور اسلام کی نئی تفریق قائم ہو سکتی ہے یہی شمس اور خیر تغیر پذیر بنیاد ہے جس پر عالمگیر اور دائمی ملت و تہذیب اسلامی کی وحدت تعمیر کی گئی ہے۔ اور اس بنیاد پر اس کی تعمیر کسی نے کی گئی ہے کہ تمام دنیا کے انسان ہوشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہی ملت، ایک ہی دین اور ایک ہی تہذیب کے اجتماع پر متفق ہو سکیں۔ ایسی ملت جس کے کمال اور مستقل ہونے کا انہیں پورا یقین ہو، ایسا دین جو حق اور ہدایت پر پوری طرح حاوی ہو حتیٰ کہ اس

جنس کی کھکھٹے کے اس سے باہر وہ جانے کا اندیشہ نہ رہے، اسی
تہذیب جمی کی عمارت میں کھڑا اور اسلام کی کہی نئی تفریق سے دھندلے
جانے کا خطرہ نہ ہو۔ اسی اعتبار پر اسلام کی دعوت عام مبنی ہے، اور
اسی پر اسلام کے دوام و استحکام کا انحصار ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ
اسلام آجکل کے کھنکھارے کا احتجاج درست ہے وہ دراصل اسلام
نے دعوت عام کا حق چھینا ہے، کیوں کہ جب اسلام کے سوا
دوسرے طریقوں سے بھی ہدایت ممکن ہو تو تمام اقوام و ملل کو
اسلام کی طرف دعوت دینا ایک فضول حرکت ہوگی۔ اور جو شخص
کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ہر زمانے کے
ضروریات اور حالات کے لحاظ سے مضاف و مضماع اور اصلاح و
اضافہ ہو سکتا ہے وہ دراصل اسلام کے دوام کا حق سلب کرتا ہے
کیوں کہ جو دن ناقص ہو اور مضاف و اضافہ کا محتاج ہو، وہ اگر بیش
کے لئے درپیش ہدایت ہونے کا دعویٰ کرے تو اس کا دعویٰ جھوٹا
ہوگا۔ پھر جو شخص کہتا ہے کہ اسلام میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد
بھی انبیاء کے آنے کی گواہی ہے۔ وہ درحقیقت اسلام کے استحکام
پر ضرب لگاتا ہے۔ نبوت کا دعوہ کھلا سہنے کے معنی یہ ہیں کہ
اسلام کی حیثیت ہمیشہ پرانگی اور تفریق کے خطرہ میں مبتلا ہے۔
ہر نئے نبی کے آنے پر کھڑا اور اسلام کی ایک نئی تفریق ہو۔ اور ہر
ایسے موقع پر بہت سے وہ لوگ اسلام سے خارج ہوتے چلے
جائیں جو خدا پر، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور قرآن پر ایمان رکھنے
والے ہیں۔ پس اسلام میں نبوت کا فتح باب درحقیقت فتح کا فتح
باب ہے۔ اسلام کی بیخ کنی کے جتنے اسباب ممکن ہیں ان میں سے
سب سے زیادہ ہلکتا اور خطرناک سبب یہ ہے کہ کوئی شخص اسلام

میں نبوت کا دھوکے کرے۔ اُسے مسلک کا نظام جمعیت اسی بنیاد پر
 تو قائم کیا گیا تھا کہ جو لوگ محمد رسول اللہ اور قرآن پر ایمان لائیں وہ
 سب مسلم اور مومن ہیں، ایک ملت ہیں، ایک قوم ہیں، آپس میں
 بھائی بھائی ہیں، رنج و راخت میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔
 اب اگر کوئی شخص اُسے اور کہے کہ محمد اور قرآن پر ایمان لانا کافی ہے
 نہیں ہے بلکہ ساتھ محمد پر بھی ایمان لانا ضروری ہے اور جو محمد پر ایمان
 نہ لائے وہ کافر ہے اگرچہ وہ محمد اور قرآن پر ایمان رکھتا ہو، پھر اسی
 بنا پر وہ مسلمانوں میں کفر اور اسلام کی تفریق کرے کہ قوم اس کے
 ٹکڑے ٹکڑے کر دے جس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم بنایا
 تھا، ان لوگوں کے درمیان برادری کے رشتے کو کاٹ دے جنہیں
 قرآن نے (إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ) کہہ کر بھائی بھائی بنایا تھا، ان
 کی نیازی الگ کر دے، ان کے درمیان مناکحت کے تعلقات توڑ
 دے، حتیٰ کہ ان میں عبادت اور تعزیرت اور شرکت جنائیات کا تعلق
 بھی باقی نہ رکھے، تو اس سے بڑھ کر اسلام، اسلامی قومیت، اسلامی
 تہذیب، اور اسلام کے نظام جماعت کا دشمن اور کون ہو سکتا ہے؟
 اس بحث سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ رسالت محمدی کے ساتھ تکمیل
 دین، فیج ادیان سابقہ اور ختم نبوت کا اعتقاد کس قدر اہمیت رکھتا
 ہے، اور اسلام کے بقا و استحکام اور اس کے شیعوں عام کے لئے
 اس کا داخل ایمان ہونا کیوں ضروری ہے۔

ایمان بالکتاب

اسلام کی اصطلاح میں "کتاب" سے مراد وہ کتاب ہے جو بندوں کی رہنمائی کے لئے اللہ کی طرف سے وحیوں پر نازل کی جاتی ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے کتاب گویا اسی پیغام کا سرکاری بیان یا اسلامی اصطلاح کے مطابق "الہی کلام" ہے جسے لوگوں تک پہنچانے اور جس کی توضیح و تشریح کرنے، اور جس کو عمل کا ہامہ بنانے کے لئے پیغمبرؐ دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ "کتاب" کس معنی میں اللہ کا کلام ہے، اور اس کے کلام اللہ ہونے کی کیفیت کیا ہے؟ یہ خاص الہیات کی بحث ہے جس کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم کو اس پر صرف اس پہلو سے نظر ڈالنی ہے کہ تہذیب اسلامی کی تاسیس میں ایمان بالکتاب کا کیا اثر ہے؟ اور اس کے لئے معرفت انسانان لینا کافی ہے کہ پیغمبرؐ کے ذریعہ سے جو تعلیم بندوں کو دینی مقصود ہے اس کے اصول اور اہم مسائل خدا کی طرف سے پیغمبرؐ کے دل پر القا ہوتے ہیں، اس کے الفاظ اور معانی دونوں میں پیغمبرؐ کی اپنی عقل و فکر، اس کے ارادے اور اس کی خواہش کا وہ برابر دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ لفظاً اور معنی خدا کا کلام ہوتا ہے۔ مذکورہ طریق کی تصنیف پیغمبرؐ اس کلام کو ایک امانتدار قاصد کی حیثیت سے خدا کے بندوں تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر خدا کی عطا کی ہوئی بصیرت سے اس کے معانی اور مطالب کی تشریح کرتا ہے انہی الہی اصولوں پر اخلاق و معاشرت اور تہذیب و تمدن کا نظام قائم

کتاب ہے۔ اپنی تعلیم و تحقیق اور اپنی پاکیزہ سیرت سے لوگوں کے خیالات و رجحانات اور افکار میں ایک انقلاب برپا کرتا ہے۔ تقویٰ و طہارت اور پاکیزگی نفس اور عین عمل کی تدوین ان میں چھوٹتا ہے۔ اپنی تربیت اور عملی رہنمائی سے ان کو اس طور پر منظم کرتا ہے کہ ان سے ایک نئی سوسائٹی، نئی ذہنیت، نئے افکار و خیالات نئے آداب و اطوار، اور نئے آئین و قوانین کے ساتھ وجود میں آجاتی ہے۔ پھر وہ ان میں اللہ کی کتاب اور اس کے ساتھ اپنی تعلیم اور اپنی پاکیزہ سیرت کے آثار چھوڑ جاتا ہے جو ہمیشہ اس حاجت اور اس کے بعد آنے والے نسلوں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دیتے رہے۔

رسالت اور کتاب کا تعلق

”رسالت“ اور ”کتاب“ دونوں اسی ایک گنڈا کی طرف سے ہیں۔ دونوں ایک امر ربانی کے اجزاء اور ایک ہی مقصد اور ایک ہی دعوت کی تکمیل کے قصبے ہیں۔ وہی اللہ کا علم اور اس کی حکمت رسول کے سینے میں بھی ہے اور کتاب کے احقاق میں بھی۔ جس تعلیم کا لفظی بیان ”کتاب“ ہے اسی کا عملی نمونہ رسول کی زندگی ہے۔

انسان کی فطرت پر اس طور پر واقع ہوئی ہے کہ وہ مجرد کتابی تعلیم سے کوئی خیر معمول قائم نہیں اٹھا سکتا۔ اس کو علم کے ساتھ ایک انسانی معلم اور رہنما کی بھی حاجت ہوتی ہے جو اپنی تعلیم سے اس علم کو دلوں میں بٹھادے اور اس کا ہمتی بن کر اپنے عمل سے لوگوں میں وہ روح پھونک دے جو اس تعلیم کا حقیقی منشا ہے۔ آپکو پوری انسانی تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہ مل سکے گی کہ تنہا کسی کتاب نے انسانی معلم کی ہدایت اور تعلیم کے بغیر کسی قوم کی ذہنیت اور زندگی میں

انقلاب پیدا کیا ہو۔ جن رہنماؤں نے قوموں کے افکار و اعمال میں
وہ دست انقلابات پیدا کئے ہیں اگر وہ خود اپنی تعلیم کے مکمل عمل
نہیں کر رہے ہیں اور صرف ان کی تعلیمات اور ان کے اصول
کسی کتاب کی شکل میں شائع ہو جاتے تو انسانی فطرت کا کوئی راز وہاں
یہ دعویٰ کرنے کی جرات نہیں کر سکتا کہ محض اسے کتاب سے دیکھ
انقلابات رونما ہوتے جو ان رہنماؤں کی عملی تعلیم سے ہوتے۔

دوسری طرف یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ وہ انسانی رہنما کے ساتھ
اس کی تعلیم کا ایک مستند اور معتبر بیان بھی چاہتی ہے، خواہ وہ کالہ پر
نکھایا ہو، یا سینوں میں محفوظ ہو۔ رہنما جن اصولوں پر جماعت کے
افکار و اعمال اور اخلاق و تمدن کی بناء رکھتا ہے وہ اگر اپنی اصلی شکل
میں محفوظ نہ رہیں تو رفتہ رفتہ اس کی تعلیم کا نقش دھندلا ہوتا جاتا ہے
اور اس نقش کے مٹنے کے ساتھ انفرادی سیرت اور اجتماعی نظم و آئین
کی بنیادیں بھی کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ آخر میں اس جماعت کے
پاس صرف انسان ہی انسان رہ جاتے ہیں جن میں ایک طاقتور
نظام تمدن کو سلجھانے کی قوت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جن رہنماؤں
کی تعلیم محفوظ نہیں رہی ان کے متبعین گمراہی میں پڑ گئے، ان کی بنائی
ہوئی امت ہر قسم کے اتحادی، گھری، عملی، اخلاقی اور تمدنی مناسبت
میں مبتلا ہو گئی، اور کوئی چیز ان کے پیچھے باقی نہیں رہی جس سے وہ
صح اور اصلی اصول اخذ کئے جا سکیں جن پر ابتدائے اس امت کی شہزادہ
تمدن کی گئی تھی۔

فاطیہ کائنات یعنی مخلوق کی اس فطرت سے واقف تھا، اس نے
اس نے جب نوبہ بشری کی ہدایت کا ذریعہ لیا تو اس کے لئے رسالت
اور تنزیل دونوں کا سلسلہ ساتھ ساتھ جاری کیا۔ ایک طرف بہترین

رکھنے والے انسانوں کو رہنمائی کے منصب پر مقرر کیا اور دوسری طرف اپنا کلام بھی نازل کیا تاکہ یہ دونوں چیزیں انسانی فطرت کے ان دونوں مطالبوں کو پورا کر دیں۔ اگر رہنما کتاب کے بغیر آئے، یا کتابیں رہنماؤں کے بغیر آئیں تو حکمت کا مقصود پورا نہ ہو سکتا۔

چرخ اور رہنمائی قرآنی مثال

روایت اور کتاب کے اس تعلق کو قرآن مجید ایک تخیل پر اسے بیان کرتا ہے۔ اس نے جگہ جگہ رسول کو رہنما اور ہدایت سے تشبیہ دی ہے جس کا کام گمراہوں کو سیدھا راستہ بتانا ہے، مثلاً وَجَعَلْنَاهُ فِی سَبِيلِ الْحَقِّ يُهْتَدُونَ بِأَمْرِنَا (الزمرہ-۵) وَلَقَدْ قَوَّمُوا هَاجِرًا (الرحہ-۱) فَاِتَّبَعْنِیْ اَهْدِکَ سَبِيْلًا سَوِيًّا (مریم-۳) وَاهْدِیْکَ اِلٰی نَهْجِکَ فَتَخْشٰی (الاحکامات-۱)۔ دوسری طرف وہ کتاب کو ”نور“ اور ”ضیاء“ اور ”برہان“ اور ”فرقان“ اور ”منیر“ اور ”مبین“ کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے، مثلاً وَاتَّبِعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اَنْزَلْنَا مِنْ اَمْرِنَا (الاحکامات-۱) وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا مُوْسٰی وَهَارُوْنَ الْعِزُّوْنَ وَضِیْآءَ (الانبیاء-۴) قَدْ جَاءَکُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ (الاحکامات-۳) قَدْ جَاءَکُمْ بِنُوْرٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ (النساء-۳۴)۔ یہ تشبیہات بعض شاعری نہیں ہیں بلکہ ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ان سے یہ بتانا مقصود ہے کہ معمول انسان کو فطری عقل اور انسانی علم سے اتنی روشنی اور رہنمائی حاصل نہیں ہوتی جس سے وہ حق کی سیدھی راہ پر چل سکے۔ اس اجلی اور اندھیری منزل میں اس کو ایک ایسے غیر معمولی رہنما کی ضرورت ہے جو اس منزل کی رسم و رواج سے واقف ہو، اور ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں ایک چرخ بھی ہو، تاکہ وہ اسے اپنے ہونے قدم پر بتا سکے کہ یہاں گڑھا ہے، یہاں قدم بھٹکا ہے، یہاں گڑھے

اور جھاڑیاں رہیں، جہاں سے دوسرے ٹیڑھے اور لٹخا ہلستے ٹھٹھکے ہیں اور اس کے پیچھے چلتے والا انسان خود بھی اس چراغ کی روشنی میں راہ کے نشانات کو دیکھ کر، سیدھی راہ کی علامات کو پہچان کر ٹیڑھے راستوں کے موڑوں اور ٹکڑوں سے واقف ہو کر، علیٰ وجہ البصیرت اس سس کا اقتدا کرے۔ رات کے اندھیرے میں رہنا اور چراغ کے درمیان جو تعلق ہوتا ہے وہی تعلق رُٹول اور کتاب میں بھی ہے۔ اگر ہم رہنا کے ہاتھ سے چراغ بھینٹیں اور خود اس کو لے کر چلتے بیٹھیں تو راستے میں ہم کو بہت سے ایسے تراپے چھڑاے اور متشابہ راستے ملیں گے جہاں ہم کو یا تو حیران و پریشان ہو کر ٹھہر جانا ہوگا، یا ہم اسے جس چراغ کی روشنی میں کسی لٹخا ہلستے پر چلتے بیٹھیں گے، کیونکہ محض چسندار کا وجود انسان کو رہنا سے بے نیاز نہیں کرتا۔ اسی طرح اگر رہنا کے ہاتھ سے چراغ نہ ہو تو ہم محض انہی متشکک طرح اس کا دامن پکڑتے ہوئے چلیں گے اور روشنی کے بغیر ہم میں خود اتنی بصیرت پیدا نہ ہوگی کہ سیدھے راستے کو ٹیڑھے راستوں سے ممتاز کر کے دیکھ سکیں اور سیدھی راہ کے ان نازک مقامات کو بھی پہچان میں جہاں انسان ٹھوکر کھا ہے یا اس کا قدم پھسل جاتا ہے پس جس طرح ہم کو رات کی تاریکیوں میں اجنبی راہوں پر چلتے کے لئے ایک ایسے جلدی کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو اس منزل کی رسم و راہ سے خوب واقف ہو، اور ایک مشعل کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس کی روشنی میں ہم اس راستے کو خوب پہچان سکیں، اور ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی ہم بے نیاز نہیں ہو سکتے، اسی طرح حقیقت کی اجنبی منزل میں، جہاں ہماری عقل کی روشنی تنہا کام نہیں دیتی، ہم کو رُٹول اور کتاب دونوں کی یکساں ضرورت ہوتی ہے ان میں سے کسی کے اتہام کو چھوڑ

کر ہم سیدھی راہ نہیں پاسکتے۔

رسول وہ ماہر و درق ہے جو خدا کی دی ہوئی بصیرت سے ہدایت کی سزا و مستقیم کو مانتا ہے اور اس منزل کی رسم و راہ سے ایسا واقف ہوتا ہے جیسا کہی راہ پر سینکڑوں مرتبہ چلا ہوا ہندو اس کے ہر قدم کی تفصیل کیفیات سے واقف ہوا کرتا ہے۔ اس بصیرت کا نام ”علم“ اور ”علم“ اور شرح ”سعد“ اور ”تعلیم الہی“ و ”ہدایت دہانی“ ہے جسے خصوصیت کے ساتھ اچھا تعلیم السلام کو عطا کئے جانے کا ذکر بار بار قرآن میں آیا ہے، مثلاً اَلَمْ تَشْرَوْكَ فَتَمْلِكْ (نمل) وَ اَسْأَلُكَ اَللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَيْكَ مَا لَمْ تُكُنْ تَعْلَمُ (النمل، ۱) وَ كَلَّا اَتَيْنَاكَ حُكْمًا وَ جَلْمًا (النمل، ۲) اِتَّبِعُوا مَنَ اِذْ يَدْعُوْكُمْ اَحْزَابًا وَ هُمْ قُلُوبُهُمْ مُّشْوَعَةٌ (س، ۲) اور کتاب وہ روشنی چراغ ہے جس کی مدد سے رسول اپنے پیروں کو نہ صرف سیدھی راہ چلاتا ہے، بلکہ انہیں اسی نور علم اور روشنی فکر اور عرفان حق سے بہرہ مند کر دیتا ہے جو ایک بالآخر جسے میں اللہ کی طرف سے خود اس کو عطا ہوا ہے، اور اپنی تعلیم و تربیت سے انہیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ اگر وہ اس کے نقش قدم پر چلیں اور اس چراغ کو ہاتھ میں رکھیں تو نہ صرف خود ہدایت پائیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی رہنما اور امام بن جائیں۔

كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ

الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ (الحج، ۱)

”یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تیری طرف آکرا کر تو

لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی میں نکالے۔“

وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ الْفَرٰقَانَ فَتَاوِسْ مَا اُنْزِلَ

إِنَّمَا نَحْنُ نَعْلَمُ بِمَا نَكْتُبُ (الحمل-۶)

”ہم ہی جانتے ہیں کہ (قرآن) تمہارا کو تو لوگوں کے لیے اس
ہدایت کو واضح کرے جو ان کی طرف آگئی گی ہے شاید کہ وہ
خود بخبر کریں۔“

پھر ایک طرح انداز میں قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ مادی جہانی عالم
میں چراغ اور رہنما کے درمیان جو معاشرت ہے وہ عالم حقیقت میں
رسول اور کتاب کے درمیان نہیں ہے، بلکہ ان دونوں کے درمیان
ایک اتحادی رشتہ ہے۔ چنانچہ بعض جگہ جس چیز سے کتاب کو تشبیہ
دی گئی ہے اسی چیز سے کسی دوسری جگہ رسول کو بھی تشبیہ دی گئی
ہے، اور اسی طرح اس کے برعکس۔ کہ یَا أَيُّهَا الشَّيْءُ إِنِّي أَنَسْتُكَ
شَاهِدًا وَمُشِيرًا وَنَذِيرًا وَذَا حِجَابٍ إِلَىٰ أَهْلِهَا بِأَوَانٍ وَسِرَاجًا
مُجِيزًا (احزاب-۶) میں رسول کو چراغ و روشن کہا گیا ہے اور آئیے
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ (نہی سرگود) میں کتاب
کو رہنما کہا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور رسول کا تعلق حقیقتاً ناقابل
انقطاع ہے۔ انسان کو ہدایت کے لیے دونوں کی یکساں ضرورت ہے
انسان جس فکری و عملی نظام اور جس تہذیب و تمدن کو قائم کرنا چاہتا
ہے اس کے قیام و استحکام، اور اس کے خاتمہ اپنی صحیح شکل میں
رہنے کے لیے ناگزیر ہے کہ ہمیشہ رسالت اور کتاب دونوں کے
ساتھ اس کا تعلق برقرار رہے۔ اسی شدید ضرورت کی بنا پر رسالت
اور کتاب دونوں کو الگ الگ مستقل اجزائے ایمان قرار دیا گیا اور
ہر ایک پر ایمان لانے کی ہر پاد تاکید کی گئی۔ اگر تاکید مقصود نہ ہوتی
تو ایسا کرنے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ رسول کی تصدیق اس کی واضح

ہوئی کتاب کی تصدیق کو متضمن ہے، اور کتاب کی تصدیق اس کے
لئے واے کی تصدیق کو۔

تمام کتب آسمانی پر ایمان

جہاں تک ایمان کا تعلق ہے، اسلام ان تمام کتابوں کو ماننے کا
حکم دیتا ہے جو خدا کی طرف سے اس کے رسولوں پر نازل کی گئی ہیں
مسلمان ہونے کے لیے جس طرح تمام رسولوں اور نبیوں پر ایمان لانا
ضروری ہے، اسی طرح تمام کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے چنانچہ
قرآن میں برابر کہا گیا ہے۔

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ
مِن دُونِكَ۔ (البقرہ۔ ۱)

”اور پرہیزگار وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو
تیری طرف آگاری گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے آگاری
گئی تھیں۔“

قُلْ أَمَرَ بِالْإِيمَانِ وَمَنْ يَكْتُمِبْهُ فَإِنَّهُ عَلَى سُلُوكٍ۔
(البقرہ۔ ۴۰)

”رسول اور سب مومن ایمان لائے اللہ پر اور اس کے
فرشتوں پر اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر۔“
نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
يَذِّبُ شَيْئًا۔ (آل عمران۔ ۱)

”اللہ نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب آگاری جو تصدیق کرتی
ہے ان تمام کتابوں کی جو اس سے پہلے آچکی ہیں۔“
قُلْ أَمَرَ بِالْإِيمَانِ وَمَنْ يَكْتُمِبْهُ فَإِنَّهُ عَلَى سُلُوكٍ
عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ فَلَا شُرُكَ لَهُ وَلَا تِلْكَ الْأَشْوَاقُ

وَالْأَسْبَاطُ قَعًا أَوَّلَىٰ مُؤْمِنَىٰ وَعِيْنَىٰ وَالشَّيْثُونَ
مِنْ شَرِّهِمْ لَا تَقْرَأُ بَيْنَ أَغْيَا وَتَهْجُرُونَ لَهُ
مُسْلِمُونَ۔ (آل عمران۔ ۹)

”کہہ دے کہ ہم ان کے اللہ پر اور اس کتاب پر جو
ہم پر آئی گئی ہے اور ان کتابیں پر جو ایمان اور اسما حیل اور
اسماقی اور یحویٰ اور اولاد یحویٰ پر آئی گئی ہیں۔ اور جو
مومن اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف
سے دی گئی ہیں۔ ہم ان میں سے کسی کے صریح تخریج نہیں کرتے
اور ہم اس کے کتب قراں ہیں۔“

الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَمَا آتَا سُلْطَانَهُمْ
فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ إِذَا الْأَهْلَاءُ فِي أَقْتَابِهِمْ فَتَسْلُبُ
يُنَجَّبُونَ فِي الْعَذَابِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُنْجَبُونَ۔

(المومن۔ ۵)

”جین لوگوں نے اس کتاب اور ان کتابوں کو بھٹلایا جن کے
ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا تھا ان کو عقرب اس کا اہم مسلم
بوجھائے گا۔ جب طوق و سلاسل ان کی گردنوں میں پڑے ہوں گے
اور وہ کہتے ہوئے ہوں گے کہ ہم نے گھیسے ہائیں گے۔ ہر ایک میں
جو تک عیشہ ہائیں گے۔“

لَقَدْ آتَيْنَا سُلْطَانًا مُّسْلِمًا بِالْبَيْتِ وَأَنْزَلْنَا مِنْهُمْ
الْكِتَابَ وَالْحِزْمَ أَنْ يَنْتَوِمَ النَّاسُ بِالْقُسْطِ۔

(الحج۔ ۳)

”بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو کئی نشانوں کے ساتھ
بھیجا تھا اور ان کے ساتھ کتاب اناری تھی، اور تار و تاک و کج

پردہ تم ہوں

اس اجمالی بیان کے ساتھ بعض کتابوں کے نام لے کر بھی ان پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اور ان کی تعریف و توصیف کی گئی ہے مثلاً توحید کو ہدایت، نور، فرقان، ضیاء، امام اور رحمت کہا گیا ہے (القصاص ۵۵) المائدہ ۶۵ الانبیاء ۲۲ احقاف (۲) اور انجیل کو بھی ہدایت، نور اور موعظت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے (المائدہ ۴۷) پس یہ بات اسلام کے اصول میں سے ہے کہ جن کتابوں کا ذکر تفسیر کے ساتھ قرآن میں کیا گیا ہے ان پر صراحتاً، اور جن کا ذکر نہیں کیا گیا ہے ان پر اجمالاً ایمان لایا جائے۔ اسلامی اعتقاد کے مطابق کوئی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں اللہ کے رسول اس کی طرف سے کتابیں نہ کر ڈالے ہوں، اور جتنی کتابیں دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف قوموں میں آئیں وہ سب ایک ہی سرچشمے کی خبریں، ایک ہی آفتاب کی شاخیں تھیں۔ سب اسی حق اور صداقت اور ہدایت اور نور کے ساتھ آئی تھیں جس کا نام "اسلام" ہے۔ اس لئے جو "مسلم" ہے وہ ان سب پر ایمان لانا ہے اور جو ان میں سے کسی کی تکذیب کرتا ہے وہ سب کی تکذیب اور خدا کی حقیقت اصل سرچشمے کی تکذیب کا مجرم ہے۔

صرف قرآن کا اتباع

لیکن ایمان کے بعد جہاں سے بالفعل اتباع کی سرحد شروع ہوتی ہے وہاں دوسری کتابوں سے تعلق منقطع کر کے صرف قرآن کیساتھ تعلق رکھنا ضروری ہے۔ اس کے متعدد وجوہ ہیں۔

اولاً کتب اسمانی میں بہت سی کتابیں تو اب معدوم ہیں، اور جو پائی جاتی ہیں ان میں قرآن کے سوا کوئی کتاب اپنے اصل الفاظ

اور معانی میں محفوظ نہیں ہے۔ کلام الہی کے ساتھ کلام انسانی لفظاً اور معنی دونوں طرح شریک ہو گیا ہے۔ ہدایت کے ساتھ گمراہی، جو خواہشات انسانی کے اجتماع کا لازمی نتیجہ ہے، ان کتابوں میں مدخل گئی ہے۔ اب یہ تیز کرنا مشکل ہے کہ ان میں حق کس قدر ہے اور باطل کس قدر۔ یہی حال ان کتابوں کا بھی ہے جن پر مختلف باتیں اپنے دین کا حار رکھتی ہیں، اور جن کے آسمانی ہونے کا شبہ کیا جاسکتا ہے ان میں سے بعض تو ایسی ہیں جن میں ٹھنڈل من اللہ ہونے کا حتمی ہی سرے سے موجود نہیں ہے۔ بعض کے متعلق یہ شک چہ نہیں چلتا کہ اگر وہ خدا کی طرف سے آئی تھیں تو کن نبیوں کے پاس آئیں اور کس زمانے میں آئیں۔ بعض کی زبانیں ایسی مژدہ جوہلی ہیں کہ آج ان کے صحیح معانی متعین کرنا مشکل ہے۔ بعض میں انسانی خواہشات اور لفظ تحقیقات و اوہام کی صریح آمیزش معلوم ہوتی ہے۔ بعض میں شرک، غیر اللہ کی پرستش اور ایسے ہی دوسرے غلط عقائد اور اعمال کی صریح تعلیم موجود ہے جو کسی طرح حق نہیں ہو سکتی۔ ایسی کتابیں جن کا یہ حال ہو، انسان کو صحیح علم اور صحیح روشنی نہیں دے سکتیں انسان ان کا اجتماع کر کے گمراہی سے محفوظ نہیں ہو سکتا۔

ثانیاً، قرآن کے سوا جتنی کتابیں اس وقت موجود ہیں، عام اس سے کہ آسمانی ہوں یا ان کے متعلق آسمانی ہونے کا شبہ کیا جاسکتا ہو، ان کی تعلیمات اور ان کے احکام میں یا تو محدود نسلی قومیت کا اثر نمایاں ہے، یا مخصوص زمانی حالات کا اقتضاء غالب۔ وہ ہرگز ان میں تمام نوع بشری کے لئے ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ بنی ہیں اور نہ بن سکتی ہیں۔

ثالثاً، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کتابوں میں سے ہر ایک میں

ایسی تعلیمات موجود ہیں جو حق اور صدق ہیں، اور ان میں انسان کے اخلاق اور معاملات کی اصلاح کے لئے بعض اچھے اصول اور قوانین بھی موجود ہیں۔ لیکن ان میں کوئی ایک کتاب ایسی نہیں ہے جو تمام غیرات کی جامع ہو، جس میں پورا حق ظاہر کر دیا گیا ہو، جو تنہا انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اس کدھج رہنمائی کر سکتی ہو۔

قرآن مجید ان تینوں غامیوں سے پاک ہے۔

۱۔ وہ انہی الفاظ میں محفوظ ہے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پیش کیا تھا۔ اول روز سے سیکڑوں، ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے ہر زمانے میں اس کو لفظ بلفظ یاد کیا ہے، لاکھوں کروڑوں آدمیوں نے روزانہ اس کی تلاوت کی ہے، ہمیشہ اس کے نسخے ضبط کتابت میں لائے جاتے رہے ہیں، اور کبھی اس کی حمایت میں ذرہ برابر اختلاف نہیں پایا گیا ہے۔ لہذا اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جو قرآن نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سُنا گیا تھا وہی آج دنیا میں موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ اس میں کبھی ایک لفظ کا تغیر و تبدل نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔

۲۔ وہ عربی زبان میں اُتر ہے جو ایک زندہ زبان ہے۔ اس کے بولنے والے اور سمجھنے والے آج کروڑوں انسان موجود ہیں، اور آج تک اس زبان کا فصیح اور معیاری ترمیم وہی ہے جو نزول قرآن کے وقت تھا۔ اس کے معانی اور مطالب معلوم کرنے میں انسان کے لئے وہ دقیق نہیں ہیں جو مڑوبہ زبانوں کی کتابوں کے سمجھنے میں پیش آتی ہیں۔

۳۔ وہ سراسر حق، اور الاقل تا آخر اہل تعلیمات سے لبر ہے۔

اس میں کہیں انسانی ہڈیات، نفسانی خواہشات، قوی یا طاقتی خود فریبی اور جاننا نہ گمراہیوں کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اس کے اندر کلام الہی کے ساتھ انسانی کلام کی فرقہ برادر آمیزش نہیں ہو سکتی ہے۔

۴۔ اس میں تمام نوح بشری کو خطاب کیا گیا ہے اور اسے عقائد، اصول اخلاق اور قوانین عمل پیش کئے گئے ہیں جو کسی ملک و قوم اور کسی خاص زمانے کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔ اس کی ہر تعلیم عالمگیر بھی ہے اور جاودانی بھی۔

۵۔ اس کے اندر ان تمام حقائق و معارف اور خیرات اصلاحات کو جمع کر دیا گیا ہے جو اس سے پہلے آسمانی کتابوں میں بیان کیے گئے تھے۔ کسی مذہب کی کتاب سے ایسی کوئی بات نکال کر نہیں بتائی جا سکتی جو حق اور سچی ہو اور قرآن اس کے ذکر سے خالی ہو۔ ایسی جامع کتاب کی موجودگی میں انسان آپ سے آپ دوسری تمام کتابوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

۶۔ وہ آسمانی ہدایات اور الہی تعلیمات کا جدید ترین مجموعہ (Latest Editions) ہے۔ بعض ہدایات، جو پہلی کتابوں میں مخصوص حالات کے تحت دی گئی تھیں، وہ اس میں سے نکال دی گئیں اور بہت سی نئی تعلیمات جو پہلی کتابوں میں نہ تھیں، اس میں اضافہ کر دی گئیں۔ لہذا جو شخص آباؤ اجداد کا نہیں بلکہ الی الواقعِ اُردانی ہدایت کا پیرو ہے ہے اس کے لئے لازم ہے کہ اس کی آخری اور جدید ایڈیشن کا اتباع کرے نہ کہ پرانے ایڈیشنوں کا۔

یہی وجہ ہے جن کی بناء پر اسلام نے تمام کتابوں سے اتباع کا تعلق منقطع کر کے صرف قرآن پاک کو متبوع قرار دیا ہے اور تمام دنیا کو دعوت دی ہے کہ وہ اسی ایک کتاب کو اپنا دستورِ عمل

بتلے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِيكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بِهِ

النَّاسُ بِمَا أَمَرْنَاكَ اللَّهُ. (انعام-۱۴)

”ہم نے تجری طرف سے کتاب حق کے ساتھ امانت ہے تاکہ تو

لوگوں کے درمیان اس علم حق کے ساتھ فیصلہ کرے جو خدا نے

خجے دیا ہے۔“

فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ، وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَ

اتَّبَعُوا النَّوَصِرَ الَّذِينَ آمَنُوا بِهِ أُولَئِكَ هُمُ

الْمُطِيعُونَ. (انعام-۱۵)

”پس جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی

مدد اور حمایت کی اور اس نورا کا اتباع کیا جو اس کے ساتھ آرا

ہے وہی طاعت پانے والے ہیں۔“

اور یہی وجہ ہے کہ ان قوموں کو بھی قرآن پاک پر ایمان لائے

اور اس کا اتباع کرنے کی دعوت دی گئی ہے جن کے پاس پہلے

کے کوئی آسمانی کتاب موجود ہے۔ چنانچہ بار بار قرآن میں حکم دیا جاتا

ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا الْكِتَابَ الَّذِي نَزَّلْنَا

مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ. (انعام-۱۶)

”اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی ہے وہ ان کو اس کتاب

(قرآن) پر جسے ہم نے آنا ہے اور جو ان کتابوں کی تصدیق

کتاب ہے جو تمہارے پاس ہے۔“

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ

كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو

عَنْ كَثِيرٍ، قَدْ جَاءَ كَثَرٌ مِنَ اللَّهِ نُومًا وَكِتَابٌ
مُبِينٌ يَهْدِي مَنْ يَهْدِيَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ أَشْعَرُ بِهِ سَوَامًا
سُبُلَ السُّلَمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ
بِإِذْنِهِ وَرَبُّهُمْ رَحِيمٌ إِلَى صَوَابٍ مُسْتَقِيمٍ۔

(المائدہ - ۳)

اسے کتاب والوں تہا ہے اس پر ملا رسول آگیا ہے جو
تہا ہے اے ان بہت ہی چیزوں کو ظاہر کرتا ہے ان کو تم کتاب
میں سے چھپاتے تھے، اور بہت ہی چیزوں سے ممانعت بھی کر
دیتا ہے تہا ہے اس اللہ کی طرف سے روشنی اور کھول کر بیان
کرنے والی کتاب آگئی ہے جس کے ذریعہ سے اللہ ان لوگوں
کو سادہ حق کی راہوں کی طرف ہدایت پہنچاتا ہے جو اسکی غلطیوں
کا اتباع کرتے رہے، اور وہ اپنے اذی سے ان کو باز رکھوں سے
روشنی کی طرف نکال دیتا ہے اور سیدھے راستے کی طرف ان کو
رہنمائی کرتا ہے۔

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ مَبِينَاتٍ وَمَا يَتَّبِعُ
بَعْثًا إِلَّا الْفَاسِقُونَ۔ (البقرہ - ۱۲)

اور ہم نے تیری طرف واضح اور کھل ہوئی آیتیں آنکری
ہیں، اور ان کا انکار صرف وہی کرتے ہیں جو فاسق ہیں۔

قرآن کے متعلق تفصیلی عقیدہ

جو کتاب انسان کے لئے فکر و اعتقاد کی صحیح رہنما قرار دی گئی ہو،
اور جس کو عملی زندگی کے لئے واجب الاتباع قانون مقرر کیا گیا ہو،
اس کی پیروی اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان
اس کے صحیح اور برحق ہونے اور غلطیوں سے محفوظ ہونے کا پورا

پورا یقین نہ رکھتا ہو۔ کیونکہ اگر اُس کی صحت کے متعلق کسی قسم کے شک نے راہ پالی تو اُس پر سے اطمینان اُٹھ جائے گا اور پھر جمعیت خاطر کے ساتھ اُس کی پیروی نہ کی جاسکے گی۔ اس ضرورت کی بنا پر ایمان بالقرآن کے لازمی اجراء حسب ذیل ہیں جن کو قرآن مجید میں بیان کر دیا گیا ہے۔

۱۔ قرآن میں زبان میں اترا تھا اسی عبارت میں محفوظ ہے کسی قسم کی کمی بیشی اُس میں نہیں ہوئی۔ اس پر حسب ذیل آیات دلالت کرتی ہیں۔

إِنَّا عَلَّمْنَا بَعْضَهُمُ الْقُرْآنَ وَلَآ آخَرَهُمْ ۚ فَلَا تُفَسِّرُهُمْ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوا السُّكُوتَ ۚ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ عَشْرًا مِّنَ اللَّيْلِ فَتَنظُرُ إِلَيْكَ ۚ فَلَآ تَنصِفُ إِلَّا مَا أَسَاءَ الْعِلْمُ ۚ (الاحق)

”اس کو بھیج کر اوروں پر عائد ہمارے ذمہ ہے۔ یہاں جب ہم اسے پڑھیں، تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو۔ پھر اس کے صاف کو سمجھا دینا بھی ہمارا کام ہے۔“

سُبْحَنَ رَبِّيَ ۚ فَلَآ تَنصِفُ إِلَّا مَا أَسَاءَ الْعِلْمُ ۚ (الاحق)
”ہم تم کو ایسا پڑھاؤں گے کہ تم تجھوتے چراؤ گے، پھر اس کے چمے ٹھاٹھلا جائے۔“

إِذَا تَنصَفُ نَزَّلْنَا الْبُكَوْرَ وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِتُونَ ۚ (الحجر)

”اس ذکر (قرآن) کو ہم ہی نے اُنکاپ ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“

وَإِنَّمَا أَوْفَوْنَ إِلَيْكَ مَن كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْمَقَاتِلُ ۚ فَمَا أَوْفَوْا بِمَقَاتِلِهِمْ ۚ (النہج)

”پہری طرف تیرے سب کی کتاب ہے جو کچھ وحی کیا گیا ہے

اس کی تلاوت کر، اس کے کلمات کو کوئی بدلتے والا نہیں ہے۔
۲۔ قرآن کی تفسیر میں کسی شیطانی قوت کا قہر برابر دخل نہیں ہے۔

وَمَا أَتَتْهُمْ مِنَ الشَّيْطَانِ وَمَا يَنْتَبِهُنَّ لَهُمْ
وَمَا يَنْشَاطِبُهُنَّ، إِنَّمَا عَنْ الشَّمْعِ لَيَعْرَوْنَ لَوْ كُنَّ
(الشعراء: ۱۸)

”اس کو لے کر شیطان میں آتے ہیں، حدیث کا نام ان کے
کے لے لیا ہے، حدیث اس کو کر سکتے ہیں، بلکہ وہ تو وحی کے سنے
سے بھی دور رکھ گئے ہیں۔“

۳۔ قرآن میں خود ہی کی خواہش کا بھی کوئی دخل نہیں۔
وَمَا يَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ
(الجم: ۱)

”وہ اپنے دل کی خواہش سے نہیں بولتا رہتا، بلکہ یہ جو
کہہ رہا ہے وہی ہے جو اس پر اتاری جاتی ہے۔“
۴۔ قرآن میں باطل کو ہرگز کوئی راہ نہیں ملی۔

وَلَا تَدْرِكُ لَكُتَاتٍ عَزِيزٌ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ
بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ
خَبِيرٍ
(نم اسجد: ۵)

”مجتہد پر ایک محفوظ و مضبوط کتاب ہے۔ باطل نہ اس کے
کے سامنے آسکتا ہے نہ پیچھے۔ یہ ایک حکیم اور سزاوار خداوند
کی بات کہی ہوئی ہے۔“

۵۔ قرآن سراسر حق ہے، گمان اور اندازہ کی بنا پر نہیں بلکہ علم
کی بنا پر اتارا گیا ہے، اس میں کی اور ٹیڑھ نہیں ہے، ٹھیک ٹھیک

سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

وَيُزِي الدِّينَ أَوْثُوا الْعِلْمَ إِلَهُيَ أَنْزَلَ
إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ هُوَ الْحَقُّ وَيَقْدِرُ إِلَى صَرَاطِ
الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ۔ (سہار۔ ۱)

”اور جو لوگ علم رکھتے ہیں وہ اس کتاب کو جو تیری طرف
تیرے رب کے پاس سے اُکارتی گئی ہے سمجھتے ہیں کہ یہی
حق ہے اور تجھے عزت و عید کی طرف ہدایت کرتی ہے۔“
وَإِنَّمَا تَحَقُّقُ الْوَعْدِ۔ (الہام۔ ۲)

”اور بلاشبہ وہ سچتی ہی ہے۔“

وَلَقَدْ جَاءَكَ إِهْمٌ بِكِتَابٍ فَضَّلْنَاهُ عَلَى كُلِّ
هَدًى وَرَحْنَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ (احزاب۔ ۹)

”اور ہم ان کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس
کو ہم نے علم کی بنا پر مومنوں کے لئے افضل و بہتر اور رحمت
بنا دیا ہے۔“

كُنْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ فِي السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضِ۔ (الزمر۔ ۱)

”اے محمد! کہہ دو کہ یہ کتاب اُس نے آداری ہے جو آسمانوں
اور زمین کے سب سے مہربان ہے۔“

ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ۔ (مجموعہ۔ ۱)

”یہی ایک کتاب ہے جس میں کوئی شک و شبہ کی بنا پر نہیں
ہی گئی ہے۔“

وَلَقَدْ يَنْجَلِ لَكُمَا بِمُؤْمِنٍ آتَمًا۔ (الجمہت۔ ۱)

”اور کہتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں رہی۔ وہ بالکل سچا ہے۔“

إِنَّ هَذِهِ الْقُرْآنَ يَتْلُوهُنَّ عَلَى الْمَوْتَى وَنَحْنُ أَقْبَرُ۔

(نہی امر لکھ۔ ۱)

”اوسے شک ہے قرآن ہی مائتہ دکھاتا ہے جو اعلیٰ پہنچا

ہے۔“

ہر قرآن کے احکام اور اس کی تعلیمات میں رد و بدل کا حق کسی کو، حتیٰ کہ پیغمبر کو بھی نہیں ہے۔

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْكَ آيَةٍ
لَقَدْ يَنْصَرِفُ إِنَّ أَتَيْتُهُ إِلَّا مَا يُوْحِي إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ
إِنْ غَضِبْتُ مَخَافَتِي هَذَا آتَتْ يَوْمَ عَذَابٍ

(نہی امر۔ ۲)

”اے محمد! کہہ دو کہ میں اس کتاب کو اپنی طرف سے

بدلنے کا حق نہیں رکھتا۔ میں تو صرف اس وحی کا اتباع کرتا

ہوں جو میری طرف آنکری ہوتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی

نافرمانی کروں تو مجھے نئے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔“

۷۔ جو چیز قرآن کے خلاف ہے وہ ہرگز قابلِ اتباع نہیں

ہے۔

إِشْعُرُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا

تَلْفِتُوا مِنْ دُونِهَا أُولَئِكَ آتَتْ (الہد۔ ۱)

”جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے آتا رہا

ہے اس کی پروہی کرو اور اس کو چھوڑ کر دوسرے کاموں کی

پروہی نہ کرو۔“

یہ قرآن مجید کے متعلق اسلام کا تفصیلی عقیدہ ہے اور اس کے
جوہر پر اعتقاد رکھنا لازم ہے۔ جس کے عقیدہ میں کسی جوہر کی بھی

ہوگی وہ قرآن کا صحیح اور کامل اتباع نہ کر سکے گا اور اُس راہِ راست سے ہٹ جائے گا جس کا ہم "اسلام" ہے۔

جامعہ اسلامی کا سنگ بنیاد

ایک کتاب اور ایک رسول پر ایمان، اُسی کا اتباع، اُسی کے بنائے ہوئے سانچے میں ذہنیاتوں کا ڈھل جانا، اسی ایک منبع سے تمام اعتقادات و عبادات اور اخلاق و معاملات اور جملہ دینی قوانین کا ماخوذ ہونا، اور اسی ایمان و اطاعت اور اتباع کے رشتے میں تمام بیروانی اسلام کا منسلک ہونا اسلام کو ایک مستقل تہذیب اور مسلمانوں کو ہر قسم کے نسل و لسانی اور لونی و جغرافیائی اختلاف کے باوجود ایک قوم بنانا ہے۔ علم و عقل، تحقیق و اجتہاد، نقطہ نظر اور ترجمانِ طبع کے خطری اختلاف سے یہ ممکن ہے کہ آیاتِ قرآنی اور سنتِ نبوی سے مسائل کے استنباط میں، اور ان کے مفہوم اور مقصود کے سمجھنے میں اختلاف واقع ہو جائے۔ لیکن ایسا اختلاف محض جزئی اور فروعی اختلاف ہے، اور یہ ان مختلف فقہی اور کلامی مذاہب کو الگ الگ دین، اور ان کے ماننے والوں کو جدا جدا قومیں نہیں بنانا۔ اصل چیز جس پر ملتِ اسلام کی بناء قائم ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسولِ خدا ہونے کے واحد مقتدا، اور قرآن کو بحیثیت کتابِ الہی ہونے کے واحد کتابِ آئین تسلیم کرنا اور اسی سرچشمے کو جملہ عقائد اور قوانین کا ماخذ قرار دینا ہے۔ اس اصل میں جو لوگ متفق ہیں وہ سب ایک قوم میں خواہ ان کے درمیان فروعی امور میں کتنا ہی اختلاف ہو۔ اور اس اصل سے جو لوگ اختلاف رکھتے ہیں وہ سب اسلام کی نظر میں ایک دوسری قوم ہیں، خواہ وہ خود آپس میں کتنی ہی مختلف قومیتوں میں بٹے

ہوئے ہوں۔

قرآن دراصل اُن تمام امور کا جامع ہے جن پر اسلام کی بنا قائم ہے جو قرآن پر ایمان لایا ہو مگویا خدا اود کے پاک اور اس کی کتابوں اسکے رسولوں اور یوم آخر پر بھی ایمان لے آیا۔ کیونکہ یہ تمام ایمان اپنی تفصیلات کے ساتھ قرآن میں موجود ہیں اور ایمان بالقرآن کے راست اور درست ہو جانے کا یقینی ثمرہ یہی ہے کہ انسان کو پورا ایمان حاصل ہو جائے۔ اسی طرح قرآن میں شریعت اسلام کے تمام اصول اور اساسی قوانین بھی مندرج ہیں جن کو صاحب شریعت علیہ السلام نے اپنے قول اور اپنے عمل سے واضح اور مشروح کر دیا ہے۔ لہذا جو شخص صحیح ایمان کے ساتھ قرآن اور سنت رسول کو اپنی زندگی کے تمام معاملات میں واجب الاتباع قانون قرار دیتا ہے، وہ یقیناً استقامت اور عمل کے لحاظ سے مسلمان ہے۔ اسی ایمان اور اتباع کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔ جہاں یہ دونوں چیزیں موجود ہوں گی۔ وہاں اسلام بھی ہوگا اور جہاں یہ نہ ہوں گی وہاں اسلام بھی نہ ہوگا۔

ایمان پالیوم الآخر

یوم آخر سے مراد موت کے بعد کی زندگی ہے۔ اسی لئے اس کو حیات آخرت اور دار آخرت بھی کہا گیا ہے۔ قرآن مجید کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جو اس دوسری زندگی کے ذکر سے غالی ہو۔ طرح طرح سے اس کو ذہنی نشین کیا گیا ہے۔ اس کی صداقت پر دلائل قائم کئے گئے ہیں۔ اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ اس پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ اور صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو شخص آخری زندگی پر ایمان نہیں لگا اس کے اعمال غارت ہو جاتے ہیں۔ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أُسُسُهُمْ (الاحزاب: ۷۶) اور قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ (الاحزاب: ۷۷)

حیات آخری کا اعتقاد، جس کو اس شہود کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، بعض ایسے سوالات کا جواب ہے جو فطری طور پر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

چند فطری سوالات

انسان خوشی سے زیادہ غم، اور راحت سے زیادہ تکلیف و مصیبت کو محسوس کرتا ہے۔ اور یہ کچھ فطری بات ہے کہ جو چیز انسان کے حسیات کو جتنی زیادہ ٹھیس لگاتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ اس کی قوت فکر کو حرکت میں لاتی ہے۔ جب کوئی چیز ہم کو حاصل ہوتی ہے تو اس کی خوشی میں ہم بے سوچے کی راحت گوارا نہیں کرتے کہ

کہاں سے آئی؟ کیونکر آئی اور کب تک رہے گی؟ لیکن جب کوئی شے ہم سے کھوئی جاتی ہے تو اس کا مدد ہمارے فوسن فکر کو ایک تازہ راہ نکا دیتا ہے اور ہم سوچتے بگتے رہ کر یہ کہے کھوئی گئی؟ کہاں گئی؟ اب کہاں ہوگی؟ اور کیا یہ نہیں کہیں پھر حاصل ہوگی یا نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ زندگی اور اس کے آثار کا سوال ہم سے اپنے اپنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہمیت موت اور اس کے اہم کے سوال کو حاصل ہے۔ اگرچہ دنیا کی اس تاشاگاہ اور اس میں خود اپنے وجود کو دیکھ کر ہمارے دل میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ کیا ہنگامہ ہے؟ کہے شروع ہو گیا؟ کس نے برپا کر دیا؟ لیکن یہ سب لرست کی باتیں ہیں اور گہری فکر رکھنے والے خواص کو چھوڑ کر عام انسان ان سوالات میں کم اُکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے موت اور اس کی تلخیوں سے ہر شخص کو دوچار ہونا پڑتا ہے، ہر شخص کی زندگی میں بہت سے مواقع ایسے آتے ہیں جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیزوں، دوستوں اور پیاروں کو مرتے دیکھتا ہے جے کس اور کمزور بھی مرتے ہیں۔ طاقت اور ہیبت والے بھی مرتے ہیں۔ حسرت تک موتیں بھی واقع ہوتی ہیں۔ عبرت ناک موتیں بھی پیش آتی ہیں۔ اور آخر میں ہر شخص کو خود اسی راہ پر آجے گزرنے کا تجربہ ہوتا ہے جس پر سب گزرتے ہیں۔ ان مناظر کو دیکھ کر شاید ہی کوئی انسان دنیا میں ایسا ہو جس کے دل میں موت کے سوال نے ایک الجھن نہ پیدا کی ہو، اور جس نے اس امر پر غور نہ کیا ہو کہ یہ موت کیا ہے؟ انسان اس حقائق سے گزر کر آخر کہاں پہنچتا ہے؟ اور اس حقائق کے پیچھے کیا ہے؟ بلکہ کچھ ہے بھی یا نہیں؟

یہ تو ایک عام سوال ہے جس پر حمام اور خواص سب نے خود
 کیا ہے۔ ایک معمولی گمان سے لیکر ایک بڑے فلسفی اور حکیم تک سب
 ہی اس میں لکھے ہیں۔ لیکن اسی ضمن میں بعض اور سوالات بھی ہیں
 جو قریب قریب ہر صاحب فکر آدمی کے دل میں کھٹکتے ہیں، اور
 زندگی کے بہت سے تلخ واقعات اس کھٹک کو اور زیادہ بڑھا
 دیتے ہیں۔ یہ چند ہی کی زندگی جو ہم میں سے ہر شخص کو اس دنیا
 میں ملتی ہے، ہر لمحہ اور ہر گھنٹہ کیسے نہ کیسی کام، کیسی نہ کیسی سستی، اور کیسی
 نہ کیسی حرکت میں بسر ہوتی ہے۔ جس کو ہم سکون سمجھتے ہیں وہ مجھے
 ایک حرکت ہے۔ جس کو ہم بیکاری خیال کہتے ہیں وہ بھی ایک
 کام ہے ان میں سے ہر فعل کا رد فعل، ہر حرکت کی بازگشت، ہر
 کوشش کا ثمرہ، اور ہر سعی کا اہم ضرور ہونا چاہیئے۔ لیکن کاپل ہیک
 اور ہدی کا پھل نما ہونا لازم ہے۔ ابھی کوشش کا اچھا نتیجہ اور نری
 کوشش کا بُرا نتیجہ ظاہر ہونا ضروری ہے۔ مگر کیا ہماری تمام
 کوششوں کے نتائج، تمام مساعی کے ثمرات، تمام افعال کے
 جواب، ہماری اس زندگی میں ہم کو مل جاتے ہیں؟ ایک ہکا بھکا
 تمام عمر شرارتوں میں گزاری۔ بعض شرارتوں کا پھل بلاشبہ اس کو
 دنیا میں مل گیا۔ کسی شرارت نے اسے بیماری میں مبتلا کر دیا۔ کسی
 شرارت نے اس کو تکلیفوں اور مصیبتوں اور پریشانیوں میں پھنسا دیا
 مگر بہت سی شرارتیں ایسی بھی تو رہ گئیں جن کا پھل ابھی ابھی اس کو دنیا
 میں نہ ملا۔ بہت سی شرارتیں ایسی ڈھکی چھپی تھیں کہ ان کی وجہ سے
 اس کی بدنامی اور رسوائی تک نہ ہوئی۔ اور اگر بالفرض بدنامی ہوئی
 بھی تو جس غریب پر اس نے ظلم کیا تھا اس کے نقصان کی کون سی
 تلافی ہوئی؟ پھر کیا اس شریک کے یہ ظلم، اور مظلوموں کے صبر،

سب کے سب بے تجربہ ہی رہیں گے؟ کیا ان کا کوئی انتہام کبھی ظاہر ہی نہ ہو گا؟ یہی حال نیکیوں کا بھی ہے۔ بہت سے نیک انسان عمر بھر نیک کئے رہے، اور ان کا پتہ نہ ہوا، انہیں دُنیا میں نہ ملا۔ بعض نیکیوں پر ان کی انٹی بدنامی اور رُسوائی ہوئی۔ بعض نیکیوں پر وہ ستائے گئے۔ بعض نیکیوں پر انہیں سزائیں ملیں۔ بعض نیکیوں کا حال کبھی دُنیا پر کھلا ہی نہیں۔ پھر کیا ان غریبوں کی سب نیکیاں اِکارت لگیں؟ کیا اتنی سنت محنتوں اور کوششوں کا بہرہ انتہائی ثمرہ کافی ہے کہ انہیں ضمیر کا اطمینان نصیب ہو گیا؟

یہ سوال تو بہرہ اشخاص اور افراد سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اسکے بعد ایک اور سوال انواع اور اجناس اور عناصر اور اس تمام عالم کے اہم سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی مرتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے پھیل جاتا ہے۔ درخت اور جانور سب فنا ہوتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے درخت اور جانور وجود میں آ جاتے ہیں۔ مگر کیا مرتے اور جینے کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا؟ کیا یہ کہیں پہنچ کر ختم نہ ہو گا؟ یہ ہوا، یہ پانی، یہ زمین، یہ روشنی، یہ حرارت، اور یہ قدرتی طاقتیں جن کے ساتھ یہ کارخانہ عالم ایکٹ خاص ڈھنگ پر چل رہا ہے، کیا یہ سب لازوال ہیں؟ کیا ان کے لئے کوئی عمر مقرر نہیں ہے؟ کیا ان کے نظم اور ان کی ترتیب میں کبھی کوئی تغیر واقع نہ ہو گا؟

اسلام نے ان تمام سوالات کو حل کیا ہے، اور حیاتِ اخروی کا اعتقاد دراصل انہی سوالات کا جواب ہے۔ لیکن اس حل اور اس کی صداقت اور اس کے اخلاقی و تمدنی نتائج پر بحث کرنے سے پہلے دیکھنا چاہیئے کہ خود انسان نے ان سوالات کو حل کرنے کی جو کوششیں

دیکھا تھا وہ اسی وقت پیدا ہوا جب میں نے اسے پہچنے دیکھا اور جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو معدوم ہو گیا کیا کوئی صاحب عقل یہ ہے اس قول کو صحیح مان لے گا؟ اگر نہیں تو کوئی صاحب عقل اس قول کو کیسے صحیح مانتا ہے کہ موت کے بعد کی کیفیت چونکہ ہمارے مشاہدے اور تجربے میں نہیں آئی اس لئے موت کے بعد سب سے کوئی بھی کیفیت ہی نہیں ہے

پھر جس طرح موت اور فنا کے متعلق محض حواس پر ہر دوسرے کے حکم لگاتا غلط ہے اسی طرح زندگی اور بقا کے متعلق بھی جو احکام محض حواس کے بل پر لگائے جاتے ہیں ان کا کچھ اعتبار نہیں اگر کارِ خدا عالم کے دائمی اور لازوال ہونے کا حکم محض اس بنا پر لگاتا درست ہے کہ ہم نے اس کو حدیم بدیم ہوتے نہیں دیکھا تو میں بھی ایک مضبوط عمارت کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی، کیونکہ میں نے نہ اس کو گرتے دیکھا ہے اور نہ اس میں کوئی بوسیدگی مجھے نظر آئی ہے جو اس کے کبھی آئندہ گرنے کے پیش گوئی کرتی ہو۔ کیا میرا یہ استدلال ادبائے عقل کی ہانکا دینے سے مقبول ہوگا؟

اخلاق پر انکارِ آخرت کا اثر

فلاسفہ اور حکماء اب قریب قریب اس خیال پر متفق ہو چکے ہیں کہ ایک نہ ایک دن نظامِ عالم ضرور حدیم بدیم ہوگا۔ عالم کی ازلیت اور ابدیت کے قدیم فلسفیانہ نظریے کو ڈھرائے والا شاید الٰہی علم کے جماعت میں کوئی بھی نہیں ہے۔ تاہم ابھی تک موت کو فنا کے محض کہنے والے بہت سے باقی ہیں اور ان کے اس قول کی بنا وہی غیر معقول بات ہے جو ابھی اوپر بیان ہوئی لیکن اس کی غیر معقولیت

سے قطع نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قول سے انسان کو کبھی تسلی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور بہت سے وہ سوالات جو زندگی کے مکالمات کو دیکھ کر دل میں پیدا ہوتے ہیں اس قول میں تشنہ جواب ہی نہ ہاتے ہیں۔ علاوہ بریں اگر انسان کے اخلاق اور اس کی سیرت کی تعمیر اس اعتقاد پر قائم ہو تو یقیناً وہ دو حال سے خالی نہ ہوگی۔ مگر ناموافق ہوں تو اس عقیدے سے ایک شدید قسم کی مایوسی اور بہت جتنی انسان پر طاری ہوگی کیونکہ جب وہ اپنی نکوکاری کا کوئی نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوتے نہ دیکھے گا تو اس کی قوت عمل سرور ٹپھائے گی۔ جب وہ اپنی مظلومی کی داد دے گا کوئی ذریعہ دنیا میں نہ پائے گا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ اور جب وہ شریوں، بدکاروں اور ظالموں کو دنیا میں پھلتے پھوٹتے دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ عالم ہستی میں شر ہی کا بول بالا ہے اور خیر صرف نیا ہی دیکھنے کے لئے ہے۔ بحکایت اس کے اگر حالات موافق ہوں تو اس اعتقاد کے اثر سے انسان ایک نفس پرست حیوان بن جائے گا۔ وہ خیال کرے گا کہ جو دن عیش اور لطف میں بسر ہو جائیں بس وہی نصیب ہیں۔ اگر دنیا کی کسی لذت اور کسی لطف سے محروم رہ گئے تو پھر کوئی زندگی نہیں جس میں اس کی کسر پوری ہو وہ ظلم و ستم کرے گا لوگوں کے حقوق غصب کرے گا۔ اپنے فائدے اور اپنے نفس کی خواہشات کے لئے کوئی بدتر سے بدتر فعل کرنے میں بھی اس کو ہانک نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ نیکی اور شرافت جو ایسے شخص کے تصور میں آ سکتی ہے وہ بس وہی ہے جس کے اظہار سے نیک نامی، شہرت، عزت، یا اور کسی قسم کے دنیوی فائدے حاصل ہو سکیں۔ اسی طرح بدعزت ایسے ہی جرائم کو جرائم اور ایسے ہی گناہوں کو گناہ کہے گا۔ جن کا

نتیجہ کسی دنیوی سزا یا جسمانی عقوبت یا مادی نقصان کی شکل میں ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو۔ رہیں وہ نیکیاں جن کا کوئی نفع اس دنیا میں ظاہر ہونے والا نہ ہو، تو وہ اس کے نزدیک حماقت سے کم نہ ہوں گی اور وہ بُرائیاں جن کا کوئی نقصان اس دنیا میں ماند ہونے والا نہ ہو، وہ اس کے نزدیک بین حساب ہوں گی۔

اگر کہیں پوری سوسائٹی کا نظام اخلاق اسی اعتماد اور اسی دلچسپی پر قائم ہو تو سب سے اس کے اخلاقی تصورات ہی بدل جائیں گے۔ اس کا پورا نظام اخلاق خود غرضی اور نفسانیت کی بنیاد پر تعمیر ہو گا۔ یہی محض دنیوی فائدہ کی ہم معنی ہوگی اور ہر محض دنیوی نقصان کی مترادف ہو کر رہ جائے گی۔ جھوٹ اگر دنیا میں نقصان کا موجب ہو تو گناہ ہوگا، اور فائدہ کا ذریعہ ہو تو بین حساب بن جائے گا۔ صداقت اگر دنیا میں جلب منفعت کا ذریعہ ہو تو نیکی ہوگی، ورنہ بھڑکتا نقصان اس سے بڑھ کر کوئی ہدی نہ ہوگی۔ زنا لذت اور پیش کیلئے مستحسن ہوگی، اور اس میں بُرائی کا پہلو اگر کہیں پیدا ہوگا بھی تو صرف اس وقت جب کہ وہ صحت کے لئے موجب نقصان ہو۔ غرض جہاں اس دنیوی زندگی سے آگے کسی اپنے یا دُکے نتیجے کے مترتب ہونے کا خوف یا امید نہ ہو، وہاں انسان افعال کے صرف انہی نتائج پر نظر رکھے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہونے والے ہیں، اور اچھے سے اعمال کی اخلاقی قدروں میں ایسا تعمیر واقع ہو جائے گا جو ہرگز کسی مہذب انسانی سوسائٹی کے لئے سازگار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایسے اخلاقی معیاروں کے ساتھ کوئی انسانی گروہ جانوروں سے بھی زیادہ بدتر حربے تک گرے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آپ کہیں گے کہ سزا اللہ جزا کے لئے دنیا میں صرف باوی ہمانی نقصانات اور فوائد ہی نہیں بلکہ خود انسان کے اندر بھی ایک قوت موجود ہے جس کا نام ضمیر ہے۔ اس کی ملائیں اور اس کی بے اطمینانی اس دنیا میں ہدی کے لئے کافی سزا میں۔ اور اس کا اطمینان انسان کے لئے نیکی کا کافی معاوضہ ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اول تو بہت سے گناہ ایسے ہیں جن کے باوی فوائد انسان کو ضمیر کی سرزنش برداشت کرنے کے لئے گناہہ کہتے ہیں، اور بہت سی نیکیوں کے لئے انسان کو اتنی قربانی کرنی پڑتی ہے کہ محض ضمیر کا اطمینان ان کا پورا معاوضہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اگر آپ ضمیر کی حقیقت پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کا کام اخلاقی تصورات پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ جو اخلاقی تصورات ایک خاص قسم کی تعلیم و تربیت سے انسان کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں انہی کی تائید ان کا ضمیر کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہندو کا ضمیر جن باتوں پر سرزنش کرتا ہے، ایک مسلمان کا ضمیر ان پر سرزنش نہیں کرتا، پس اگر کسی سوسائٹی کے اخلاقی تصورات بدل جائیں اور خیر و شر کے معیار متغیر ہو جائیں تو ان کے ساتھ ساتھ ضمیر کا رخ بھی پھر جائے گا۔ وہ ان افعال پر سرزنش کرے گا جن کو اب اس سوسائٹی نے گناہ سمجھنا چھوڑ دیا ہے اور نہ ان افعال میں اطمینان محسوس کرے گا جن کو اب یہ سوسائٹی نیکی ہی نہیں سمجھتی۔

نظرِ نظرِ تنازع

دوسری جماعت وہ ہے جس نے تنازع کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ موت کے معنی فنا کے معنی کے نہیں ہیں بلکہ محض تبدیلی جسم کے ہیں۔ لہذا اس جسم سے مفارقت کرنے

کے بعد کوئی دوسرا جسم اختیار کرتی ہے اور وہ دوسرا جسم، یا زیادہ
 صحیح الفاظ میں دوسرا قالب اس قابلیت کی مناسبت سے ہوتا ہے
 جو انسان نے اپنی پہلی زندگی میں اپنے اعمال اور اپنے رجحانات
 سے جہم پہنچائی ہے۔ اگر اس کے افعال بُرے رہے ہیں اور ان
 کے اثر سے اس کے نفس میں بُری قابلیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ تو
 اس کی زندگی اسی درجہ کی حیوانی یا نباتی طبقات میں چلی جائے گی،
 اور اگر اچھے اعمال سے اچھی قابلیتیں اس نے جہم پہنچائی ہیں تو
 زندگی اعلیٰ طبقات کی طرف ترقی کرے گی۔ غرض اس نظریہ کی زندگی
 جہاں اور سزا جو کچھ بھی ہے اس دنیا اور انہی اجسام کے عالم میں
 ہے۔ ارواح بار بار اسی دنیا میں قالب بدل بدل کر آتی ہیں۔ بلکہ
 اپنے پچھلے اعمال کے نتائج بھگتیں۔

یہ نظریہ ایک زمانہ میں بہت مقبول رہا ہے۔ یونان میں مسیح
 سے کئی صدی قبل قیماطحت اور آئینڈ قلس وغیرہ اس کے قائل تھے
 روم میں بھی مسیحیت سے پہلے اس کا پرچا تھا۔ مصر کی قدیم تاریخ میں
 بھی اس کے کچھ آثار پائے جاتے ہیں۔ یہودیوں میں بھی یہ نظریہ
 اثرات سے تئیس کا عقیدہ داخل ہو گیا تھا۔ لیکن اب یہ اعتقاد یا تو
 تو ہندی الاصل لہا سب (برہمنیت، بودھ مت، جین مت وغیرہ)
 میں پایا جاتا ہے، یا پھر مغربی افریقہ، جنوبی افریقہ، مڈغاسکر،
 وسطی ایشیاء، انڈونیشیا، اوشیانیا، شمالی و جنوبی امریکہ وغیرہ کی
 وحشی یا نیم وحشی قوموں میں۔ باقی تمام مہذب قومیں اس کو رد کر چکی
 ہیں، کیونکہ انسان نے اب تک علم و عقل کی ترقی سے دنیا اور اس
 کی زندگی کے متعلق جس قدر واقفیت جہم پہنچائی ہے وہ ان تمام
 نظریات کی تردید کرتی ہے جن پر نظریہ تئیس کی بنا قائم ہے۔ خود

ہندی الاصل مذاہب میں بھی جب ہم اس نظریہ کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ویدک ہندوستان میں یہ تخیل سب سے موجود ہی نہ تھا۔ اُس زمانہ کے آریوں کا عقیدہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد انسان کو ایک دوسری زندگی ملتی ہے جو نیکو کاروں کے لیے سراسر راحت اور بدکاروں کے لیے سراسر طبیعت ہے اس کے بعد دفعۃً اس نظریہ میں تغیر واقع ہوتا ہے، اور دوسرے دور کے ہندوستانی لٹریچر میں ہم کو وہ کٹا ٹیٹا ملتی ہیں جن میں تنازع کا نظریہ ایک فلسفیانہ اعتقاد کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ اس تغیر کا سبب اچھا نہ سمجھ سکتے ہیں جو ممکن ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ تخیل آریوں میں دراوڑ قوموں سے لیا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ خود آریوں کے اپنی طبقتوں میں موجود تھا، اور انہی سے بعد کے یزہن فلسفیوں نے اس کو لے کر تخیلات اور قیاسات کی ایک پوری عمارت اس پر قائم کر دی۔ اسی طرح بودھ مذہب بھی ابتداً تنازع کی اس منسل اسکیم سے بنی تھا جو بعد کے بودھی لٹریچر میں پائی جاتی ہے۔ جہاں تک قدیم لٹریچر سے پتہ چلتا ہے، ابتداً ان بودھ دھرم کا نظریہ یہ تھا کہ وجود ایک چیز ہے جو مسلسل تغیر اور انقلاب کی شان سے بہتا چلا ہوا ہے۔ اسی تخیل نے آگے چل کر موت اختیار کی کہ نام عالم کی ایک ہی نوع اور مقام عالم میں ایک ہی وجود ہے جو صورتوں پر غصہ نہیں اور قالب پر قالب بدلتا ہوا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابتداً میں وہی والہام کے حلقے سے ہندی قوموں کو جو علم حاصل ہوا تھا اس کو انہوں نے بدل کر ایک ایسا فلسفیانہ مذہب ایجاد کر لیا جو محض ان کی اپنی اوج کا نتیجہ تھا۔

عقلی تنقید

یہاں تھاج کے مسئلہ پر بھی عقل بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ مگر اس کی عقلی واضح کرنے کے لئے اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ عقیدہ تھاج کی بنیاد ایسے نظریات پر ہے جو مرتج عقل کے خلاف ہیں۔ اور ان تمام علوم کے منافی ہیں جو انسان کو دنیا اور اس کی زندگی پر خود و غرض کرنے سے حاصل ہوئے ہیں۔ اہل تھاج کا خیال ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا نتیجہ اسی دنیا میں اس طرح ملتا ہے کہ وہ اپنے اپنے اعمال کی بدولت زندگی کے اعلیٰ طبقات کی طرف صعود کرتا ہے اور بُرے اعمال کی بدولت اونچی طبقات کی طرف اتر جاتا ہے۔ مثلاً اگر انسان نے اس زندگی میں بُرے عمل کیے۔ تو وہ حیوانی اور نہائی طبقات کی طرف نزول کرے گا۔ اور اگر حیوان نے اپنی زندگی میں اچھے عمل کیے تو وہ انسانی طبقات کی طرف صعود کرے گا۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ حیوانی اور نہائی زندگی کے نتیجہ میں انسانی زندگی کے بُرے اعمال کا، اور انسانی زندگی کے نتیجہ میں حیوانی اور نہائی زندگی کے اچھے اعمال کا۔ بالفاظ دیگر اس وقت جو انسان ہیں وہ اس لئے انسان ہیں کہ پہلے انہوں نے نہائی اور حیوانی زندگی میں اچھے اعمال کیے تھے۔ اور اس وقت جو نہائت اور حیوانات ہیں وہ اس لئے ایسے ہیں کہ انہوں نے انسانی زندگی میں بُرے اعمال کیے تھے۔ اس نظریہ کو ماننے کے لئے ہمہ اور باتوں کا ماننا ضروری ہے اور وہ سب بطور عقل کے خلاف ہیں۔ مثلاً

۱۔ تھاج کا یہ پیکر ایسا ہے جیسا کہ کوئی آواز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ انسان ہونے کے لئے لازم ہے کہ اس سے پہلے نہایت اور حیوان

ہو اور نہات اور حیوان ہونے کے لئے لازم ہے کہ ان سے پہلے انسان ہو۔ یہ کھلا ہوا حقد ہے جس کو عقل محال قرار دیتی ہے۔

۲۔ اگر تاج کا پکڑ اتلی اور ابدی ہے تو ماننا پڑے گا کہ نہ صرف وہ ابدی ہو بار بار قالب بدلتی ہیں، بلکہ وہ مادے بھی جو ان ابدی کو قالب مہیا کرتے ہیں، اتلی اور ابدی ہوں، اور یہ زمین اور سپہ نظام شمسی اور یہ قوتیں جو اس نظام میں کام کر رہی ہیں، یہ سب بھی اتلی اور ابدی ہوں۔ لیکن عقل کا دعویٰ ہے اور علمی تحقیقات اس پر شہادت دیتی ہیں کہ ہمارا نظام شمسی نہ اتلی ہے اور نہ ابدی۔

۳۔ ماننا پڑے گا کہ نہات اور حیوانات اور نوع بشر کی جتنی امتیازی خصوصیات ہیں وہ سب دراصل ان کے اجسام کے خاصے ہیں نہ کہ نفوس کے۔ اس لئے کہ جو نفس انسان کے قالب میں عقل بکری قوتیں رکھتا تھا وہ حیوان کے قالب میں پہنچ کر لایسکل ہو گیا۔ اور باقی قالب میں پہنچ کر اس غریب سے حرکت ادروی کی قوت بھی سلب ہو گئی۔

۴۔ نیک اور بد کا اطلاق دراصل ان اعمال پر ہوتا ہے جو سوچ سمجھ کر بالارادہ کئے جاتیں۔ اس لحاظ سے انسان کے اعمال تو نیک اور بد ہو سکتے ہیں اور ان پر جزا و سزا مرتب ہو سکتی ہے۔ لیکن نہات اور حیوانات کے اعمال پر نہ تو نیک اور بدی کا اطلاق جائز ہے اور نہ ان پر جزا و سزا مرتب ہونے کی کوئی معقول وجہ ہے ایسا حکم لگانے کے لئے یہ ماننا ضروری ہوگا کہ نہات اور حیوانات میں بھی سوچ سمجھ کر بالارادہ فعل کرنے کی قوت ہے۔

۵۔ اگر بعد کی زندگی ہمارے موجودہ جنم کے کرموں کا پھل ہے تو ظاہر ہے کہ بُرے کرموں کا پھل بُرا ہی ہونا چاہیئے اور جب دوسرے

جنم میں وہ بُرا پھل ہم کو ملا تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اس بُرے پھل سے نیکٹ احوال صادر ہوں؟ لہذا خدا اس سے بُرے ہی احوال صادر ہوں گے، اور پھر ان کا پھل تیسرے جنم میں بھی زیادہ بُرا ہو گا۔ اس طرح بدکار انسان کی روح تناسخ کے پکر میں نیچے سے نیچے طبقتوں کی طرف ہی گرتی چلی جائے گی۔ اس کے پھر ابھر کر آنے کی کبھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ انسان سے حیوان تو بن سکتا ہے مگر حیوان سے انسان بننا غیر ممکن ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جو لوگ اس وقت انسان ہیں وہ کبس عین عمل کے نتیجے میں انسان ہوئے اور کہاں سے آئے؟

تمدن پر عقیدہ تناسخ کا اثر

ان کے علاوہ اور بہت سے دعوہ ہیں جنکی بنا پر عقل سلیم تناسخ کے اعتقاد کو قبول نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان عقل اور علم میں جتنی جتنی ترقی کرتا گیا، تناسخ کا اعتقاد باطل ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ اب وہ زیادہ تر ان قوموں میں باقی رہ گیا ہے جو عقل اور علمی ترقی میں بہت پسماندہ ہیں۔ اس کے ساتھ یہ سمجھنے ایک حقیقت ہے کہ تناسخ کا اعتقاد بہتوں کو بہت کرنے والا اور ترقی کی روح کو مردہ کرنے والا اعتقاد ہے۔ اسی اعتقاد سے "ہنسنا" کا عقیدہ نکلا ہے جو انسان کی شخصی اور قومی زندگی کے لئے سدِ درجہ ہلکتہ ہے۔ جو قوم اس عقیدہ کی قائل ہو اس کی جسمانی اہمیت فنا ہو جاتی ہے۔ اس کی جہانی قوتیں منسل ہو جاتی ہیں۔ وہ قوائے جہانی کو نشوونما دینے والی بہترین قوتوں سے محروم

ہو جاتی ہے۔ اس کے افراد نہ صرف جہانی اقتدار سے کمزور بلکہ
دماغی قوتوں کے لحاظ سے بھی ضعیف ہوتے ہیں۔ اس دور کے
ضعف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم مغلوب و محکوم ہو کر رہتی ہے
اور آخر کار یا تو صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے یا دوسری طاقتور
قوموں میں جذب ہو جاتی ہے۔

معیارِ تناسخ کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ وہ تمدن و تہذیب کا
دشمن ہے اور انسان کو ریاضیت اور ترک دنیا کی طرف لے جاتا
ہے۔ اہل تناسخ کا اعتقاد ہے کہ نوح کو جو چیز گناہوں سے گودہ
کرتی ہے وہ خواہش ہے۔ اسی کی بدولت نوح کو بار بار سماں
قابو میں آکر اپنے اعمال کے تناسخ بھگتنے پڑتے ہیں۔ اگر انسان
خواہشات کو پامال کر دے اور اپنے آپ کو دنیا اور اس کے
دعوتوں میں نہ پھنساے تو اس کی نوح کو آواگون کے چکر سے
نجات مل سکتی ہے، اور نجات کی پس بھی ایک شہوت ہے۔
کیونکہ دنیوی زندگی کے معاملات میں پھنسنے کے بعد انسان کا
خواہشات اور ان کے مقتضیات سے پرکھنا محال ہے۔ اس کا
لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ نجات کے طالب ہوں۔ وہ دنیا کی ان
گر جگہوں اور پہاڑوں میں جائیں، اور جو ایسا نہ کریں وہ نجات
سے محروم ہو کر جانوروں اور وحشوں کے طبقات میں جانے کے
لئے مستعد ہو جائیں۔ کیا یہ عقلِ تمدن و تہذیب کی ترقی میں کسی
طرح مددگار ہو سکتا ہے؟ اور کیا کوئی قوم یہ اعتقاد کہ دنیا میں
ترقی کر سکتی ہے؟

اس میں شک نہیں کہ بعض جمہوریت سے تناسخ کا اعتقاد کم از
کم اس سے بہتر ہے کہ موت کو قتلے محض اور قدم مطلق سمجھا

ہائے۔ کیونکہ انسان میں بنائے دوام کی جو ایک فطری خواہش ہے وہ تنازع میں ایک حد تک تسکین پا سکتی ہے۔ اور اس کے ساتھ اس عقیدہ میں جوا و سزا اور اعمال کے لیے اور بُرے انعام کا جو تخیل موجود ہے، اس کی بنا پر یہ ایک اچھے اور مضبوط اخلاقی قانون کے لیے پشتہ بناہ بھی بن سکتا ہے۔ لیکن اقل تو یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے جس کی طرف ہم بالدار اشارہ کر چکے ہیں کہ جو عقیدہ عقل اور علم کے خلاف اور تمدن و تہذیب کی ترقی میں مانع و مزاحم ہو، اس کی گرفت انسان کے دل و دماغ پر کبھی ایسی مضبوط نہیں ہو سکتی کہ وہ عقلی ارتقار کے ہر مرتبہ اور ترقی تہذیب و تمدن کے ہر مرحلے میں یکساں قوت کے ساتھ قائم رہ سکے۔ اور جب اس کی گرفت قائم ہی نہیں رہ سکتی تو اس عقیدہ کا محض کتابوں میں ایک فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت سے موجود رہنا نظام اخلاق کے بقا و استحکام کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تو اس شدت میں نافع ہو گا جب کہ وہ کتابوں کے بہائے دلوں میں محکم ہو اور لوگ پوری طسوج اس پر اعتماد رکھتے ہوں۔ دوسرے یہ عقیدہ اپنے آخری تیر کے اعتبار سے اپنی اخلاقی قوت بھی کھو رہا ہے کیونکہ جب کبھی شخص کو یہ یقین ہو کہ تنازع کا چکر یا کل ایک مشین کی طرح چل رہا ہے، اور اس میں ہر فصل کا جو نتیجہ مقر رہے وہ ظاہر ہو کر رہے گا، اور کسی توبہ و استغفار یا کفارے سے اس فصل کی تاثیر اور اس کے نتیجہ کو نہیں بدلا جاسکتا، تو ایک دفعہ گناہ کرنے کے بعد ایسا شخص ہمیشہ کے لیے گناہ کے پیر میں آہائے گا، اور بھولے گا کہ جب مجھے جانور یا درخت بنا ہی ہے تو کیوں نہ میں اس انسانی خون کی ہم لذتوں سے دل بھر کر فائدہ اٹھا لوں۔

حیاتِ اخروی کا عقیدہ

دنیا اور انسان کے انتہام پر دو مذہبوں کی رائیں آپس میں چلے ہیں اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ دونوں مذہب بدعتاً صحیح ہیں، نہ ان فطری سوالات کا پتھا پتھا اور دل کو مطمئن کرنے والا جواب دیتے ہیں جو دنیا میں زوال و فنا کے آثار کو دیکھ کر ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، اور نہ ان میں یہ صلاحیت ہے کہ ایک صحیح اور مضبوط اور اخلاقی نظام کے لئے پشت پناہ بن سکیں اب تیسرے مذہب کا بیان کرتے ہیں وہ کہتا ہے۔

۱۔ جس طرح دنیا کی ہر چیز فرداً فرداً اپنی ایک عمر رکھتی ہے، جس کے ختم ہو جانے کے بعد اس میں فساد رونما ہو جاتا ہے، اسی طرح اس پورے نظامِ عالم کی بھی ایک عمر ہے جس کے تمام ہونے پر یہ سارا کارخانہ درہم درہم ہو جائے گا، اور کوئی دوسرا نظام اس کی جگہ لے گا جس کے قوانین طبعی اس نظام کے قوانین طبعی سے مختلف ہوں گے۔

۲۔ اس نظام کے درہم درہم ہونے پر اللہ تعالیٰ عدالت قائم فرمائے گا جس میں ہر چیز کا حساب لیا جائے گا۔ انسان کو اس روز پھر ایک نئی جسمانی زندگی ملے گی۔ وہ اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو گا۔ اس کے تمام اعمال، جو اس نے اپنی پہلی زندگی میں انجام دیئے تھے، ٹھیک ٹھیک جانچے اور تولدے جائیں گے۔ حق اور انصاف کے ساتھ اس کے خدے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اچھے اعمال کی ابھی جزا ملے گی اور بُرے اعمال کی بُری سزا دی جائے گی۔

۳۔ انسان کی دنیوی زندگی حاصل اس کی اخروی زندگی کا مقدمہ ہے۔ یہ زندگی ماضی ہے اور وہ چاندیار۔ یہ ناقص ہے اور وہ کامل

تمام احوال کے چوبے چوبے نتائج اس ماضی زندگی میں مرتب نہیں ہوتے۔ ہر نیا جہیز ہوا جہاز ہے اپنے فطری ثمرات کے ساتھ اس ناقص زندگی میں بارگاہ نہیں ہو سکتا۔ اس نقص کی تکمیل اُسے دوسری زندگی میں ہوگی، اور جو کچھ یہاں ہے نتیجہ اور بے ثمرہ گیا ہے وہ اپنے حقیقی نتائج اور ثمرات کے ساتھ وہاں ظاہر ہوگا۔ لہذا انسان کو اپنے احوال و افعال کے محض اُن نتائج اور بنیاد و ثمرات دھوکہ دینے والے نتائج ہی پر نظر نہ رکھنی چاہیئے جو اس دنیوی زندگی میں مرتب ہوتے ہیں، اور نتائج کے اس مکمل سلسلہ کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے افعال کی قدریں متعین کرنی چاہئیں۔

یہ وہ مذہب ہے جسے انبیاءِ طہیم السلام نے پیش کیا ہے اور قرآن مجید اسی مذہب کا پُر زور وکیل ہے۔ مگر قبل اس کے کہ ہم اس مذہب کے اخلاقی نتائج اور تہذیبِ اسلامی میں اس کے شعبے اور اہمیت پر کلام کریں، ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس مذہب کے دلائل کیا ہیں؟ اور اصل کہاں تک اس کو قبول کرتی ہے؟

عقلی تحقیق کا صحیح طریقہ

یہ سوال کہ موت کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں، اُن امور سے تعلق رکھتا ہے جو ہماری حواس اور حتیٰ تجربہ کی محدود سے باہر ہیں۔ ہم جو کچھ غسویٰ کہتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ ایک شخص جو چند لمحوں تک سانس لیتا اور اپنے ارادہ سے حرکت کرتا تھا وہ اب زندگی کے تمام آثار سے محروم ہو گیا، اور اس کے جسم سے کوئی ایسی شے غائب ہو گئی جس نے اس ہمارے، غیر مادی، غیر متحرک مادے کو نوا اور حرکت کی قوت مہیا کر رکھی تھی۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ شے کہاں چلی گئی؟ جسم سے الگ ہو کر بھی موجود ہے یا

معدوم ہوگئی ہے اور پھر کہیں اس جسم یا ایسے ہی کسی اور جسم سے اس کا تعلق دوبارہ قائم ہو گا یا نہیں؟ تو جہاں تک ہمارے حواس اور تجربی علم کا تعلق ہے، ہم اس سوال کا نیا یا اٹھانا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اس چیز کوئی نفس نہ ہم نے پہلے کبھی محسوس کیا تھا اور نہ اب محسوس کرتے ہیں۔ اس بنا پر یہ بات پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے کہ اس سوال کا سائنس، یعنی سکتہ ثقلی یا تجربی علم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سائنس اگر اس پر اٹھانا کوئی حکم نہیں نکال سکتا تو نیا ہی کوئی حکم نکالنے کا حق نہیں رکھتا۔ وہ صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ ”میں کچھ نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے۔“ لیکن اگر وہ خاص لا ادریت کے مقام سے ہٹ کر یہ کہے کہ ”چونکہ میں نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے اس لئے میں جانتا ہوں کہ مرنے کے بعد کچھ بھی نہیں ہوتا۔“ تو یقیناً معقولیت کی حدود سے تجاوز کر جانے لگا۔

حواس کے بعد ہمارے پاس علم کا وہ سراو ہے ”فکر“ ہے۔ انسان ہمیشہ اپنے آپ کو عسومات کے دائرے میں مقید رکھنے سے انکار کرتا رہا ہے، اور اس کی بشری فطرت کا مقتضار یہی ہے کہ وہ غور و فکر کی قوتوں سے کام لے کر ان پوشیدہ حقیقتوں کو معلوم کرے جو عسومات سے اوجھڑا ہیں۔ اسی فکری جستجو کا نام ”فکر“ ہے اور اس کے دو طریقے ہیں۔

ایک یہ کہ تم کو کیا اور خود اپنے نفس کے افکار و شواہد سے آنکھیں بند کر کے، یا ایک بڑی مدد تک ہے پروا ہو کر، غائب عقل مقدمات سے نتائج اخذ کرنا شروع کرو، اور آخر تک عقل کے گوشے دوڑاتے چلے جاؤ۔ یہ خاص قیاسی فلسفے کا میدان ہے، اور تمام مگر اصول

کی جو لا نگاہ۔ یہی اندھیری منزل ہے۔ ہمیں سے وہ فلسفیانہ مباحث بچنے میں جن میں اُلجھ کر انسان حقیقت کی قادیوں میں بھٹکا چلا جاتا ہے۔ ہمیں سے خدا اور ملائکہ اور نظام عالم اور حیات بعد الموت کے متعلق وہ مختلف اور متضاد عقیدے نکلتے ہیں جو محض اندھیرے میں ٹٹولنے اور وہم و گمان اور غرض و تھیں پر پھٹنے کا نتیجہ ہیں۔

دوسرا طریقہ فکر یہ ہے کہ تم آنکھیں کھول کر کائنات میں اور خود اپنے نفس میں ان آثار کا مشاہدہ کرو جو منزل حقیقت کے مشعلِ خدا ہیں، اور ان چراغوں کو لے کر حقیقی سلیم و فکر صحیح کی مدد سے ان حقیقتوں تک پہنچو جو ان آثار کی نشانی ہیں۔ اس دوسرے طریقے میں سائنس اور فلسفہ دونوں مل کر پھٹتے ہیں۔ اگرچہ حقیقت تک پہنچنے کا یقینی ذریعہ یہ بھی نہیں ہے۔ لیکن آسمانی ہدایت سے قطع نظر کہ انسان کے پاس حقیقتِ حقیقی کا فائدہ دیر نہیں ہے، اور اسے دیر سے حقیقت تک نہ آیا اس کے قریب تک پہنچنا ممکن ہے، بشرطیکہ انسان کی قوتِ مشاہدہ تیز ہو، اس کی ادراکی قوتیں لطیف اور تازہ ہوں، اور اس میں خود فکر کی کافی صلاحیت موجود ہو۔ حکمتِ نظری میں انسان کی ترقی کا مدار اسی مشاہدہ اور فکر کی آمیزش پر ہے۔ آج جن نظریات پر حکمت کی بنیاد قائم ہے اور جن اصولوں پر ایمان لائے بغیر سائنس کا کوئی طالب علم ایک قدم بھی بڑھنے نہیں دے سکتا، ان میں سے کوئی بھی محض تجربے اور مشاہدہ پر مبنی نہیں ہے۔ ہر نظریے اور ہر اصول کی بنیاد اس قیاسی عقل پر قائم ہے جس کے لئے مشاہدات و تجربات کو موادِ قیاس کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ قانونِ فطرت، قانونِ مذہب و شش، سلسلہ علت و معلول، نظریہ اضافیت، قانونِ نشو و ارتقاء، قانونِ انتخابِ طبیعی اور ایسے ہی دوسرے

اُصول و قوانین جن پر ٹرے ٹرے الہی حکمت ایمان لانے میں سب کے سب آثار و مظاہر کے مشاہدات پر خود فکر اور عقلی قیاس آزمائی کے استعمال کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ آج تک کسی نے بھی ان قوانین اور ان اُصول کا حقیقی مشاہدہ نہیں کیا ہے

پھر جو نتائج ایک حکیم اپنے مشاہدے اور قیاس سے مستنبط کرتا ہے ان پر اسے اتنا ہی یقین ہوتا ہے جتنا کسی عانی کو کچھ شے کے حقیقی مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود کوئی ٹرے سے ٹرا حکیم جس کسی منکر کو ان نتائج کے مان لینے پر مجبور نہیں کر سکتا، کیونکہ جب تک کوئی شخص آثار و مظاہر کا اس خاص نظریے مشاہدہ نہ کرے جس سے حکیم نے مشاہدہ کیا ہے، اور اسی خود فکر سے کام نہ لے جس سے حکیم نے کام لیا ہے، وہ ان نتائج پر کسی طرح یقین نہیں پہنچ سکتا۔ ایک عانی کے لیے حکمت میں قدم رکھنے اور ترقی کرنے کی یہی سہی صورت ممکن ہے کہ وہ جس حکیم کی دانائی و بصیرت پر اعتماد رکھتا ہو اس کے اخذ کردہ نتائج پر ایمان بالغیب لے گئے، بغیر اس کے کہ وہ خود اپنے مشاہدہ اور اپنے خود فکر سے ان نتائج تک پہنچا ہو۔

یہ مقدمہ ذہنی نشیں کر لیجئے، کیونکہ امور ماوراء طبیعت کے باب میں قرآن مجید کے بیان اور استدلال کو سمجھنے کے لیے اسے مقدمہ کو کچھ لینا ضروری ہے۔ بہت سی غلط فہمیاں اسی کے سنہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہیں۔

اب ہم کو حیات اخروی کے متعلق قرآن مجید کے بیان کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

حیاتِ آخری پر منکرین کا اعتراض

حیاتِ آخری کا اعتقاد جب قرآن مجید نے پیش کیا تو اس کے خلاف اس وقت کے منکرین نے جو اعتراض کیا تھا وہ وہی تھا جو آج کے منکرین کہتے ہیں۔ اور وہ حقیقت اس پر بھی ایک اعتراض ممکن تھا ہے۔ یعنی یہ کہ مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا ایک جہدِ قہر کا قیاس ہوتا ہے، ہم کس طرح مان میں کہ جو مرنے کے بعد زمین میں گل سڑ گئے، جن کے جسم خاک میں ملی گئے، جن کے اعضاء ہم ہوا اور زمین اور پانی میں منتشر ہو گئے ان کو پھر زندگی میسر ہوگی؟

وَمَا لَوْ آذَأْزَأْنَا فِي الْأَرْضِ عِزًّا لَوْ تَخَلَّى

جہدِ قہر (المجادہ - ۱)

”اور انہوں نے کہا کہ ہم ہم زمین میں کم ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر نئے جسم سے پیدا ہوں گے؟“

وَمَا لَوْ آذَأْزَأْنَا الْكُفَّاءَ مِمَّنْ فَتَذَرُ الْكَاذِبُونَ

خلفائے جہدِ قہر (النحل - ۵)

”اور انہوں نے کہا کہ جب گل سڑ کر مٹی بن جائے تو کیا ہم پھر نئے جسم سے پیدا ہوں گے؟“

وَإِذَا أَمْنًا لَّكُم مَّا تَكْتُمُونَ فِي الْأَرْضِ وَتُمْسِكُونَ بِآَمِنٍ غَلِيظٍ

(قہر - ۱)

”کیا جب ہم مرکز مٹی میں ہائیں گے تو پھر ہی اٹھیں گے؟“

”ہاں تو یہی ان کا حال ہے۔“

مَنْ يَتَّقِ الْعَذَابَ فَأُنْزِلْ لَهُ كُفًّا (نمل - ۵)

”جو اللہ سے ڈرے گا وہ کفر کا کھنڈر بن جائے گا۔“

بچے ہوں؟

قرآن مجید کا طرز استدلال

اس شبہ کے مقابلہ میں قرآن مجید نے جو طرز استدلال اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ قدس الجی کے آثار کا مشاہدہ کرنے اور ان پر غور کرنے کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّنا فِي الْأَفَاقِ وَفِي السَّمَاوَاتِ
عَلَى يَتَّبِعِينَ لَهْفًا شَدِيدًا الْحَقُّ - (طہ اسجد - ۶)

”تم ان کو آفاق میں اور خود ان کے اپنے نفوس میں اپنے نشانیاں دکھانے کے تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہی حق ہے۔“
أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَن لَّهُمُ الْكُتُوبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ -
(احزاب - ۲۳)

”کیا وہ آسمانوں اور زمین کے احکام پر غور نہیں کرتے؟“
وَلَا يَتَذَكَّرُونَ أَلَمْ يَكُنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
يُسَبِّحُونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ -

(یوسف - ۱۲)

”آسمانوں اور زمین کی کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر اسے وہ

اس طرح گدہ جاتے ہیں کہ ان پر غور ہی نہیں کرتے۔“

یہ اشارہ ہے اس طرف کہ تم کو اپنی قوت تو نہیں دی گئی ہے کہ جو چیز تمہارے حواس سے پوشیدہ ہے اس کو تم برائی العین مشاہدہ کر سکو، یا کسی تجربہ سے اس کی حقیقت معلوم کر سکو۔ البتہ اگر تم آنکھیں کھول کر اُن آثار کو دیکھو جو شب و روز تمہارے سامنے پیش ہو رہے ہیں، اور زمین و آسمان کے احکام کا مشاہدہ کرو، اور

تو اپنے نفس کی پیدائش پر غور کرو، اور ان سب سموات و مشاہدات پر
غور و فکر کے تحت تک پہنچنے کی کوشش کرو، تو تم کو معلوم ہو جائے گا
کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ درست ہے
حیاتِ آخری کا امکان

پھر وہ انہی اکلاد و مظاہر میں سے ان چیزوں کو پیش کرتا ہے
جو سب سے زیادہ بدہی میں، اور ان سے یہ استدلال کرتا ہے
کہ جس بات کو تم بعید از عقل و قیاس سمجھ رہے ہو، وہ چاہے
تمہاری عقل و قیاس سے دُور ہو، مگر حقیقت میں ناممکن نہیں
ہے۔

أَلَمْ يَخْلُقْنَا كَمَا نَسْتَوِي عَلَى الْعَرْشِ وَنَحْنُ أَشْفَقُ
وَالْعَمْرُ كُلٌّ يَجُوزُنِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى يُدِيرُ الْأَمْرَ
يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ بَلَاغًا مِّنْهُ تَذَكَّرُونَ۔

(الروم: ۱)

”وہ اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں کو ایسے ستاروں کے
بیروں میں رکھا ہے جو تم کو نظر آسکیں۔ پھر وہ عرش پر جلو فرما
تو، اور اس نے صبح اور چاند کو اپنا کلمہ فرمایا۔ ان میں
سے ہر ایک ایک قدرتِ مقربہ تک کے لئے حرکت کر رہا ہے
وہی تمام عالم کا انتظام کرتا ہے اور وہ اپنی نشانیاں کھول کر بیان
کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی علامات پر یقین لادو۔“

وَأَنزَلْنَا أَشِدُّهُنَّ خَلْقًا أَمْرًا الشَّامُ بَنَاهَا۔

(الزمر: ۲)

”ایک تہا پیداکرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا بننا۔“

تو (ایسی ٹری چیز) کو نکالنا ہے۔

یہ اجرام سماوی کے انکار سے استہداد ہے کہ جس خدا نے
 اتنا بڑا نظام کائنات پیدا کیا ہے، جس نے ٹپے ٹپے ستاروں
 کو اپنے قانون کی بندشوں میں پکڑ رکھا ہے، جس کی قدرت ہاں عظیم
 اجرام کو اس نظام کے ساتھ حرکت دے رہی ہے کہ کوئی جرم
 اپنے مدار سے بال برابر تجاوز نہیں کر سکتا، نہ اپنے مقرّبہ اوقات
 سے ہل بھر کیے ہٹ سکتا ہے، اور جس طاقت نے کائنات کے
 طبقوں کو ایسے غریب اور غیر محسوس سہاروں پر قائم کیا ہے۔ جن کے
 اور اک سے تم عاجز ہو، اُس خدا کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ تم
 جیسی حقیر مخلوق کو ایک دفعہ ہلاک کر کے دوبارہ زندہ کرنے پر
 قادر نہیں ہے، کیسی ٹری غامض خیال ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللَّهَ الْبَاقِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
 وَالْاَرْضَ مِنْ تَابِعٍ عَلٰى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ۔

(یعنی اسرائیل۔ ۱۰)

”کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو
 پیدا کیا ہے وہ ان جیسوں کو بھی پیدا کرنے پر قادر ہے۔“
 آسمان کے بعد وہ ہمارے قریب ترین ماحول، یعنی زمین کے
 انکار کی طرف ہم کو متوجہ کرتا ہے۔

بَسْمِ زَوَاۤىِٕ السَّمٰوٰتِ فَانظُرُوْا كَيْفَ يَخْلُقُ
 الْخَلْقَ ثُمَّ اِلٰهًا يَنْشِئُ النَّسَاۤءَ الْاُخْرٰى فَاِنَّ اللَّهَ
 عَلٰى كُلِّ شَيْۡءٍ قَدِيْرٌ۔ (المکوت۔ ۲)

”زمین کی سیر کرو اور دیکھو کہ اللہ نے کس طرح آفرینش کی
 ابتداء کی ہے اور پھر وہی اللہ چیزوں کو دوبارہ زندگی بخشتا ہے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ یُزِیْرُوْنَ قَادِسٌ ۝

وَإِیْنَمَا لَکُمُ الْأَرْضُ الْمُنْتَهٰۤی اٰخِیْنٰہَا

وَآخِرُ جَنَآئِمِہَا حَبِطَ لِیَسْئَلُہٗ یَا کٰفِرُوْنَ (نہم۔ ۲)

”اور ان کے لیے ایک نشان تو مردہ زمین ہی ہے جس کو ہم نے زندگی بخشی اور اس سے علائقہ ایسے لوگ کھاتے

ہیں ۝

فَاَنْظُرْ اِلٰی اَکْثَارِ رَحْمَۃِ اللّٰہِ کَیْفَ تَحِیُّ الْاَرْضَ

بَعْدَ مَوْتِہَا اِنَّ ذٰلِکَ لَمَعْنِ الْمَوْتٰی وَهُوَ عَلٰی کُلِّ

شَیْءٍ قَدِیْرٌ (الہوم۔ ۵)

”پھر اللہ کی رحمت کے آثار دیکھ کہ کس طرح زمین کو مردہ

بہا لے کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً وہ ضرور مردوں کو بھی

زندگی عطا کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ۝

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ اَنْ یَّخْلُقَ شَیْءًا اَلَّا تَرَہٗ مِنْ شَیْءٍ

قَدَآءَ اَنْ تَرَ لَہٗا اَلَّا تَرَہٗ تُزٰیۡرُ وَتَمِیۡتُ اِنَّ الْاٰدَمِیۡنَ

اٰخِیَآہَا لَمَعْنِ الْمَوْتٰی اِنَّہٗا عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

(علم السیرۃ۔ ۵)

”اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو

دیکھتا ہے کہ سُوتی پڑی ہے۔ پھر جہاں ہم نے پانی برسایا اور

وہ بھیگ اُٹھی اور پہاڑ لے گئی۔ تو ہم نے اس کو زندہ کیا

وہی مردوں کو بھی زندہ کرنے والا ہے یقیناً وہ ہر چیز پر

قادر ہے ۝

وَاللّٰہُ الَّذِیْ مِنْ اَمْرِہٖ سَلَّ الْوِیْلَیۡنِ فَتُشِیۡرُ

سَخَابًا مُّغْتَلِبًا اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاٰخِیۡنَا

بِهِ الْآرْضُ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذَٰلِكَ النُّشُورُ۔

(قاطر-۲)

”اور وہ اُٹھ رہی ہے جو ہواؤں کو چلا ہے، پھر وہ بادلوں کو اُبار رہی ہیں، پھر ہم ان بادلوں کو ایسی بستی کی طرف لے گئے ہیں جو بے آب و گیاہ پڑی ہے، پھر اس مرنے پڑی ہوئی زمین کو بارش کے ذریعے زندہ کر دیتے ہیں۔ پس ایسا ہی ہے اُنھا قیامت میں بھی ہوگا۔“

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے ڈرا خود اپنے نفس پر تو غور کرو کہ خود تمہارے اندر ہی خدا کے آگیاں مورتی پر قادر ہونے کا ثبوت موجود ہے۔

هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ عِوَجٌ ۖ ذِكْرُ الَّذِي تَبَدَّلُ
لَسَانُهُ ۚ فَسِيئًا مُّثَلًّا ۖ ذِكْرًا ۚ (الاحقاف-۱)

”یہ شبہ انسان پر زبان کا ایک ہی وقت گزرا ہے جبکہ وہ کوئی ظلی ذکر شدہ تھا۔“

كُنْتُمْ أَهْوَآءًا فَاتَّخِذْكُم مِّثْلَ بَيْتِكُمْ لَعْنَةُ
يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔ (البقرہ-۳)

”تم مرنے والے تھے تو خدا نے تم کو زندہ کیا، پھر وہ تم کو مرنے کی دے گا، پھر زندہ کرے گا، پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

إِن كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ
مِّن نَّبَرٍ۔ (الحاقة)

”اگر تم کو مرنے کے بعد ہی اُنٹے میں شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے مٹی جیسی بے جان شے سے تم کو پیدا کیا

سجہ

قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ
يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ (نور: ۵)

”اس نے کہا کہ کون ڈھیریں کو زندہ کرے گا جبکہ وہ بوسیدہ
ہو جائیں گی؟ کہہ دے کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں
پہل بار زندگی بخشی تھی۔“

قُلْ كُونُوا حِجَابًا أَوْ حَذِيذًا أَوْ خَلْقًا مِمَّنْ
يُكْسَرُ فِيهِ صُدُفٌ كُمْ فَسَيَعُولُونَ مَنْ يُحْيِيهِمْ
قُلْ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (نہ اسراء: ۵)

”ان سے کہو کہ تم چمریں ہلو یا لوہا یا کوئی اور ایسی چیز جس
کا زندہ ہونا تمہارے نزدیک بہت ہی عیدالاحمال ہے، پھر وہ بھی
کہ کون ہم کو دوبارہ زندہ کرے گا؟ تو کہو کہ وہی جس نے پہل
بار تم کو پیدا کیا تھا۔“

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ
طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُفُوسًا فَنَزَّلْنَاهُ فِي قَرَارٍ مُكِينٍ ثُمَّ
خَلَقْنَا السُّفُفَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً
فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَّوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا
ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَبَيَّنَّا فِي آيَةِ أَحْسَنِ
الْعَالَقِينَ ثُمَّ إِذَا كُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَنِيثُونَ ثُمَّ
إِذَا كُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ تُخَعَّدُونَ (المومن: ۱)

”پہل انسان کو مٹی کے سستے بنایا، پھر ہم نے ہی اس
سست کو نفلہ بنا کر ایک حفاظت کی جگہ میں رکھا، پھر نفلہ کو توغڑا بنایا،
پھر توغڑے کو مضغہ گوشت کی صورت دی، پھر مضغہ کی ڈھیریں

بنائیں، پھر ڈھین پر گوشت چڑھایا، پھر اس کو ایک دوسری ہی چیز سے لکڑا کیا۔ پس بڑی برکت والا ہے اللہ جو بہترین خالق ہے پھر اس کے بعد تم ضرور مرنے والے ہو، پھر یقیناً تم قیامت کے بعد اٹھائے جاؤ گے۔

الْخَرِیْکَ لَطَفْنَا یَسْنَ ثَمَرِیْنَ یُحْنِیْ شَدَّ کَانَ
خَلَقْنَا فَطَلَقَ فَسَوَّیْ فَبَجَعَلَ مِنْهُ السَّوْءَ حَسْبِیْ
الدَّکْرُ وَالْاُنْثٰی اَلْیَسْنَ ذٰلِکَ یَطْوِیْ عَلٰی اَنْ یُّخْفِیْ
السَّوْءُ۔ (الحجرہ - ۲)

”کیا انسان مٹی کا حصّہ ایک قلوہ در تھا جو دم بدمٹھا چکا گیا تھا؟ پھر وہ ایک کو حقرا بنا۔ پھر ٹھکانے اس کو انسانی شکل دی۔ اور اس کی ساخت کو استوار کیا۔ پھر اس کی دو صوئیں کر دی کر دی اور مرد و عورت کے جوڑے بنائے۔ کیا وہی ٹھکانا اس پر قنارہ نہیں کہ مزید کو زندہ کرے؟“

یہ صاف اور واضح اور عمارت مشاہدہ و احساس سے قریب تر شواہد پیش کرنے کے بعد قرآن مجید ایک ایسی کھلی ہوئی دلیل پیش کرتا ہے جو بالکل عقل عام (Common Sense) سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اشیاء کو عدم سے وجود میں لانا زیادہ مشکل ہے، نسبت اس کے کہ ان کو منتشر اور پراگندہ ہو جانے کے بعد دوبارہ پہلی صورت پر پیدا کیا جائے۔ پس جو طاقت اس دشوار تر کام کو انجام دینے سے عاجز نہ ہوئی، وہ آسان کام کو انجام دینے سے کیوں کر عاجز ہو سکتی ہے؟ اگر ایک شخص موٹر ایجاد کرنے پر قادر ہے اور اس کو بنا چکا ہے تو کیا یہ بات عقل میں آ سکتی ہے کہ وہ موٹر کے پڑزوں کو الگ الگ کرنے کے بعد دوبارہ ان کو

بھڑ دینے پر قادر نہیں ہے ۹ اسی مثال پر قیاس کر لو کہ صالح عالم جو
تم کو عدم سے وجود میں لایا ہے، تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ پیدا
کرنے سے ہرگز عاجز نہیں ہو سکتا۔

أَوَلَمْ يَتَوَقَّأَ كَيْفَ يَخْلُقُ رَبُّهُ ۚ أَفَلَمْ يَعْلَمْ بِكُلِّ
شَيْءٍ ذِكْرًا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَىٰ رَبِّهِ ۖ (الحکمت ۴)
”کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اللہ کس طرح آفرینش کی ابتداء کرتا
ہے ۹ پھر اسی طرح وہ اس کا اعادہ بھی کرے گا اور یہ بات اللہ
تعالیٰ کے لئے یقیناً زیادہ آسان ہے“

وَهُوَ الَّذِي يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ ذَكِيٌّ
بِغُيُوبِهِ۔ (الروم ۴)

”اور وہی تو ہے جو آفرینش کی ابتداء کرتا ہے۔ پھر
وہی اس کا اعادہ کرے گا۔ اور یہ اعادہ اس کے لئے آسان تر
ہے“

أَفَتَعْبُدُونَ الْفُلْجَ الْأَوَّلَ، بَلَّغْهُ فِي تَسْبِيحِ
بِسْمِ اللَّهِ جَدِيدًا۔ (ق ۱)

”کیا ہم پہلی مرتبہ پیدا کرنے سے عاجز رہ گئے؟ (نہیں،
ان کو پہلی آفرینش سے الگ نہیں ہے) مگر ان کو لکھنی آفرینش
میں شک ہے“

اب صبرت یہ شبہ باقی نہ جاتا ہے کہ جن مردوں کے اجزائے
جسم فنا ہو گئے ان کو پھر کیوں کر پہلا جسم عطا کیا جاسکتا ہے؟ کوئی
پانی میں ڈوب کر مڑا اور اس کی بوٹی بوٹی پھیلیوں اور اپنی ہالندوں
کی غذا بن گئی۔ کوئی جل کر مڑا یا مڑ کر جلا دیا گیا اور اس کا سارا جسم
راکھ اور دھوئیں میں منتقل ہو گیا کوئی زمین میں دفن ہوا اور خاک میں

زل مل گیا۔ اب کیونکر ممکن ہے کہ اس کا پہلا جسم خود کبے اور اس میں پھر وہی پہلی نوح چھوٹی جائے؟ اس شبہ کو لوگوں نے یہ کہہ کر دفع کرنے کی کوشش کی ہے کہ نوح کو جسمانی زندگی عطا کرنے کے لئے لازم نہیں ہے کہ وہی پہلا جسم اس کو واپس دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ نوح وہی ہو اور اس کو پہلے جسم کے مشابہ کوئی دوسرا جسم عطا کر دیا جائے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ خدا وہی جسم عطا کرنے پر قادر ہے۔ پہلے جسم کے اجزاء معدوم نہیں ہوئے ہیں۔ منتشر حالت میں اس کا ہر ہر جزء کہیں نہ کہیں موجود ہے، خواہ ہوا میں ہو، خواہ پانی میں ہو، خواہ مٹی میں ہو، خواہ نباتات یا حیوانات کے اجسام میں ہو۔ خواہ معدنیات کے اجسام میں ہو۔ خدا کا علم اتنا مادی ہے کہ وہ ہر چیز کے مقام کو جانتا ہے اور اس کی قدرت اتنی کامل ہے کہ وہ ان منتشر اجزاء کو پھر جمع کر کے پہلی صورت پر بنا سکتا ہے۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَنْهَارُ وَتُكْمِلُهُ الْغُدُو

کِتَابٌ حَفِیْظٌ (ق-۱)

”ہم کو معلوم ہے کہ زمین ان دریا سے کیا چیز گشتاں ہے اور بحال ہے پاس ایسی کتاب ہے جس میں ہر چیز کا ریکارڈ محفوظ ہے“

وَعَلَّمَكَ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا تَسْتَعْجِلُ مِنْهُ
وَمَا تَسْتَعْجِلُ مِنْهُ وَلَا تَسْتَعْجِلُ مِنْهُ وَلَا تَسْتَعْجِلُ مِنْهُ
وَمَا تَسْتَعْجِلُ مِنْهُ وَلَا تَسْتَعْجِلُ مِنْهُ وَلَا تَسْتَعْجِلُ مِنْهُ
وَمَا تَسْتَعْجِلُ مِنْهُ وَلَا تَسْتَعْجِلُ مِنْهُ وَلَا تَسْتَعْجِلُ مِنْهُ

(الانعام)

”اے اس کے پاس غیب کی کئی چیزیں ہیں جن کا علم اس کے سوا
 کسی کو نہیں ہے۔ جو کچھ غلطی اور تری عیب ہے اس کو سب معلوم
 ہے۔ ایک پتہ بھی اگر جڑ تک ہے تو وہ اس کو جانتا ہے۔ زمین
 کے تاریک پردوں میں کوئی دامن ایسا نہیں ہے، اور کوئی خشک
 تری چیز ایسی نہیں ہے جو ماضی کے دکھا دیے والی ایک کتاب
 میں موجود نہ ہو۔“

یہ جو کچھ بیان ہوا ہے اس کا مقصد اس استبعاد کو دور کرنا ہے
 جس کی بنا پر لوگ حیاتِ اخروی سے انکار کرتے ہیں۔ انکار کی
 اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ ممکن کو کسی تجربہ یا مشاہدہ یا علم یقین
 کے کسی اور ذریعہ سے قطعاً و اہلاً یہ معلوم ہو گیا ہے کہ مرنے کے
 بعد کوئی زندگی نہیں ہے۔ بلکہ انکار صرف اس بنا پر ہے کہ
 مرنے کے بعد پھر جی اٹھنا ان کی عقل میں نہیں سما۔ انہوں نے
 اس نظارہ کو کبھی نہیں دیکھا۔ ان کو تو یہ دیکھنے کی عادت دی ہے
 کہ جو غلام پھر پڑ پڑا۔ لہذا جب یہ کہا ہوتا ہے کہ جو مر چکے ہیں وہ پھر
 پائیں گے تو اس غلط عادتِ بات کو وہ محال، غیر ممکن اور بے
 الاعتدال و قیاس کہتے ہیں۔ لیکن غور و فکر کی راہ میں ایک قدم آگے
 بڑھیں۔ یہ سارا استبعاد دور ہو جاتا ہے اور جو بات پہلے ناممکن
 نظر آتی تھی وہ عین ممکن نظر آنے لگتی ہے۔ جن باتوں کو آپ ممکن
 بلکہ واقعی سمجھتے ہیں ان کے متعلق آپ کا ایسا سمجھنا جس اس وجہ
 سے ہے کہ آپ کو ان کے وقوع کا مشاہدہ کرنے کی عادت نہ ہی
 ہے۔ ایک رنج کا زمین میں جا کر چھوٹنا اور ایک تناؤ دھڑکت کی شکل
 میں نمودار ہو جانا، ایک قطرہ کا رجم میں پہنچنا اور وہاں سے ایک
 انسان کی شکل میں برآمد ہونا، وہ ہواؤں کے ٹپنے سے پانی بننا

اور اس کا ایک قریب کے ساتھ بار بار پانی سے بہاؤ اور بہاؤ سے پانی بہتے رہنا، عالم کی اس وسیع فضا میں کروڑ ہا کروڑ تہاڑوں کا گیندوں کی طرح دوڑنا اور کبھی مادی ہشتے کے بغیر ایکٹ کا دوسرے کے ساتھ ایسا مربوط ہونا کہ ان کی حرکات اور گردشوں کے نظم میں فرقہ مدار فرقہ نہ آئے، یہ سب باتیں دیکھنے کے آپ ٹوگر ہیں اس لیے ان کو معمول سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر یہی چیزیں آپ کے سامنے پیش نہ ہوتیں اور اس کے بہانے کسی اور نظام سے آپ مالوس ہوتے، تو انہی سب باتوں کو آپ اتہام سے زیادہ بیدار عقل و قیاس سمجھتے، اور شدت کے ساتھ ان کے امکان سے انکار کرتے۔ فرض کیجئے کہ کراڑ سرخ میں درخت نہ اُگتے ہوں اور وہاں کے لوگوں سے بیان کیا جائے کہ ایک باشہ بھر کراڑ زمین میں دفن ہو کر درخت بننا ہے، اور اپنے ابتدائی جرم سے کٹھے ہزار بلکہ کئی لاکھ گنا بڑا ہو جائے، اور پھر اس میں سے ویسے ہی ہزاروں بڑے پیدا ہوتے ہیں، تو یہ بات سرخ والوں سے کبھی سمجھا ہوں میں اتنی ہی حیرت انگیز ہوگی جتنی آپ کے نزدیک مرنے کے بعد پھر جی اُٹھنے کی داستان حیرت انگیز ہے۔ وہ بھی اسی طرح کہیں گے کہ یہ تو ناممکن ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ عدم امکان کا قویٰ جزم کی بنا پر نہیں جہل کی بنا پر ہوگا۔ عقل کی رسائی کا عیب نہیں نارسائی کا عیب ہوگا۔ بس ایسا ہی حال آپ کے استبعاد کا ہے اگر آپ اپنے استہباب یا استبعاد کی حقیقت کو سمجھ لیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ کسی چیز کا آپ کی عقل و قیاس سے دور ہونا درحقیقت اس چیز کے غیر ممکن یا محال ہونے کے لیے کوئی دلیل ہی نہیں ہے۔ جو چیزیں آج خود انسان ایجاد کر رہا ہے وہ آج

سے سو درج پہلے خود انسان کے نزدیک بعید از عقل و قیاس نہیں۔ مگر واقعات سے ثابت ہو گیا کہ ناممکن نہ تھیں۔ اسی طرح جی چیزوں کو آج انسان مستبعد سمجھ رہا ہے وہ آج سے سو دو سو درج بعد خود انسان کے ہاتھوں وجود میں آئیں گی اور واقعات ثابت کر دیں گے کہ وہ ناممکن نہیں ہیں۔ پھر جب انسان کی عقل اور اس سے بعید یا قریب ہونے کی حقیقت یہ ہو تو کسی چیز کو محض اس بنا پر ناممکن نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس محدود عقل میں نہیں سمجھائی۔

کسی حقیقی اور ماحول آئے ہو اس چیز کو ثابت کرنے کے لئے پہلا قدم یہی ہے کہ اس کا امکان ثابت کیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اپنے استدلال سے حیات اخروی کے استبعاد کو ٹھک کر کے اس کو ممکن ثابت کر دیا۔ اب کد سرا قدم یہ ہے کہ اس کی ضرورت ثابت کی جائے تاکہ عقل یہ تسلیم کرے کہ ایسی ایک چیز ضرور ہونی چاہئے اور اس کے عدم سے اس کا وجود اولیٰ ہے۔

نظام عالم ایک حکیمانہ نظام ہے

حیات اخروی کی ضرورت کا اثبات دراصل اس سوال کے تصدیق پر موقوف ہے کہ آیا یہ کائنات کسی حکیم کا فضل ہے یا بلا کسی حکمت کے آپ سے آپ بن گئی ہے؟

زمانہ حال کا سائنس زدہ انسان کہتا ہے کہ اس نظام کو کسی صنایع حکیم نے نہیں بنایا۔ یہ آپ سے آپ بن گیا ہے اور خود بخود حرکت کرنے والی مشین کی طرح اپنے تمام اجزاء سمیت (جن میں انسان بھی شامل ہے) پل رہا ہے۔ مادہ اور توانائی (Energy) کا باہمی تعامل جس روز ختم ہو جائے گا اسی روز یہ نظام بھی ختم

برہم ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسا نظام، جس کو ایک اندھی طبیعت (Nature) بلا کسی علم، عقل، شعور، ارادہ اور حکمت کے چننا نہی ہے، اس میں کسی مقصدیت اور حکمت کی نگاہ سے بالکل لامحالہ ہے۔ اسی وجہ سے مادہ پرست سائنس نے آثار کائنات کی مقصدی تحلیل (Teleological Causation) کو اپنے حذور سے نہ صرف خارج کر دیا ہے، بلکہ اس طریق فکر کو سرے سے لغو و بے معنی قرار دیا ہے، اور قطعیت کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ اس کائنات اور اس کی کسی شے اور کسی فعل میں کوئی مقصد نہیں پایا جاتا۔ آنکھیں دیکھنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ دیکھنا نتیجہ ہے مادہ کی اس خاص تنظیم کا جو آنکھوں میں پائی جاتی ہے۔ دماغ اس لیے نہیں ہے کہ سوچنے اور فکر و شعور کا عمل بنے، بلکہ خیالات و مباحث کے ماتھے سے اسی طرح نکلتے ہیں جس طرح ہنگے سے سفراء نکلتا ہے۔ یہ محض غلط فہمی ہے کہ اشیاء کے طبیعی افعال کو ان کا مقصد قرار دیا جاتا ہے اور ان کے وجود میں کسی حکمت اور کسی عقل کی جستجو کی جاتی ہے۔

اس نظریہ کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو حیات و نبوی کے بعد کسی حیات اخروی کی ضرورت تسلیم کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں رہتی۔ کیونکہ جس کائنات کا نظام ایک اندھی بے عقل و شعور طبیعت کے ہاتھوں کسی مقصد و غایت کے بغیر چل رہا ہے، اس کی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ وہ اور اس کی ہر شے عبث و بیهوده بنتی ہے اور عبث ہی تمام ہو کر فنا ہو جائے گی۔ یہ مستبعد ہے کہ ایسی اندھی طبیعت عدل کی صفت سے منصف ہو اور اس سے کسی حساب کتاب اور انصاف کی اُمید کی جائے۔ تاہم اگر بالضرر

وہ عدل سے متصف ہو بھی، تو جب کہ انسان اس کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونے کی طرح کھیل رہا ہے اور اپنے اختیار سے کچھ کرنا تو درکار سرے سے کوئی اختیار اور کوئی ارادہ رکھتا ہی نہیں، اس پر اپنے کسی اچھے یا بُرے فعل کی اسی طرح کوئی ذمہ داری نہیں ہونی چاہیئے جس طرح ایک موٹر پر اپنی ناست زوی یا کئی زوی کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اور ذمہ داری کا سوال اٹھ جانے کے بعد دُنیا ہی میں عدل و انصاف اور نِزَا و نِزَا کا سوال منقطع ہو جاتا ہے، کہا کہ اس کی خاطر ایک دوسری زندگی کی ضرورت تسلیم کی جائے۔ لیکن یہ نظریہ سراسر غلط عقل ہے اور کوئی عقلی دلیل یا عقلی شہادت ایسی نہیں پیش کی گئی جس سے اس کی صداقت ثابت اور میراث ہو جائے۔ اس کی تائید میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ٹپ ہمارے بس اتنا ہے کہ ہم کو کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا اور کوئی چلانے والا نظر نہیں آتا۔ نہ اس کی پیدائش کا کوئی مقصد، ہماری نگاہ میں آتا ہے ہم اس کو کسی بنانے والے کے بغیر چلتا ہوا دیکھتے ہیں اور اس کے چلنے کا مقصد معلوم کرنا نہ ہمارے لئے ممکن ہے، نہ ہم کو اس کے معلوم کرنے کی ضرورت۔ لیکن کسی شے کی علتِ فاعلی اور علتِ فاعلی نہ معلوم ہونا اس کی دلیل نہیں ہے کہ اس کی کوئی علتِ فاعلی اور علتِ فاعلی ہے ہی نہیں۔ فرض کرو کہ ایک بچہ کسی مصلح کھے مشین کو چلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مشین کس غرض سے چلائی گئی ہے۔ اس بنا پر وہ خیال کرتا ہے کہ یہ مصلح ایک کھلونا ہے جو بلا کسی مقصد و غایت کے چل رہا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ جس طرح اس مشین سے آواز پیدا ہوتی ہے، ہر نہرے حرکت کرتے ہیں، زمین لڑتی ہے، اسی طرح کاغذ بھی چپ چپ کر نکلتے ہیں۔

اس بنا پر وہ حکم نکالتے ہیں کہ جس طرح وہ افعال اس مشین کے چلنے کے نتائج ہیں اسی طرح کائناتوں کا چپ چپ کر نکلتا بھی اس کی حرکت کا ایک طبعی نتیجہ ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ تمام افعال جو اس سے صادر ہو رہے ہیں ان میں سے صرف ایک فعل، یعنی کائناتوں کا چپ کر نکلتا، اس پوری مشین کے بنائے جانے کا مقصد ہے، اور باقی تمام افعال مشین کی حرکت کے طبعی نتائج ہیں۔ اس کی طبعی نظر مشاہدہ کی اتنی قوت نہیں رکھتی کہ اس مشین کے پٹریوں میں ترتیب، تناسب اور حکم کو محسوس کر سکے، اور یہ سمجھ سکے کہ اس کا ہر پٹریہ جس شے پر بنایا گیا ہے، اور جس مقام پر لگایا گیا ہے، وہی شے اور وہی مقام اس کے لیے موزوں ہے اور مشین میں اپنے حقہ کا کام انجام دینے کے لیے وہ پٹریہ اسی شے اور اسی مقام پر ہونا چاہیے۔ اس بنا پر وہ کائنات میں پھر یہ سمجھتا ہے کہ یہ مشین یوں ہی گوبے کے ٹکڑوں کے باہم مل جانے سے آپ ہی آپ بن گئی ہے۔ اس کی عقل تو انہی اتنی ترقی یافتہ نہیں ہیں کہ وہ مشین کے افعال اور اس کی ترتیب کو دیکھ کر قیاس کر سکے کہ اس کا بنانے والا ضرور کوئی حکیم شخص ہے ہونا چاہیے جس نے اسے ایسے ایسے انداز سے، اور ایسے عمدہ نقشے پر ایسی مشین بنائی ہے جس کا کوئی پٹریہ بے کار، غیر موزوں یا غیر منضبط اور بے ضرورت نہیں ہے، اور یہ کہ ایسی حکمت و دانائی کیساتھ جو چیز پیش کی گئی ہے وہ ہرگز بے مقصد، بے مصلحت اور بے نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ اب اگر پرس مشین کے اس ناقص مشاہدے اور اس پر اپنے ناقص تصور فکر سے وہ نادان بچہ یہ نظریہ قائم کرتا ہے کہ مشین کی کوئی علت فاعلی اور علت غائی نہیں ہے، نہ کوئی

حکمت اس کے بنانے میں صرف ہوئی ہے، اور نہ کوئی حکیمانہ مقصد اس کی صنعت میں پیش نظر ہے، تو کیا کوئی ماحول و بالغ آدمی یہ تسلیم کرے گا کہ بچے نے اس مشین کی حقیقت کے متعلق یکسو صحیح نظریہ قائم کیا ہے؟

اگر یہ بات ایک پرہیز گار شخص کے منہ سے نکلتی ہے تو اس نظام کائنات کے معاملہ میں کیوں کر درست ہو سکتی ہے جس کا ایک ایک ذرہ اپنے صالح کے علم، ارادے، حکمت اور بصیرت پر شہادت دے رہا ہے۔ ناقص عقل اور کوتاہ دماغ بچے جو چاہے کہے، مگر کوئی صاحب عقل آدمی تو جس نے آنکھیں کھول کر اس کائنات کے آثار کا مشاہدہ کیا ہے، ایک لمحہ کے لئے بھی یہ شک نہیں کر سکتا کہ ایسا حکم، استوار، مرتب اور متناسب نظام جس میں کوئی شے بے کار اور عبث نہیں ہے، جس میں کوئی شے ضرورت سے کم یا زیادہ نہیں ہے، جس کا ہر جز اپنے مقام اور اپنی ضرورت کے لحاظ سے ٹھیک ٹھیک موزوں ہے، اور جس کے مضابطہ میں کہیں کوئی فتور نظر نہیں آتا، کسی حکمت، کسی علم، کسی ارادے کے بغیر بن اور چل سکتا ہے۔

حکیمانہ نظام ہے مقصد اور مصل نہیں ہو سکتا

قرآن مجید نے حیات اخروی کی ضرورت پر جو دلائل قائم کیے ہیں وہ سب اسی بنیادی نظریہ پر مبنی ہیں کہ اس کائنات کا بنانیوالا ایک حکیم ہے جس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہے، اور جس کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہیں کی جا سکتی جو خلاف حکمت ہو۔ اس بنیاد کو استوار کرنے کے بعد قرآن مجید کہتا ہے کہ :-

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ

إِنَّمَا لَا تَرْجِعُونَ فَتَعَالَى اللَّهُ الْعَرْشُ الْحَقُّ
(المؤمنون - ۶)

”کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ ہم نے تم کو جہنم بھیجا
کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف واپس نہ لائے جاؤ گے؟
بادشاہ برحق خدا اس سے بالاتر ہے (کہ اس سے کوئی فصل
جہنم صادر ہو۔)“

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى -

(التكوير - ۲)

”کیا انسان یہ سمجھے رہتا ہے کہ وہ یوں ہی چھل پھلادیا
ہلے گا؟“

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا
لَهَيْبَةٍ مَّا خَلَقْنَاهُمْ إِلَّا بِالْحَقِّ وَقَلِيلٌ أَلْزَمُهُمْ
لَا يَعْلَمُونَ - إِنَّ يَوْمَ الْفَعْلِ وَمَقَاتِلُهُمْ
أَجْتَمِعِينَ - (الرحمن - ۲)

”ہم نے آسمان اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے
درمیان ہیں کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے۔ ہم نے تو
ان کو متضامانے حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے۔ مگر اکثر لوگ
نہیں جانتے۔ یقیناً ان سب کے لیے فیصلے کے دن تک
وقت مقرر ہے۔“

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي مَا كُفِّرُوا بِلِلَّهِ
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ
أَجَلٍ مُّسَمًّى وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ
لَكَفُورُونَ - (الهم - ۱)

”کیا انہوں نے خود اپنے دلوں میں خود نہیں کیا کہ اللہ نے
آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو جو پیدا کیا
ہے تو حکمت کے مطابق کیا ہے اور ان کے لئے ایک وقت
مقرر ہے ؟ مگر ہوتے ہوئے میں تو اپنے سب کی مخلوقات
کے منکر ہیں۔“

ان آیات میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر زمین و آسمان کا یہ سارا
کارخانہ صرف اس لئے ہے کہ ایک مدت تک چلتا رہے، پھر کسی
حاصل اور نتیجہ کے بغیر معدوم ہو جائے، تو یہ ایک لغو اور عبث
فعل ہوگا، ایک کھیل ہوگا۔ ایسا فعل ہرگز کسی حکیم کا فعل نہیں ہو سکتا۔
مگر تم مانتے ہو کہ یہ کارخانہ کھانے بنایا ہے اور کھانا کھانے نزدیک
حکیم ہے، تو تم کو عقل سے کام لے کر یہ سمجھنا چاہیے کہ موجودات
میں سے کوئی شے بے مقصد وجود میں آنے والی اور بے حاصل و
بے نتیجہ معدوم ہو جانے والی نہیں ہے۔ خصوصاً انسان جو کائنات
ارضی کا اعلیٰ سرسبز ہے، جس کی وہی شعور ہستی اس کائنات ارضی کے
تخلیق کی ارتقاء اور اس کی تمام حرکات و تہکات کا حاصل ہے، جس کو
اتنی حکمت کے ساتھ عقل و فکر اور پیش و دانش اور اختیار و ارادہ کے
آراستہ کیا گیا ہے، اس کی تخلیق کا مقصد اتنا بھل نہیں ہو سکتا کہ وہ
چند برس اس دنیا میں ایک مشین کی طرح بسر کرے، پھر مڑ کر معدوم

ہو جائے۔
اقتضائے حکمت کی مطابق نظام عالم کا کیا انجام ہونا چاہیے
جب یہ بات معلوم ہوگی کہ یہ کائنات عبث اور بھل نہیں ہے،
اور اس کی کوئی شے بے نتیجہ و بے حاصل ہے، تو وہ سراسر سوال یہ
پیدا ہوتا ہے کہ عدم مطلق کے سوا اس کارخانے کا اور کون سا انجام

ایسا ہے جو اقتضائے حکمت کے عین مطابق ہو ۹ اس سوال کا تفصیلی جواب قرآن مجید کی آیات میں موجود ہے، اور وہ ایسا جواب ہے جس کو سننے کے بعد عقل سلیم بالکل مطمئن ہو جاتی ہے۔ مگر اس جواب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے چند اُحدوثی نشیئیں کہیں جائیں۔

۱۔ عالم وجود کے تمام آثار اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ اس نظام کے جتنے تغیرات و تحولات ہیں ان سب کا رُخ ارتقاء کی جانب ہے۔ اس کی ساری گردشوں کا مقصد یہ ہے کہ ہر نفس کو کمال کی طرف لے جائیں، اور اشیاء کی ناقص صورتوں کو متاثر انہیں کمال اور کمال سے کمال تر صورتیں بنائیں۔

۲۔ اس قانون ارتقاء کا عمل چو کہ تغیر کی ندش پر ہوتا ہے اس لئے ہر کون کے لئے ایک فساد ضروری ہے۔ ایک صورت کا وجود میں آنا اس کا مستثنیٰ ہے کہ پہلی صورت فاسد ہو جائے، اور ناقص صورت کا نازل ہونا کمال تر کے وجود میں آنے کا دریا چر ہوا کرتا ہے۔ یہ تغیرات و استحالات اگرچہ ہر گن ہوتے رہتے ہیں، لیکن بہت سے غلطی تغیرات کے بعد ایک جلی اور نمایاں تغیر واقع ہوتا ہے۔ کتاب ہے جس میں ایک جلی اور نمایاں فساد پیش آتا ہے یہی دوسرا قسم کا فساد ہے جس کو ہم عرف عام میں موت یا زوال سے تعبیر کرتے ہیں اور ایک صورت کے وجود میں آنے سے لے کر اس کی موت یا اس کے قتل فساد ایک ایک وقفہ ہوتا ہے جس کو ہم اپنی زبان میں مَرہتے ہیں۔

۳۔ ہر صورت اپنے لئے ایک خاص عمل چاہتی ہے جو اس کے مناسب حال ہوا کرتا ہے۔ کوئی صورت کسی ایسے عمل میں نہیں رہ

سکتی جو اس کے لئے مناسب حال نہ ہو۔ مثلاً ضرورت بنانی کے لئے حیوانی جسم غیر مناسب ہے، اور ضرورت انسانی اکی جسم اور اسی مخصوص طبقہ کے نظام جسمانی کی طالب ہے جو انسان کے لئے بنایا گیا ہے۔ پس اگر کسی شے کو ایک ترقی یافتہ ضرورت درج ہو تو لازم ہے کہ فروتر درجہ کی ضرورت کے لئے جو عمل بنایا گیا تھا اس کو توڑ دیا جائے، اور نئی ضرورت کے لئے اس کے مناسب حال عمل تیار کیا جائے۔

۴۔ اجوائے عالم کے حق میں قانون ارتقار کی ہر گیزی کو جس شخص نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے اس کے نزدیک یہ بات ہرگز مستبعد نہیں ہے کہ یہی قانون اس پورے نظام عالم پر بھی مادی ہو۔ اس وقت جو نظام عالم ہم دیکھ رہے ہیں، اس کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے کہ جب سے خلق و ابداع کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس سے پہلے نہ معلوم کتنے اور نظامات گزر چکے ہوں گے جن میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی عمر پوری کر کے دوسرے ترقی یافتہ نظام کے لئے سبکدوش کر دی، اور ارتقار کے تدریجی مراتب سے گزر کر سلسلہ وجود جاری ہے اس نظام تک پہنچا۔ اسی طرح یہ نظام بھی کوئی آخری نظام نہیں ہے یہ بھی جب اپنے امکانات کمال کو پہنچ جائے گا، اور کمال کے بالاتر درجہ کو قبول کرنے کی استعداد اس میں باقی نہ رہے گی، تو اس کو توڑ دیا جائے گا اور اس کے بجائے کوئی دوسرا نظام قائم کیا جائے گا جس کے قوانین کچھ اور ہوں گے، اور جس میں وجود کے کامل تر مراتب قبول کرنے کی صلاحیت ہوگی۔

۵۔ عالم کے موجودہ نظام پر غور کرنے سے ہم کو بین الطود پر یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ یہ ایک ناقص نظام ہے اور مزید تکمیل کا

محتاج ہے۔ اس نظام میں اشیاء کی حقیقتیں مادی آکاشوں سے اس درجہ
 آلودہ ہیں کہ حقیقتوں نے اوہام کا اور ان کے مادی لباسوں نے حقیقتوں
 کا مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔ جو چیز جتنی زیادہ لطیف اور مادی آکاشوں
 سے مجزوب ہے وہ اس نظام عالم میں اتنی ہی زیادہ عقلی و مستور، اور عقل
 شعور کی دسترس سے قند ہے۔ یہاں ٹھوس مادی جسم وزن رکھتا ہے
 اور لطیف و بسیط محتاج کا کوئی وزن نہیں ہے۔ یہاں بکری اور چتر
 ٹاپے اور توڑے ہاں کئے ہیں، مگر عقل و فکر، خیال و زائے، نیت و
 ارادہ، ہدایت و وہدائیات کو ٹاپے اور توڑے کے لئے اس عالم
 کے قانون میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں فکر تو ہاں سکتا ہے، مگر
 محبت اور نفرت کو توڑنے والا کوئی ترازو نہیں ہے۔ یہاں کپڑا نا ہا
 ہا سکتا ہے، مگر بغض و حسد کو ٹاپنے کے لئے کوئی پیمانہ موجود نہیں۔
 یہاں روپے پیسے کی قدریں متعین کی ہا سکتی ہیں، مگر اس ہندے
 کی قدر و قیمت حقیقی کرنا ممکن نہیں ہے جو سخاوت یا بخل کے لئے
 محرک ہوتا ہے۔ یہ اس عالم کے نظام کا نقص ہے۔ عقل پارہی ہے
 کہ اس سے زیادہ ترقی یافتہ کوئی اور نظام ہو جس میں حقیقتیں مادی
 لباسوں کی محتاج نہ رہیں اور بے نقاب جلوہ گر ہو سکیں۔ جس میں
 لطافتیں کثافتوں پر غالب آجائیں اور جو کچھ اب مستور و مخفی ہے وہ
 نمایاں اور جلی ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی اس عالم کا نقص ہے کہ
 یہاں مادی قوانین کا ظہور ہے جس کی وجہ سے افعال کے صرف وہی
 نتائج مرتب ہوتے ہیں جو مادی قوانین کے مقتضیات سے مطابقت
 رکھتے ہوں، اور ایسے نتائج مرتب نہیں ہونے پاتے جو مقتضیات
 عقل و حکمت کے مطابق ہوں۔ یہاں آگ جھکاؤ تو ہر آتش پذیر شے
 جل جائے گی، پانی ڈالو تو نمی کو قبول کرنے والی ہر شے بھیگ

ہائے گی، مگر نیکی کرو تو اس کا پھل نیکی کی سعادت میں ظاہر نہ ہو گا جو اس کا حقیقی عقلی نتیجہ ہے، بلکہ اس سعادت میں ظاہر ہو گا۔ جو مادی قوانین کے تحت ظاہر ہو سکتا ہے خواہ وہ نیکی کے بالکل برعکس بدی ہی کی سعادت کیوں نہ ہو۔ اس قسم کو دیکھ کر عقل تھنسا کرتی ہے کہ اس نظام کے بعد کوئی اور ترقی یافتہ نظام ایسا قائم ہو جس میں مادی قوانین کے بہائے عقلی قوانین ہماری ہوں، اور افعال کے وہ حقیقی نتائج ظاہر ہوں جو اس نظام میں مادی قوانین کے غالب ہونے کی وجہ سے ظاہر نہیں ہو سکتے۔

نظامِ ظالم کا خاتمہ

ان مقدمات کو سمجھ لینے کے بعد یہ دیکھئے کہ قرآن حکم نے قیامت اور لٹاؤ آخرت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں آپ کے سوال کا کیا جواب ملتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ

مَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا

إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى۔ (الاحقاف-۱)

”ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان جو چیزیں ہیں ان سب کو مستحکم مکت کے مقررہ سماجی اور ایک مدت مقررہ تک کے لئے پیدا کیا ہے۔“

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلًّا يَجْرِىٰ فِيْ أَجَلٍ

مُّسَمًّى۔ (الرعد-۱)

”اس نے ہر ستارہ کو اپنے قانون کا پابند کر دیا ہے سب

ایک مدت مقررہ تک کہتے ہیں نہ ہے۔“

پھر وہ قیامت کی کیفیت اس طرح بیان کرتا ہے۔

إِذَا الشَّارِبُ الشَّرْبِ إِذَا الْكُوكِبُ الشَّوَارِبُ

وَإِذَا الْبُحُورُ سُفِّتَتْ - وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ - (الانفطار)
 جب آسمان چٹ جائے گا اور کواکب منتشر ہو جائیں
 گے اور سمندر پھوٹ نکلیں گے اور قبری اکھڑ دی جائیں گی۔
 إِذَا السَّمَاءُ كُفِّرَتْ - وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ
 وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ - (الطور)
 جب آسمان کو لپیٹ دیا جائے گا اور ستارے جہم
 برم ہو جائیں گے اور پہاڑ پٹائے جائیں گے۔
 وَإِذَا النُّجُومُ طُيِّتْ - وَإِذَا السَّمَاءُ فُزِّعَتْ
 وَإِذَا الْجِبَالُ نُوفِثَتْ - (الزلزال)
 جب ستارے بند پڑ جائیں گے اور آسمان ٹوٹ کر
 دیا جائے گا اور پہاڑ اُڑائے جائیں گے۔
 وَإِذَا الْبُرُوقُ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُيَاءُ
 السَّمْنِ وَالْقَمَرِ - (الفرقان)
 جب آنکھیں تھوڑ جائیں گی اور چاند گم جائے گا اور ہمارے
 سمندر مودسے جائیں گے۔
 فَجُيَاءُ الْأَنْهَارِ وَالْجِبَالِ فَذَلَّتْ كُلُّهَا
 فَأَجْدَاةٌ - (الواقعات)
 زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر بٹھا دیا جائے گا اور ایک
 ہی ٹکڑی ہو جائے گی۔
 يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَنْهَارُ غَيًّا لَا يُرَى
 وَالسَّمَوَاتُ وَبُزُرُهَا وَالْأَوْدِيَةُ الْقَهْقَارُ -
 (الزلزال)
 زمین روز زمین بدل کر دوسری طرح کی زمین کردی جائے گی

گی اور اسی طرح آسمان میں، اور سب کے سب کھائے فاسد
قہار کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔

یہ سب اشارات ہیں اس طرف کہ اس نظام عالم کی ایک خاص
عمر مقرر ہے۔ یہ کوئی دائمی نظام نہیں ہے۔ جب اس کی عمر پوری ہو
جائے گی تو یہ نظام درہم برہم کر دیا جائے گا۔ شورش، زمین، چاند
اور دوسرے سیارے جو اس نظام کے ارکان ہیں، اور جن کی گردشوں
سے اس نظام کا قیام ہے، منتشر ہو جائیں گے، ایک دوسرے سے
ٹکرائیں گے، اور یہ مادی مخلقت توڑ ڈالی جائے گی۔ مگر اس کے معنی
یہ نہیں ہیں کہ عالم وجود کا خاتمہ ہو جائے گا۔ خلق وابداع کا سلسلہ
بند کر دیا جائے گا۔ بلکہ اس کا مدعا یہ ہے کہ وجود کا یہ خاص طور جو
اس نظام میں نظر آ رہا ہے، بدل ڈالا جائے گا، اور عالم وجود کے
پے ایک دوسرا نظام قائم کیا جائے گا جس کی طرف یَتَوَرَّثُهَا
الْآٰتِہُ خَیْرَ الْآٰتِہِ خَیْرَ الْآٰتِہِ خَیْرَ الْآٰتِہِ میں اشارہ کیا گیا ہے۔
حیاتِ اخروی کا نظام کیا ہوگا

وہ نظام کیسا ہوگا؟ اس کی جو کیفیت قرآن میں بیان کی گئی ہے
اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ نظام، ہی کے نقص کی تشکیل
ہے، اسی نظام کی بابت کئی خصوصیات ہیں، اور وہی ہی ہے جس کی عقل
چاہتی ہے کہ جو اس نظام میں فتن اور پیمائش اور حساب سب کچھ ہو
گا۔ مگر مادی چیزوں کے لئے نہیں بلکہ طیف، بسیط اور مجرد حیثیتوں
کے لئے۔ وہاں خیر اور شر، ایمان اور کفر، اخلاق اور ملکات کا وزن
ہوگا۔ نیتوں اور ارادوں کی پیمائش ہوگی۔ دلوں کے اعمال ٹاپے اور
تولے جائیں گے۔ وہاں اس مدنی کے وزن اور اس پیسے کے عدد
کا حساب نہ ہوگا جو کہنے کسی غریب کو دیا ہے بلکہ اس نیت کا

حساب ہوگا جو اس بخشش کے لئے مرک ہوئی ہے، اس سے کہ وہی
کامیاب نہ ہوگی، عقل ہوگا۔

إِنَّ الشُّعْرَ وَالْيَسَرَ وَاللُّوَادَ كُلَّ أُولَٰئِكَ كَانَ
عَشًا مَّسْئُولًا (بنی اسرائیل - ۴)

”انکھ اور کان اور دل سب کے لئے جو کہ ہوگا۔“

وَلَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَمَةِ فَلَا
تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ مِثْقَالُ حَبَّةٍ فَوْقَ
مِثْقَالِ أُخْرَىٰ إِنَّا إِتَيْنَا بِهَا وَكُنْ بِمَا خَاصِمِينَ۔

(الانبیاء - ۳)

”اور قیامت کے روز ہم ٹیمک وزن کرنے والے قرار دینگے
اور ہر کئی نفس پر کچھ وزن ہوگا اور اگر ایک دانے کے وزن
کے برابر ہی ملے ہوگا تو ہم اس کو اپنے لئے اور ہم حساب کرنے
کے لئے کافی ہیں۔“

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ ۖ الْحَقُّ فَهُمْ لَنُكَفِّرَنَّ
مَوَازِينُهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ
تَنَحَّلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ
(الانعام - ۱)

”اس روز اعمال کا قیام ہوا کرتا ہے۔ ہر جہی کے اعمال کا
وزن ہماری ہوگا وہی قیامت پاسنے والا ہوگا اور جس کے اعمال کا
وزن ہلکا ہوگا وہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ کو خود
نقصان میں ڈالا۔“

يَوْمَئِذٍ يُعَذِّبُ السَّامِعُ أَهْلًا تَاٰلِیٰہِہٖ
أَمَّا الْهَمَزُ فَمَنْ يَحْتَمِلُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فَوْقَ غَيْرِهِ

يُزَكِّهِ وَمَنْ يَحْمِلْ يَسْتَالِ ذَمًّا فِي شَرِّ أَشْرَكَ۔

(الزَّالِ)

* اس حدیث کا تفسیر یہ ہے کہ ان کے افعال انہیں

دکھائے جائیں۔ پھر جس نے فقہ عائد نیکی کی ہوگی وہ اس کو

دیکھے گا اور جس نے فقہ عائد بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھے گا۔

اس دوسرے نظام میں وہ سب چیزیں نمایاں ہو جائیں گی۔

جو اس مادی نظام میں مادی قوانین کی بندشوں کے سبب سے چھپی

ہوئی ہیں۔ وہاں عقل اور مستور حقیقتیں بے نقاب سامنے آ جائیں گی اور

ہر چیز کی اصلی اور حقیقی حیثیت کھل جائے گی۔

لَعَلَّ كُنْثَىٰ فِي غُلْفَةٍ مِّنْ هَذَا فَكَشَفْنَا

عَنْكَ بِغَطَاؤِكَ فَهَبْرَاكَ الْيَوْمَ خَبْرًا (ق ۲)

* انسان سے کہا جائے گا کہ تو اس چیز سے غفلت میں تھا،

اب ہم نے تیری آنکھوں پر سے پردہ اٹھا دیا اور اب تیری نگاہ

بہتر بن گئی۔

يَوْمَئِذٍ يُعَذِّبُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنْكُمْ خَفِيَّاتُكُم

(الہٰقِقَاتِ)

* اس حدیث کا تفسیر یہ ہے کہ تم کوئی ناز و غنی نہ

ہے گا۔

وہاں افعال کے وہ حقیقی نتائج مرتب ہوں جو عقل و حکمت

اور عدل و انصاف کے مطابق ہیں۔ موجودہ نظام کے مادی قوانین

اور مادی اسباب و وسائل، جن کے اثر سے افعال کے حقیقی اور

عقلی نتائج مرتب نہیں ہو سکتے، وہاں نافذ نہیں ہوں گے، اس

لیئے وہ تمام چیزیں جو جہاں عدل و انصاف میں مانع ہوتی ہیں،

اور صحیح نتائج حرقہ نہیں ہونے دیتیں، وہاں ہر اکل ہے اثر ہو جائیں گی۔ مثال کے طور پر یہاں دولت، ملکی وسائل کی کثرت، دوستوں اور حامیوں کی طاقت، سنی، سناش، عائذاتی اثرات، خود اپنی پالا کڑ ہو شکاری، اور ایسی ہی دوسری چیزیں انسان کو اس کے بہت سے افعال کے نتائج سے بچا لیتی ہیں۔ مگر وہاں ان اسباب کی تاثیر دیکھ باطل ہو جائیں گی اور ہر فعل کا وہی نتیجہ برآمد ہوگا جو عدل اور حق کی بنا پر برآمد ہونا چاہیئے۔

هٰذَا لِكُلِّ نَفْسٍ مِّمَّا أَصْنَعَتْ۔

(نفس-۳)

”وہاں ہر نفس اپنے کئے افعال کو خود سمیٹنے سے لگا ہوا“

پہلے کر چکا ہے۔

وَوَلِّيتُ كُلُّ نَفْسٍ مِّمَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ۔

(اکل-۳)

”ہر نفس کو جیسا اس نے کیا ہے اس کا لینا لینا بدلے کا“

اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

يَوْمَ نَجْعِدُ كُلُّ نَفْسٍ مِّمَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ

مُحْتَضَرًا وَمِمَّا عَمِلَتْ مِنْ شَرٍّ۔ (اکل-۳)

”وہی دن جبکہ ہر نفس ہر اکل کو جو اس نے کیا ہے اور

اس بُرائی کو جو وہ کر چکا ہے سامنے لائے گا۔“

وَأَلْقُوا يَوْمَئِذٍ أَنْفُسَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ

شَيْئًا وَلَا يُنْقِضُونَ مِنْهَا شَيْئًا وَلَا يَبْغِضُونَ وَلَا يُوَفُّونَهَا

عَذَابًا وَلَا هُمْ يُنْقِضُونَ۔ (الہقرو-۶)

”لہذا اس دن سے جبکہ ایک نفس دوسرے نفس کے کچھ کام

خدا کے گا، اور اس کے حق میں کوئی معاوضہ قبول کی جائے
 گا، اور اس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا، اور خدا کی کوئی مدد
 کی جائے گی۔

فَإِذَا لُفِعَ فِي الشَّوْبِ فَلَا السَّابَ يَنْقُصُهُ
 يَوْمَئِذٍ وَلَا يَنْتَاصُ كَوْنٍ لَمَنْ تَقُلْتُ عَوَازِئُهُ
 فَاَوْفِيكَ هُمُ الْمُظْلِمُونَ وَمَنْ عَفَتْ
 عَوَازِيَهُ فَاَوْفِيكَ الدِّينَ عَسَىٰ أَن تَكْفُرَهُ
 (المؤمنون۔ ۶)

”پھر جب سود بھونک دیا تو اس روز میں کوئی نہیں
 تعلق پاتی نہ ہے گا اور نہ وہ ایک دوسرے کو پھینکے
 جن کے اعمال کا پتہ بھاری ہوگا وہی لوگ ظالم ہونگے اور
 جن کے اعمال بچے ہوں گے وہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے
 عفو اپنے آپ کو نصیب میں لیا۔“

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ إِلَّا مَنْ أَتَى
 اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ۔ (الشعراء۔ ۵)

”اس دن جب کہ نہ مال نہ بچے نہ بچے گا اور نہ اولاد۔
 بہت سبب اس کی ہوگی جو خدا کے پاس قلب سلیم کے ساتھ
 حاضر ہوگا۔“

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَاتٍ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ
 مَرَّةٍ وَتَرَكْتُمْ مَا خَوَّلْتُمْ وَمَا أَرْزَأْتُمْ كُفْرًا
 وَمَا زَيْنَ مَعَكُمْ شُفَعَاءُ الدِّينِ رَغِبْتُمْ
 عَنْهُمْ وَفِيكُمْ شُرَكَاءُ لَقَدْ تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ
 عَالَمٍ مَا كُنْتُمْ تَرَعُمُونَ۔ (الانعام۔ ۱۰)

”تم ہمارے پاس لکھ لکھ کر آؤ جیسا ہم نے تم کو پہلے
مرتبہ لکھ کر دیا کیا تمہارے ہمارے تم کو لکھ لکھ کر دیا وہاں
سب کو تمہیں پہلے چھوڑ گئے ہو اور اب ہم تمہارے ان سفارشوں
کو نہیں دیکھتے جی کو تم اپنی بددش اور بددق بخشی میں خدا کا
شریک سمجھتے تھے۔ تمہارے درمیان سب رابطے ٹوٹ چکے ہیں
اور اہل جہنم ہیں۔“

لَنْ تَنفَعَكَ أَسْأَلُكُمْ وَلَا أَوْلَاؤُكُمْ نَوْمُ
الْوَيْلَةِ يَلْعَبُونَ بِلِسَانِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ
بَصِيرٌ۔ (التہٰۃ: ۱)

”قیامت کے دن تمہاری رشتہ داریاں اور تمہاری اولاد
تمہارے لئے کچھ بھی نفع نہ ہوگی۔ اللہ تمہارے درمیان لہجہ
کے گا۔ اور جو تم کہتے ہو اس کو وہ دیکھ لے گا۔“
يَوْمَ تَفُوزُ الْمَسْرُوعُونَ أَجْنِبًا وَأَقْبَابًا وَأَصْحَابُ
وَضَائِعِهِمْ وَبَنِي بِلْكَالِ أَصْرَبِي وَتَهْجُرُ تَوَاقِيهِ
شَأْنًا يُغْنِيهِمْ۔ (سج)

”وہ دن جب کہ گدھی اپنے بھائی اور ماں باپ اور بھائی
اور بھائیوں سے بھاگے گا اس روز ہر شخص اپنے اپنے حال میں
مبتلا ہوگا۔“

موجودہ نظام میں یہ نقص ہے کہ یہاں قدرت کے انعامات
کی تقسیم انسان کے عمل اور اس کی خوبی پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ وہ
ایسے اسباب پر مبنی ہے جن میں ذاتی اعمال اور نفسی صلاحیتیں بعض
ایک سبب کی حیثیت رکھتی ہیں اور دوسرے قوی تر اسباب ان کے
تاثیر کو ضعیف بلکہ ہٹا دیتا ہے اسکل نازل کر دیتے ہیں۔ اس وجہ

سے معاملات کی تقسیم میں استحقاق ذاتی کو دخل نہیں ہوتا یا ہوتا مجھے ہے تو بہت کم۔ یہاں ایک شخص تمام عمر علم اور فسق کرنے کے باوجود خوشحالی اور دنیوی برکات سے مستحج ہو سکتا ہے، اور ایک شخص زندگی بھر ایسا غلامی اور پرہیزگاری کے ساتھ بسر کرنے کے باوجود غستہ سال اور دنیوی مصائب سے پرالہد حال نہ سکتا ہے یہ نقص تکمیل کا محتاج ہے۔ اور حکمت کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ نظام ترقی کر کے ایک ایسے نظام میں تبدیل ہو جائے جس میں حل کے ساتھ جزا و سزا کی تقسیم ہو، اور ہر شخص کو وہی ملے جس کا وہ اپنے ذاتی حسن و قبح کی بنا پر مستحق ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ دارالآخرت کا نظام ایسا ہی ہوگا۔

أَمْ تَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَنفُسِ أَمْ تَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ
كَالْفُجَّارِ (ص۔ ۳)

”کیا ہم ایمان لانے والوں اور نیک کام کرنے والوں کو
انہی جیسا بنا دیں گے جو زمین میں فساد کرتے ہیں؟ کیا ہم متقین
اور قاریوں کو فجار بنا دیں گے؟“

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَوْا الشَّقَاتِ أَنْ
تُجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
سَوَاءً وَثَقِيَّا هُمْ وَمَنْ أَتَقْوَمُ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ۔
(المائدہ: ۲)

”کیا بنکاریاں کرنے والے یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو
ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کے برابر کر دیں
گے اور ان کی زندگی و موت یکساں ہوگی؟ یہ کیسی بُری بات

ہے جس کا وہ حکم نکالتے ہیں۔

وَلِكُلِّ دَرَجَاتٍ عَمَلًا وَعِلْمًا۔ (الانعام۔ ۱۶)

”ہر ایک کے لئے وہی سی سی درجات ہوں گے جیسے انہوں

نے عمل کیے۔“

وَأَن لَّيْسَ الْجَنَّةُ بِالْمُتَشَوِّتِينَ وَتُورَثُ مِنَ الْجَنَّةِ

الْمُتَوَنِّتِينَ۔ (اشعراء۔ ۵)

”جنت پرگزگانوں کے قریب دئی جائے گی اور دوزخ

گراہوں کے غارتجے کر دی جائے گی۔“

یہ ہے اس دوسرے جہان کا نقشہ جس کو اس جہان کے بعد

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہب اور تمام انبیاء علیہم السلام کا مذہب

تجویز کرتا ہے۔ جو لوگ اس جہان اور اس کے سارے کارہائے کو

ایکٹ کیل، ایک گھروند، ایک بے مقصد و بے ماسل ہنگامہ،

اور ایک ایسا جمل گوکہ دھند بکتے ہیں جو اعمال سے شروع ہوا اور

ایمال ہی میں ختم ہو جائے گا، ان کو تو اس تجویز اور اس کے دلائل پر

شواہد میں کوئی بات ماننے کے قابل نظر نہ آئے گی۔ مگر جو شخص نظام

عالم کو خدا کا آفریدہ سمجھتا ہے اور خدا کو حکیم مانتا ہے وہ ان دلائل پر

خود کرنے کے بعد یقیناً یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گا کہ موجودہ نظام

عالم کے بعد اس طور اور اس کیفیت کے ایک نظام کا ہونا ضروری

ہے اور جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی

ممکن ہے، تو اس ممکن کی ضرورت کا ثابت ہو جانا اس بات پر ایمان

لانے کے لئے بالکل کافی ہے کہ خدائے حکیم و دانا اس ممکن

ضروری الوجود کو ضرور وجود بخشنے لگا۔

اس بحث سے واضح ہو گیا کہ اسلام نے جس حیات اخروی پر

ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے وہ بعد از عقل نہیں ہے جیسا کہ عمام
 طور پر خیال کیا جاتا ہے، بلکہ عین مستحکم عقل و حکمت ہے، اور
 علم و عقل کی کسی ترقی سے اس ایمان میں رجحان نہیں پڑ سکتا، بشرطیکہ وہ
 ترقی حقیقی ہو نہ کہ سبلی اور فاضلی۔
 اعتمادِ یوم آخر کی ضرورت

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ
 اس دنیوی زندگی کے بعد ایک اخروی زندگی کا وجود میں آنا ممکن
 اور اغلب اور احتمالی حکمت کے مطابق ہے، اور عقل (بشرطیکہ
 صحیح و تسلیم ہو) اور علم (بشرطیکہ حقیقی ہو) ہم کو اخروی زندگی کے اس
 تصور پر جو قرآن نے پیش کیا ہے، ایمان لانے سے روکتے نہیں
 بلکہ اس پر آمادہ کرتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اخروی زندگی کے
 اس تصور پر ایمان لانے کی ضرورت کیا ہے؟ اس کو ایمانیات میں
 کیوں داخل کیا گیا ہے؟ اس پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے کہ مسلمان
 جاننے کے لئے اس کو ماننا لازم ہو اور کوئی شخص اس کو تسلیم نہ
 بغیر مسلمان نہ ہو سکتا ہو؟ اس کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے کہ اس
 کا انکار کرنے کے بعد خدا اور رسول اور کتاب پر ایمان لانا بھی مانع نہ
 ہو، حتیٰ کہ زندگی بھر کے نیک اعمال میں غارت ہو جائیں؟ ایک شخص
 کہہ سکتا ہے کہ اخروی زندگی کا نظریہ ہی ویسا ہی ایک مابعد الطبیعی نظریہ
 ہے جیسے مابعد الطبیعیات کے دوسرے نظریات ہیں۔ ہم نے مانا کہ یہ

نہ آخرت کے مسائل کی مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن جلد دوم، صفحہ
 ۲۸۳۔ نیز مضمون "زندگی بعد موت" جو اس کتاب کے آخر میں بطور
 ضمیمہ درج ہے۔

نظر پر دلیل و محنت سے غلبہ مسلّم کر دیا گیا ہے، اور اس کو تسلیم کرنے کے لئے کافی وجہ موجود تھی۔ لیکن مابعد الطبیعیات کے کسی مسئلہ کا دلیل سے ثابت ہو جانا یہ معنی تو نہیں رکھتا کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہو جائے اور اسی پر کفر و اسلام کا مدار ٹھہرے۔ حیاتِ اخروی کی طرح مابعد الطبیعیات کے اور بھی بہت سے نظریات ایسے ہیں جن کی تائید میں قوی دلائل موجود ہیں۔ پھر ان سب کو بھی اسی طرح داخل ایمان کیوں ذکر کیا گیا؟

اگر حیاتِ اخروی کے اعتقاد کی حیثیت محض ایک مابعد الطبیعی مسئلہ کی ہوتی تو یہ امر حاضرِ یقیناً قوی ہوتا۔ اس صورت میں اس مسئلہ کو ایمانیات میں داخل کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی، کیوں کہ کبھی خاص مابعد الطبیعی مسئلہ کا اس حیثیت سے کہ وہ مابعد الطبیعی مسئلہ ہے، ہماری عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ہم اس سے غفلت اللہ ہیں ہوں، یا اس کو ماننے سے انکار بھی کر دیں تو ہمارے اخلاق اور اعمال پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن حیاتِ اخروی کے مسئلہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک فلسفیانہ مسئلہ ہی نہیں ہے، بلکہ انسان کی اخلاقی اور عملی زندگی سے اس کا ایک گہرا تعلق ہے، اس کو ماننے سے دُخوی زندگی اور اس کے معاملات کے متعلق انسان کا نقطہ نظر بنیادی طور پر بدل جاتا ہے اس اعتقاد کو تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو ایک ذمہ دار اور جواب دہ سمجھے، اور اپنی زندگی کے تمام معاملات پر سمجھے ہوئے انجام دے کہ وہ اپنی ہر حرکت اور ہر فعل کے لئے ذمہ دار ہے، آئندہ زندگی میں اس کو اپنے تمام اعمال کے جواب دہی کرنی ہے، اور مستقبل کی سعادت و شہادت اُسکے

سال کی ہوگی اور بدی پر منحصر ہے۔ بخلاف اس کے اس اعتقاد کو تسلیم نہ
 کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو غیر مقررہ اور غیر مسئول
 ہستی سمجھے اور اپنی دنیوی زندگی کا سارا پروگرام اس خیال کے
 تحت مرتب کرے کہ وہ اس زندگی کے احوال کے لئے جس دوسری
 زندگی میں جواہرہ نہیں ہے، اور آئندہ کوئی اچھا یا بُرا نتیجہ اس زندگی سے
 کے احوال و افعال پر مرتب ہونے والا نہیں ہے۔ اس عقیدہ
 کے خیال الذہن ہونے یا اس کو نہ ماننے کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ انسان
 کی نظر اپنے احوال کے صرف ان نتائج پر ہوگی جو اس دنیوی زندگی
 میں مرتب ہوتے ہیں، اور انہی نتائج کے لحاظ سے وہ دائرے
 قائم کرے گا کہ کون سا فعل اس کے لئے مفید ہے اور کون سا
 مضر۔ وہ دہر کھائے اور آگے میں ہاتھ ڈالنے سے ضرور احتراز کرے گا
 کیوں کہ اس کو معلوم ہے کہ وہ ان دونوں حرکتوں کے لئے نتائج
 اپنی اسی زندگی میں بھگتے گا۔ لیکن ظلم ہے انسانی، جھوٹ
 نصیبت، غیانت، رونا اور ایسے ہی دوسرے احوال کے پھوسے
 نتائج جو کہ اسی دنیوی زندگی میں  نہیں جیتے، اس لئے وہ ان سے بہت
 اسی حد تک و کتاب کرے گا جس حد تک ان کوئی بُرا نتیجہ اس زندگی میں مرتب
 ہونے کا اندیشہ ہو۔ اور جہاں کوئی بُرا نتیجہ مرتب ہوتا نظر نہ آئے
 یا برعکس اس کے ان سے کوئی فائدہ حاصل ہونے کی امید ہو، تو
 وہ ان احوال کے ارتکاب میں کوئی تاخیر نہ کرے گا۔ غرض یہ کہ اس
 تصور کے ماتحت اس کی نگاہ میں کسی اخلاقی فعل کی کوئی متعین اخلاقی
 قدر نہ ہوگی۔ بلکہ ہر ایسے فعل کی اچھائی اور بُرائی اس نتیجہ کی اچھائی
 اور بُرائی پر منحصر ہوگی جو اس پر اس دنیا میں مرتب ہوتا ہو۔ بخلاف
 اس کے جو شخص یوم آخر کا مستعد ہوگا اس کی نظر اپنے اخلاقی احوال

کے صرف اپنی ناسخ پر مد ہوگی جو اس زندگی میں مرتب ہوتے ہیں بلکہ وہ اُن آخری ناسخ پر نگاہ رکھے گا جو اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی میں ظاہر ہونے والے ہیں، اور ان ناسخ کے لحاظ سے ہر فعل کے مفید یا مضر ہونے کا فیصلہ کرے گا۔ اس کو جس طرح زہر کے ہلک اور آگ کے موذی ہونے کا یقین ہوگا اسی طرح خیانت اور جھوٹ کے ہلک اور موذی ہونے کا بھی یقین ہوگا۔ وہ جس طرح روٹی اور پانی کو مفید سمجھے گا اسی طرح صلہ و امانت اور حقّت کو بھی مفید سمجھے گا۔ وہ اپنے ہر فعل کے ایک متیقن اور یقینی نتیجہ کا قائل ہوگا خواہ وہ نتیجہ اس زندگی میں قطعاً ظاہر نہ ہو، بلکہ برعکس صورت میں ظاہر ہو۔ اُس کے پاس اخلاقی اعمال کی حسیں اخلاقی قدریں ہوں گی، اور ان قدروں میں دُنیوی فوائد یا مضرتوں سے کوئی تیسرے واقع نہ ہوگا۔ اس کے نظام اخلاق میں صداقت، انصاف، اور وفائے عہد بہر حال صواب اور حسن ہی ہوں گے، خواہ اس دُنیا میں ان سے سراسر نقصان ہی نقصان ہو اور قطعاً کوئی فائدہ نہ ہو۔ اور جھوٹ، ظلم اور بد عہدی بہر حال گناہ اور بدی ہی ہوں گے خواہ ان سے دُنیا میں سراسر فائدہ ہی فائدہ ہو اور فائدہ برابر کوئی نقصان نہ ہو۔

پس حیاتِ آخری کے احساس سے خالی الذہن ہونے یا اس کا انکار کر دینے کے معنی اسی قدر نہیں ہیں کہ انسان ایک ایسا علمی نظریہ سے خالی الذہن رہا یا اس شخص کو فکر کو ملتنے سے انکار کر دیا بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری اور مسئولیتِ حیثیت سے غافل ہو گیا، اپنے آپ کو مطلق انسان اور جوابدہی سے بری الذمہ سمجھ بیٹھا، دُنیا اور اس کی ظاہری زندگی اور اس کے غیر عمل بلکہ

ہم اوقات دھوکہ دینے والے نتائج سے مطمئن ہو گیا، اور اس نے
 آخری منافع اور آخری نقصانات سے غافل رہ کر محض ابستدائی اور
 عارضی اور ناقابل اعتبار منفعتوں اور مضرتوں کا اعتبار کر لیا اور انہی
 کے لحاظ سے اپنے افعال کی ایسی اخلاقی قدریں متعین کیں جو ہمارے
 والی اور دھوکہ دینے والی ہیں۔ وہ ایک سنگ اور پائیدار اخلاقی
 ضابطہ سے محروم ہو گیا جو ہر وقت ذمہ داری کے احساس اور آخری
 نتائج کے ملاحظہ اور متعین اخلاقی قدروں کے اعتبار ہی سے مضبوط
 ہو سکتا ہے، اور اسی طرح اس نے اپنی پوری زندگی دنیا کے ناقص
 سطحی مظاہر سے دھوکہ کھا کر ایک ایسے نا پائیدار اور غلط اخلاقی
 ضابطہ کے تحت بسر کی جس میں حقیقی مضرت منفعت بن گئی، اور
 حقیقی منفعت مضرت قرار پائی، حقیقی حسن قبح بن گیا اور حقیقی قبح
 حسن قرار پایا، حقیقی گناہ صواب بن گیا، اور حقیقی صواب گناہ قرار
 پایا۔

یوم آخر پر ایمان نہ لانے کے یہی نتائج ہیں جن کو قرآن مجید
 میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں آیات
 قرآنی کا مبیعہ کیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ تمام خرابیاں ایک
 ایک کر کے گمان گئی ہیں جو یوم آخر کو دہاتے سے انسان کے
 اخلاق اور اعمال میں پیدا ہوتی ہیں۔

۱۔ انسان اپنے آپ کو مہمل، مطلق العنان، غیر ذمہ دار سمجھتا
 ہے، اپنی زندگی کو بحیثیت مجموعی بے نتیجہ خیال کرتا ہے، اور یہ
 سمجھ کر کام کرتا ہے کہ کوئی اس کے کام کا نگران اور اس سے حساب
 لینے والا نہیں ہے۔

أَلَمْ يَخْلُقْنَا ۖ أَلَمْ نَجْعَلْ لَّكَ عَيْنًا ۖ وَآخِذًا

إِنَّمَا لَا تَرْجَعُونَ۔ (الزمنون۔ ۹)

”کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تم کو جہنم پہنچا دیا ہے اور تم ہم سے پاس واپس نہ لائے جاؤ گے؟“
 أَيْخَسِبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى۔

(الحجۃ۔ ۲)

”کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟“

أَيْخَسِبُ أَنْ لَنْ يُعْذِبرَهُ عَلَيِّهِ خَلْقًا يَتَّبِعُونَ
 أَهْلَكَ مَالًا لَبَدًا أَيْخَسِبُ أَنْ لَمْ يَرْكَبْ
 أَحَدًا۔ (المہملہ)

”کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اس پر کسی کا پس چپے گا؟“
 وہ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اکٹھا کیا۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اس کو نہیں دیکھا؟“

۲۔ ایسے آدمی کی نظر دنیا کے صرف ظاہری چیزوں پر مرکوز ہے
 ابتدائی اور سلیبی نتائج کو وہ آخری حصے اور حقیقی نتائج
 سمجھتا ہے، اور ان سے دھوکہ کھا کر غلط راستے قائم کر لیتا ہے۔

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ
 عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ۔ (الروم۔ ۱)

”وہ دنیوی زندگی کے صرف ظاہر کو جانتے اور آخرت
 سے تو وہ غافل ہی ہیں۔“

إِنَّ الدِّينَ لَا يَرْجُونَ إِبْشَارًا وَمَنْ خَسُوا مِنَ
 الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَمَّا بَاءَ۔ (یونس۔ ۱)

”جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے اور حیاتِ دنیا

سے ماضی اور ماضی ہو گئے۔
 كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتُهْمِلُوْنَ الْآخِرَةَ
 (التجسس۔ ۱)

ہرگز نہیں تم تو فوری حاصل ہونے والے ناکج کو پسند
 کرتے ہو اور آخرت کے ناکج کو بھڑکتے ہو۔
 بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ خَيْرًا
 وَابْتِغَىٰ (الاعمال)

”تم حیات دنیا کو ترجیح دیتے ہو مگر آخرت بہتر ہے
 اور زیادہ پائیدار ہے۔“

وَمَنْ تَهْمَلِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۔ (الاعمال۔ ۶)

”ان کو بیت دنیا نے دھوکہ میں لال دیا ہے۔“

۳۔ اس ظاہر یعنی کاغذ پر یہ ہوتا ہے کہ انسان کی نگاہ میں اشیاء
 کی اخلاقی قدروں کا معیار بالکل اُنسا ہو جاتا ہے۔ جو چیزیں حقیقت
 میں اپنے آخری ناکج کے لحاظ سے مضر ہوتی ہیں۔ ان کو وہ
 فوری فوائد پر نظر رکھنے کی وجہ سے مفید سمجھتا ہے، اور جو احوال
 آخری ناکج کے لحاظ سے غلط ہیں ان کو وہ ابتدائی ناکج کا لحاظ
 کے بغیر و صلاح سمجھنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی دنیوی
 کوششیں صحیح راہوں سے ہلکتی جاتی ہیں اور آخر کار ضائع ہو
 جاتی ہیں۔

فَاِنَّ الدِّیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْيَا
 یَلْبِثُ لَنَا مِثْلَ مَا اُولٰٓئِکَ قَامُوْا اِنَّہُمْ لَفٰو
 حِطَّ غُلُوْہِمْ وَقَالِ الدِّیْنِ اَوْ کُوا الْعٰلَمِ وَیَبْکُفُ
 ثَوَابِ اللّٰہِ غَیْرُہٗ لَیْسَ اَمِّنٌ وَفِیْہِ

صَالِحًا۔ (القصص۔ ۸)

”جو لوگ دُنیوی زندگی ہی کے قانون کو پہنچتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ کاشش ہم کو بھی وہی ملتا جو قانون کو دیا گیا ہے، وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے۔ اور جن لوگوں کو ہم دیا گیا تھا انہوں نے کہا کہ تم پر انصاف، اللہ کا جواب اس شخص کے لیے بہت اچھا ہے جو ایمان لایا اور جس نے نیک اعمال کیے۔“

إِنَّ الدِّينَ لَا يَكُونُ مَشْنُونًا بِالْأَعْدَاءِ
لَهُمْ أَعْيَانُ لَهُمْ قَوْمٌ يَعْتَبِرُونَ۔ (النمل۔ ۱)

”جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے لیے ہم ان کے کرتوتوں کو خوشنما بنا دیتے ہیں اور وہ سیکھ سکتے ہیں۔“

أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُسَبِّحُ بِحَمْدِهِمْ بِمَنْ شَاءَ
وَبَشِيرِ غُلَامٍ ؕ أَلَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ بَلٌّ لَا يَشْعُرُونَ ؕ
(المؤمنون۔ ۳)

”کیا یہ لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہم جو ان کو مال اور اولاد سے مدد دیتے ہاں ہے میں تو گویا ان کے لیے بھلائیوں میں سرگرم ہیں ؟ مگر لوگ حقیقت کو نہیں سمجھتے۔“

هَلْ كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ
مَنْ يَشْهَدُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ
أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعَهُمْ ؕ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ
كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِمْ فَحَبِطَتْ

أَهْمًا الْهَمُّ - (الکبت - ۳۰)

”کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ ٹھٹھے میں کون لوگ ہیں؟ وہ بھی کی کوششیں حیاتِ دُنیا میں بھٹک گئیں مگر وہ سمجھتے رہے کہ وہ اپنے کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے سبک نشانیوں اور اس کی نواقات کا انکار کیا، اس لیے ان کے اعمال خالص

بھٹک گئے۔“
 ۳۔ ایسا شخص کبھی دینِ حق کو قبول نہیں کر سکتا۔ جب کبھی اس کے سامنے مکارمِ اخلاق اور اعمالِ صالحہ اور راستِ ندی کے طریقے پیش کیے جائیں گے، وہ ان کو رد کر دے گا، اور جان کے خلاف عقائد اور اعمال پیش کیے جائیں گے تو وہ انہیں اختیار کرے گا۔ کیونکہ دین کے جتنے طریقے ہیں وہ دنیوی زندگی کے بہت سے فوائد و منافع اور بہت سی لذتوں کی قربانیاں چاہتے ہیں، اور ان کا اصلُ الاصول یہ ہے کہ آخرت کے بہتر اور پائیدار فوائد کے لیے دُنیا کے مادی فوائد کو قربان کر دے۔ مگر مگر آخرت اسی دُنیا کے فوائد کو فوائد سمجھتا ہے، اس لیے وہ جیسی کسی قربانی کے لیے تیار ہو سکتا ہے، اور دینداری کے ان طریقوں کو اختیار کر سکتا ہے جو ان قربانیوں کے طالب ہیں۔ لہذا انکارِ آخرت اوّل دینِ حق کی پیروی دونوں ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔ جو منکرِ آخرت ہو گا وہ کبھی دینِ حق کا پیرو نہیں ہو سکتا۔

سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِعَدْوِي الْحَقِّ وَإِنْ يَرَوْا كَلًّا آيَةً لَا يَأْمِنُوكَ
 بِهَا وَإِنْ يَرَوْا سَمِيلَ الْوَسْطِ لَا يَتَّخِذُوا سَبِيلًا

وَأَنْ تَرَوْا سَبِيلَ النَّارِ يَسْعِدْكُمْ وَكَانَ سَبِيلُهَا ذَلِكَ
بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَفَرُوا بِهَا فَعُولُونَ
الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِئَاءِ الْأَجْزَةِ سَبِطُ
أَعْيُنِنَا هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔

(الاحزاب۔ ۳)

”میں اپنی نشانوں سے ان لوگوں کو ہمراہی کا جو زمین
میں حق کے بیخ کن کرتے ہیں۔ وہ خواہ کوئی آیت دیکھ لیں،
اس پر ایمان نہ لائیں گے، اور اگر راہِ راست کو دیکھیں گے تو
اسے اختیار نہ کریں گے، اور اگر غلط راستے کو دیکھیں گے تو
اس پر چل پڑیں گے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے ہماری نشانوں
کو چھلایا اور ان سے غافل رہے۔ اور جو لوگ ہماری نشانوں
اور آخرت کی علامات کو چھلایں گے ان کے احوال اکارت
ہو جائیں گے۔ کیا ان کو وہیابی بدلہ نہ دے گا جیسے انہوں نے

عمل کیے ہیں ؟

۵۔ انکارِ آخرت سے انسان کی پوری اخلاق اور عملی زندگی متاثر
ہوتی ہے۔ وہ حکم اور سرکش ہو جاتا ہے۔

فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكَرَةٌ
وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ۔ (الزلزلہ۔ ۴)

”جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل حق
بات سے انکار کرنے لگے ہیں اور وہ حکم پر ہاتھ نہیں
ڈالتے۔ اَسْتَكَبَرُوا وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالْآيَاتِ
الْحَقِّ وَعَلَّوْا إِلَهُهُمْ إِلَيْنَا لَا يُؤْمِنُونَ۔

(القصص۔ ۲۵)

”فرعون اور اس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے بکھر کیا اور کہنے لگے کہ وہ ہمارے پاس واپس نہ لائے جائیں گے۔“

اس کے معاملات بگڑ جاتے ہیں۔

وَيَلْعَنُ الْمُطَافِقُونَ الَّذِينَ إِذَا أَكْتَالُوا عَلَى
النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَكَّلَ لَهُمْ
يُخْسِرُونَ ۚ أَلَا يَتَنَبَّأُونَ آلَهُمْ مِمَّا قَدَرُوا
بِالْيَوْمِ عَظِيمٍ ۚ (المطفقون)

”تہاکی ہے ان بد معاملہ لوگوں کی کہ جو دوسروں سے لینے
ہیں تو پٹھا پٹھا ٹاپ تول کہتے ہیں اور جب دوسروں کو ٹاپ تول
کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔ کیا وہ نہیں سمجھتے کہ وہ ایک دن
وہ انہماکے ہالے والے ہیں؟“

وہ سنگیل، تنگ نظر، زباناں، خود غرض، اور عبادت الہی کے
دو گرداں جو ہا ماس ہے۔

أَمْ أَمِنتَ الَّذِينَ يُكَلِّمُ بِالْإِسْلَامِ هَذَا
الَّذِينَ يَدْعُوُ إِلَى التَّبَعِ لَهُمْ وَلَا يُحِصُّ عَلَى مَا يَمُرُّ
بِالسُّلَاطِينِ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ
سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ يُرَاؤُونَ وَهُمْ يُنْفَعُونَ
الْمَاعُونَ (الاعون)

”کیا تو نے دیکھا کس شخص کو جو ہر روز اکی ٹکڑی کتاب ہے؟
وہی تو ہے جو قیم کو دے کر کتاب ہے اور مسکین کو کھانا کھانے پر
نہیں ابھارتا۔ ہر نفوس ہے ان نڈالوں پر جو اپنی نالوں سے
غفلت کرتے ہیں۔ جو عمل چکٹ کرتے ہیں تو دکھانے کے

ہیں، اور چھوٹی چھوٹی مام ضرورت کی چیزیں بھی لوگوں کو دینے
شما حدیث کرتے رہو۔

مختصر یہ کہ حق سے تہاؤز کرنا اور گناہوں میں مبتلا ہونا انکارِ انکار
کا لازمی نتیجہ ہے۔

وَمَا يَكْذِبُ يَدُ يَدِ إِلَّا كَلٌّ مُعْتَدٍ أَوْثَقُ

(المطففين)

جہلوم الجواہر کی نگاہیں غیب میں گناہوں کا مگر ہر وہ شخص جو حق سے تہاؤز

کر گیا اور گناہوں میں پھنس گیا۔

یوم آخر کے اعتقاد سے غلامِ اللہ میں یا منکر بھولنے کے یہاں سے
نہایت میں ہیں سے کوئی صاحب عقل انکار نہیں کر سکتا۔ خصوصاً جبکہ ہم
اپنی آنکھوں سے اس قدر کے ثمرات بھی دیکھ چکے ہیں جو ظاہر حیات
دُنیا پر فریاد ہو کر زندگی کے غصے و زنجیر اور مادی مطیع نظریہ قائم ہوا
ہے، اور حیاتِ اخروی کے عقیدے سے بیکسر غلام ہے، یہاں سے لے
اس حقیقت سے انکار کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ انکار
آخرت کے ساتھ خدا پرستی، دینداری اور مکارمِ اخلاق کا قیام ممکن
نہاں ممکن ہے۔

اب دیکھئے کہ اسلام جب انہی چیزوں کو قائم کرنا چاہتا ہے،
جب وہ انسان کو اخلاقی فاضلہ اور اعلیٰ سالک کی طرف دعوت دیتا
ہے جس کے لئے دُنیا کی بہت سی مادی لذتوں اور مشغلتوں کی قربانی
ضروری ہے، جب وہ انسان کو محاببتِ اہل اور تزکیہ نفس کی حقیقتیں
کرتا ہے جس کا کوئی فائدہ اس دُنیا میں مترتب ہوتا نظر نہیں آتا بلکہ
اس کے برعکس بہت سی تکلیفوں اور مشغلتوں میں انسان کے نفس اور
جسم کو مبتلا ہونا پڑتا ہے، جب وہ زندگی کے تمام معاملات اور

دنیا کے اسباب و وسائل سے مستحق ہونے میں حرام و حلال اور
 حبیث و طیب کا امتیاز قائم کرتا ہے، جب وہ بالاتر روحانی مقاصد
 کے لئے انسان سے شخصی اغراض اور شخصی مصلحتوں اور رغبتوں اور
 بنا اوقات بہان و مال بک کو قربان کر دینے کا مطالبہ کرتا ہے،
 اور جب وہ انسان کی زندگی کو ایک ایسے اخلاقی ضابطہ کے تحت
 منضبط کرنا چاہتا ہے جس میں دنیوی فائدے اور نقصان سے قطع
 نظر کے ہر شے کی ایک خاص اخلاقی قدر متعین کر دی گئی ہے،
 تو کیا وہ ایسے دن اور ایسی شریعت کو قائم کرنے میں عقیدہ حیات
 اخروی کے بغیر کامیاب ہو سکتا تھا؟ کیا یہ ممکن تھا کہ انسان اس
 عقیدہ سے غالی الذہن یا منکر ہوتے ہوئے ایسی تعلیم کو قبول کر
 لیتا؟ اگر جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی میں ہے، تو ماننا پڑے
 گا کہ اس قسم کے نظام دینی اور ضابطہ اخلاقی کو قائم کرنے کے لئے
 ناگزیر ہے کہ سب سے پہلے انسان کے دل میں حیات اخروی کے
 عقیدہ کو راسخ کر دیا جائے۔ پس یہی وجہ ہے جس کی بنا پر اسلام
 نے اس عقیدہ کو ایمانیات میں داخل کیا ہے اور اس پر اتنا زور
 دیا ہے کہ ایمانِ ہاشم کے بعد اور کسی چیز پر اتنا زور نہیں دیا۔
 آئیے اب ہم دیکھیں کہ اسلام نے اس عقیدہ کو کس شکل میں پیش
 کیا ہے اور اس سے انسان کے اخلاق و اعمال پر کیا اثرات مرتب
 ہوتے ہیں۔

دنیا پر آخرت کو ترجیح

سب سے پہلی چیز جس کو قرآن مجید نے انسان کے ذہن نشین
 کرنے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا انسان کے لئے ایک ماری
 ہے۔ قیام ہے۔ اس کے لئے صرف یہی ایک زندگی نہیں ہے بلکہ

اس کے بعد ایک دوسری زندگی اس سے ہزار اور پانچہ تریجی ہے جس کے فوائد یہاں کے فائدوں سے زیادہ فراوان اور جس کے نقصانات یہاں کے نقصانات سے زیادہ سخت ہیں۔ جو شخص اس دنیا کے مظاہر سے دھوکہ کھا کر اسی کی لذتوں اور منفعتوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے، اور ان کو حاصل کرنے کے لئے ایسی کوششیں کرتا ہے، جکی بدولت اس دوسری زندگی کی لذتیں اور منفعتیں اسے حاصل نہیں ہو سکتیں، وہ بہت بُرا سوداگر ثابت ہے اور حقیقت میں اس کی یہ تہارت سراسر نقصان کی تہارت ہے۔ اسی طرح جو شخص اس دنیا کے نقصان ہی کو نقصان سمجھتا ہے اور اس سے بچنے کے لئے ایسی سخی کرتا ہے جس سے وہ اپنے آپ کو اس دوسری زندگی کے نقصان کا مستحق بناتا ہے، وہ بہت بڑی حماقت کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کا یہ فعل کسی طمع و مقصد کے دانش مندی نہیں ہے۔ اس مضمون کو قرآن مجید میں اس کثرت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ تمام آیات کا استقصاء یہاں ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر آیات ذیل ملاحظہ ہوں۔

مَآلِکُ الْحَیْوَةِ الدُّنْیَا إِلَّا لَہٗوَ ۖ وَلَٰجِبٌ لَّکُمُ الْآٰخِرَةُ لَہِیْنَ الْحَیْوَٰتِ۔ (الحکمت۔ ۷)

”یہ دنیا بکھر نہیں ہے مگر ہو و سب۔ اور اصل زندگی کا

گمراہی ہی ہے۔“

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیلٌ ۖ وَالْآٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّمَنِ

اٰتٰی ۚ۔ (انعام۔ ۸)

”کہو اسے خدا کہ متاع دنیا تھوڑی سی ہے، اور آخرت

اس کے لئے بہتر ہے جو بدو و زکاری کے ساتھ زندگی بسر کرے۔“

اَمْ رَضِیْتُمْ بِالْحَیْوَۃِ الدُّنْیَا مِنْ الْآٰخِرَةِ

فَمَا مَشَاغُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْأَجْرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ۔

(التوبہ۔ ۶)

”کیا تم آخرت کے عوض دنیا کی زندگی سے ماضی بھگتے؟
دنیا کی زندگی کے سلسلے میں آخرت کے مقابلے میں بہت سی غولیں
پڑھیں۔“

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ غَيْرًا
وَأَفْلَحَ۔ (الاحق)

”تم حیات دنیا کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت زیادہ بہتر
اور دائمی بہتے والا ہے۔“

مَثَلُ نَفْسٍ ذَا لُبَّةٍ الْمَوْتِ وَإِلْمَا تُولَدُونَ
الْجُودَ كَفَرْتُمْ بِالْقُرْآنِ فَمَنْ نُنْزِلْ عَنْ السَّمَاءِ
وَأَذْجَلِ الْجَنَّةِ لَقَدْ نَاسًا وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا
إِلَّا مَتَاعٌ الْغُرُورِ۔ (آل عمران۔ ۱۶)

”ہر شخص کو موت کا سزا پہنچا ہے اور تم کو اپنی اس زندگی
کے لئے نفس ذال لبہ کے قیامت کے دن پٹنے والے ہی ہیں
اس سزا جو شخص آگ کے جلاب سے پڑ گیا اور جنت میں داخل
کیا گیا وہی اصل میں کامیاب ہوا۔ وہی اس دنیا کی زندگی تو بہ
مضی دھوکے کا سلسلہ ہے۔“

وَأَنذَرِ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا
مُجْرِمِينَ۔ (مومنین۔ ۱۰)

”جن لوگوں نے اپنے اُترے آپ غلم کیا ہے۔ وہ انہیں
لذتوں کے پیچھے پڑے رہے جہاں کو دی گئی تھیں اور وہ مجرم
ہوئے۔“

قُلْ إِنَّ الْخَاسِرِينَ الْبَشَرُ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ
وَأَهْلِيَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَلَا ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ
الْمُبِينُ (الاسراء-۲)

”اے خدا کے بند کہ سخت نقصان میں وہ لوگ ہیں جنہوں
نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل بچوں کو قیامت کی ہون نقصان
میں ڈالا۔ یہی اصل ہار کہلا رہا تھا ہے۔“

فَأَمَّا مَنْ طَغَىٰ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا فَإِنَّ
الْخُسْرَ مِنْهُنَّ الْمَأْوَىٰ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ
وَتَقَىٰ النَّفْسَ الْهَوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ مِنْهُنَّ الْمَأْوَىٰ۔
(الناس-۲)

”پھر جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تو جہنم
اس کا گناہ ہے۔ اور جس نے اپنے رب کے سامنے ڈرتے ہوئے
کا خوف کیا اور نفس کو خواہشات سے روکا، تو جنت اس کا
گناہ ہے۔“

اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهُوَ
وَعِيشَةٌ ۖ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ ۖ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ ۖ وَ
الْأُولَادِ ۖ كَيْسَلٌ غِثٌّ ۖ فُحْشٌ الْكُفَّاءِ ۖ نِبَاهٌ ۖ
شَرٌّ يَنْهَىٰ ۖ فَتُرْمَ ۖ مُصْفَرًّا ۖ ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا ۖ
فِي الْآخِرَةِ ۖ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ وَمَغْفِرَةٌ ۖ وَرَحْمَةٌ ۖ مِنَ اللَّهِ
وَرَحْمَتُهُ ۖ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ ۖ وَتَفَاخُرٌ ۖ

(الحادی-۲)

”یہاں لوگ جیتے دنیا تو اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس
میں کھیل اور کھو اور ریت اور آپس کا تفاخر اور مال و اولاد میں

ایک دوسرے سے ڈر رہا تھا ہے۔ اس کی مثال بارش کی سی ہے کہ اس سے کچھ اہل حق ہے اور کبھی اس کو دیکھ کر خوشی ملنے لگی۔ پھر وہ پاک کر تک بھولتی ہے اور خود دیکھتا ہے کہ وہ نہ دیکھ لگتی اور آخر کار دودھ ڈال گئی۔ اس کے بعد آخرت کی زندگی ہے جس میں کسی کے لیے سخت عذاب ہے اور کسی کے لیے اللہ کے رحمت سے مغفرت اور خوشنودی۔ پس دنیا کی زندگی میں ایک دھوکے کا سامان ہے۔

رُتِبَ الثَّانِي مِنْ حُبِّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ
وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ
الْهَيْئَةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْخَرْبِ
ذَٰلِكَ مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَ ذَٰلِكَ
النَّابِ۔ قُلْ أُوْنِتُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذَٰلِكُمْ لِلدُّنْيَا
الَّتِي كُنتُمْ تَعْمَلُونَ شَجَرِي وَمِنْ ثَمَرَاتِهَا
الَّتِي أَكُلُ مِنْ لَّحْيِي ثُمَّ يَرْجِلُهَا وَاعْبُرَهَا
مِنَ النَّارِ (آل عمران - ۱۴)

”لوگوں کے لیے جو تین اور بچوں اور سونے چاندی کے
ڈھیروں اور نشان کے بھونے گھوڑوں اور جانوروں اور کشتوں کی
محبت خوشنودی گئی ہے۔ یہ خوشی زندگی کی مثال ہے۔ مگر
اللہ کے پاس اس سے چھٹا تھا ہے جو اسے لگا دیا میں تمہیں
اس سے بہتر مثال کی خبر دوں گا۔ میں لوگوں نے پرہیزگاری اختیار
کی ان کے لیے ان کے یہ دیکھ کے پاس جنتیں ہیں جن کے لیے
خبریں جاری ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ ہیں گے اور ان کو پاکیزہ
الواجب ہیں گی اور وہ اللہ کی خوشنودی سے سرشار ہوں گے۔“

دُنیا پر آخرت کی ترجیح اور آخرت کی دائمی کامیابی کے لئے دُنیا کے مادی منافع کو قربان کرنے، اور آخرت کی ابدی کامرانی سے بچنے کے لئے دُنیا کے چند رونہ نقصانات کو برداشت کرنے کی یہ تعلیم نہایت پُر زور اور مؤثر انداز سے اسلام میں دی گئی ہے۔ اور اس کا منشا یہ ہے کہ جو شخص قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا ہے وہ کسی زور اور زبردستی سے نہیں بلکہ اپنی دلی رغبت سے ہر وہ کام کرے جسکو کتاب اور رسول نے آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بتایا ہے، اور ہر اُس چیز سے اجتناب کرے جس کو ان دونوں نے آخرت کے نقصانات کا سبب قرار دیا ہے، خواہ دُنیا میں وہ اس کے لئے کتنا ہی مفید یا مضر ہو۔

نامہ اعمال اور عدالت

دوسری بات جس کو قرآن مجید نے انسان کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی ہے، یہ ہے کہ انسان اپنی دُنوی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے، خواہ کتنا ہی چھپا کر کرے، اُس کا ٹھیک ٹھیک ریکارڈ محفوظ رہتا ہے۔ قیامت کے روز یہی ریکارڈ خدا کی عدالت میں پیش ہو گا۔ ہر فرقہ جس کو انسان کے افعال سے کسی نوع کا تعلق رہا ہے، اس کے ان افعال پر گواہی دے گا۔ حتیٰ کہ خود اس کے اپنے اعضاء بھی اس کے خلاف گواہوں کے گہرے میں گہرے ہوں گے۔ پھر اسکے نامہ اعمال کا نہایت سچا وزن کیا جائے گا۔ میزانِ عدل کے ایک پلے میں اس کے نیک اعمال ہوں گے اور دوسرے پلے میں بُرے اعمال۔ اگر نیک کا پلٹا بھک گیا تو آخرت کی کامیابیاں اس کا خیر مقدم کریں گی اور جنت اس کے لئے چلنے کی قیام ہوگی۔ اور بُری کا پلٹا بھاری رہا تو خسراں میں اس کا نتیجہ ہوگا اور وہ بدترین مقام اس کے

نے تجویز کیا ہائے گامی کا نام دوزخ ہے۔ اُس عدالت میں ہر شخص
 تنہا اپنے نامہ اعمال کے ساتھ حاضر ہوگا اور دُنیوی اسباب میں سے
 کوئی چیز اس کے کام نہ آئے گی۔ نہ نبی اعزاز، نہ سنی و سفارش، نہ
 مال و دولت، اور نہ قوت و طاقت۔

اس مضمون کو بھی بڑی تفصیل کے ساتھ اور بڑے مؤثر انداز میں
 بیان کیا گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند آیات یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

نامہ اعمال کی کیفیت:

سَوَاءٌ يَسْأَلُكَ عَنْ أَسْرَارِ الْقَوْلِ وَمَنْ جَهَنَّمَ
 بِهِ، وَمَنْ هُوَ مُسْتَخَفٌّ بِالْقِيلِ وَسَائِرُكَ بِالْقَهَارِ
 لَمْ تُعْطِ قَلْبَ مَنْ يَدِينُ بِدِينِهِ، وَمَنْ خَلُوهُ
 يَحْفَظُونَكَ، مَنْ أَسْرَأَ اللَّهُ۔ (المع-۲)

”تم میں سے جو شخص چھپا کر بات کرتا ہے اور جہنم سے
 بے خوف ہے اور جو شخص بات کی تاریکی میں چھپا ہوا ہے اور جہنم کی
 دشمنی میں چل رہا ہے، دونوں یکساں ہیں۔ ہر حال ہر ایک کے
 آگے اسی بے لگائی کرنے والے کے ہوئے ہیں اور وہ خدا
 کے حکم سے اس کی ہر بات ثبت کر دیتا ہے۔“

وَوَجْهَ الْكِتَابِ فَتَرَى النُّجُومَ بِقِيَمَتِهَا
 بِمِثَابِهَا وَيَتَوَلَّوْنَ يَتَوَلَّتْهَا مَلَكُ هَذَا الْكِتَابِ
 لَا يُغَادِرُ صِفْرَةً وَلَا كَيْفَرَةً إِلَّا أَحْضَرَهَا
 وَجَدْنَا مَا عَمِلُوا خَافِرًا۔ (الکہف-۶)

”یہ نامہ اعمال پیش ہوگا تو اس میں جو کچھ لکھا ہوگا، تم دیکھو
 گے کہ جرم اس سے غریب ہے اور کبھی گے کہ اسے انھوں نے
 اس کتاب کا کیا مال ہے کہ کوئی سہولت یا دشواری اس میں نہیں چھوٹی۔“

سب اس میں موجود ہے۔ جو کچھ انہوں نے عمل کیے تھے ان سب کو وہ حاضر رہیں گے۔

اعضائے گواہی اور انسان کا احترام،

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْبَتُّهُمْ وَأَيُّدُهُمْ
وَأَنَّهُ جُلُّوْهُمَ إِنَّمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (انور۔ ۳)

”وہ دن جب کہ ان پر خود ان کی رہائیں اور ان کے اپنے ہاتھ باوجود ان اعمال کی گواہی دیں گے جو انہوں نے کیے تھے“
یَحْسَبُ إِذَا مَا جَاءُوْهُمَ شَهِدَةٌ عَلَيْهِمْ سَنُكْفِرُ
وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ إِنَّمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ
وَقَالُوا لَجُلُوْدُهُمْ لِمَ شَهِدَتْ عَلَيْنَا قَالُوا
أَلَطَقْنَا إِلَٰهَ الْبَدَنِ الْأَنفَقَ كُلَّ شَيْءٍ..... وَمَا
كُنْتُمْ تَشْكُرُونَ أَن تَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَنُكْفِرُ
وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا جُلُوْدُهُمْ وَلَكِنْ ظَنَنْتُمْ
أَنَٰلِلَّهِ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ۔

(ظہر السجدہ۔ ۳)

”یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو ان پر ان کے
کام اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں اور ان کی گواہی دیں
گی جو وہ کرتے تھے۔ وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے
ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم کو اچھے
خدا نے گواہی کتنی ہے جس نے ہر شے کو گواہ کر دیا ہے.....
..... تم چپا کر کام کرتے تھے اور دہاتے تھے کہ تمہارے اعمال
پر خود تمہارے کام اور آنکھیں اور کھالیں گواہی دیں گی۔ بلکہ تم
سمجھتے تھے کہ تمہارے بہت سے اعمال سے اللہ بھی ناواقف

وَشَهِدُوا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ اَتَقْتُلُوا كُفْرًاۙ

(الانعام-۱۶)

”وہ خود اپنے خلاف شہادت دی گئے کہ وہ کافر گوار

بنے تھے۔“

اس نامہ اعمال اور ان شاہدوں کے ساتھ انسان خدا کی عدالت میں پیش ہوگا۔ پھر اس پیش کی کیا کیفیت ہوگی ؟ وہ اکیلا ہے یا رو مددگار کھڑا ہوگا۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا نُورًا لِّمَنْ اَشَاءُ كَمَا جَعَلْنَا نُّورًا
مُّرَّةً وَّتَرَكْنَا مَا هَوٰى لِّلْكَافِرِۙ اَوْ ظَلَمُوۡنَ كُفْرًاۙ

(الانعام-۱۷)

”اب تم ہمارے پاس ویسے ہی یکہ و تنہا آئے ہو جیسا ہم نے تم کو پہلے بار پیدا کیا تھا۔ تم ان سب چیزوں کو چھوڑ گئے ہو جو ہم نے تم کو دی تھیں۔“

ہر شخص آپ اپنا حساب پیش کرے گا۔

وَكُلُّ الْاِنْسَانِ اِلٰهَۃً طٰغُوۡتًاۙ فِیۡ اَعۡنُقِهِۦۙ وَلَخٰۤیۡرٌ
لَّہٗ یَوْمَ الْقٰیۡمَةِۚ کُتٰبًا یُّلَاقٰہُۙ مَسْخُوۡرًاۙ اَرۡقُطًاۙ
یَکُتٰبُکَ کُلِّیۡۙ یُنۡفِیۡکَ الیَیَّوۡمِ عَلٰیۤکَ حَسِبٰہُۙ

(نہی اسرائیل-۲)

ہر شخص کی گردن اور ہڈیوں کا نوشتہ ہم نے اس کے گلے میں ڈکا رکھا ہے اور ہم اس کے لیے قیامت کے روز ایک کتاب نکالیں گے جس کو وہ اپنے سامنے کھلے گا یا پھٹے گا۔ اس سے کہا جائے گا کہ اپنا نامہ اعمال پڑھ، آج خود تو ہی پڑھا

حساب کرنے کیلئے کافی ہے۔
 غامضی اثرات بھی کام نہ آئیں گے،
 لَنْ تَنفَعَكُمُ أَمْهَاتُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ
 الْقِيَامَةِ۔ (التہذیب - ۱)

”قیامت کے روز تمہارے پس منظر میں بھی کام نہیں آئے گا
 اور نہ اولاد۔“

سفارش سے کام نہ چلے گا،
 مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَیْثُ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ۔
 (المومن - ۲)

”ظالموں کیسے نہ کوئی دوست ہو گا نہ کسی سفارشی کی
 بات مانی جائے گی۔
 رشوت نہ چلے گی۔“

يَوْمَ لَا يَنْفَعُكُمْ مَالٌ وَلَا بَنُونَ۔ (الشعراء - ۵)
 ”وہ دن جب کہ دھل کام آئے گا اور نہ اولاد۔“
 اہمال تو رہ جائیں گے اور ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا،
 وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيُوزَنَ الْقِيَامَةُ فَلَا
 تَظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَأَنْ كَانَتْ مِثْقَالَ حَبَّةٍ
 مِنْ حَنْدَلٍ أَلْهَيْتُمَا بِهَا وَكُنَّا حَاسِبِينَ۔

(الانبیاء - ۴)
 ”ہم قیامت کے روز ٹھیک تو تھے دے دے کر دو ٹکڑے کر دیتے
 گے۔ کسی پر ذرہ برابر غلط نہ ہوگا۔ اور اگر ایک دانے کے برابر بھر
 بھی مل ہوگا تو ہم اس کو بے آٹھ کے اور ہم حساب کرنے
 کیلئے کافی ہیں۔“

جنا اور سزا جو کہ ہو، عمل کے مطابق ہوگا۔

الْيَوْمَ تَجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَحْتَفِلُونَ۔ (الباقیہ۔ ۴)

”ہر ایک اپنے ویسے ویسے جھگڑے جیسے انہوں نے عمل کیے“

وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا۔ (الانعام۔ ۶)

”آج تم کو دیا جائیگا جیسے تم عمل کرتے تھے۔“

یہ وہ پولیس اور عدالت ہے جس کا خوف انسان کے نفس میں بٹھا دیا گیا ہے یہ دنیا کی پولیس نہیں ہے جس کی نگاہ سے لڑنا بچ سکتا ہے، نہ یہ دنیا کی عدالت ہے جس کی گرفت سے انسان شہادتوں کے فراہم نہ ہونے یا جھوٹی شہادتیں فراہم ہو جانے کا ناہائز اثرات پڑ جانے کی بدولت زبان پا سکتا ہے بلکہ یہ ایسی پولیس ہے جو ہر حال میں اس کی نگرانی کر رہی ہے، اور یہ ایسی عدالت ہے جس کے گواہوں کی نظر سے وہ کسی طرح بچ ہی نہیں سکتا، جس کے پاس اس کے ہر خیال اور ہر عمل کی نوداد موجود ہے، اور جس کے فیصلے اتنے منصفانہ ہیں کہ کوئی گناہ سزا سے اور کوئی صواب جزا سے چھوٹی نہیں سکتا۔

اختیارِ یومِ آخر کا فائدہ

اس طرح اسلام نے یومِ آخر کے عقیدہ کو اپنے ضابطہ اخلاق اور نظامِ شرعی کے لئے ایک زبردست پشت پناہ بنا دیا ہے جس میں ایک طوفِ خیر و صلاح پر عمل کرنے اور شر و فساد سے بچنے کے لئے عقلی ترغیب بھی موجود ہے، اور دوسری طرف نیک پر یقینی جزا اور ہڈی پر یقینی سزا کا خوف بھی۔ اس کا ضابطہ اور نظام اپنے ہتھوڑے استکام کے لئے مادی طاقت اور مالکیت کا اقتدار کا محتاج نہیں ہے، بلکہ وہ ایمان یا یومِ الآخر کے ذریعہ سے انسان کے نفس میں ایک

ایسے طاقت ور ضمیر کی تشکیل کرتا ہے جو کہیں بیرونی قہار اور خوف کے بغیر انسان کو آپ سے آپہنچانے کیوں کی طرف راغب کرتا ہے۔ جن کو اسلام نے آخری ناسخ کے اعتبار سے نئی قرار دیا ہے، اور ان گناہوں سے بچنے کی تاکید کرتا ہے جن کو اُس نے آخری ناسخ کا لفاظ کر کے سے گناہ غیر لایا ہے۔

قرآن مجید میں آپ دیکھیں گے کہ جگہ جگہ اس عقیدہ کو مقام اخلاق کی تعلیم کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کا حکم دیا جاتا ہے تو ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے کہ :

وَاتَّقُوا اللَّهَ فَإِنَّكُمْ تَخْشَوْنَ

(البقرہ - ۲۸)

”اللہ سے ڈرو اور ہاں رکھو کہ تم کو اس کے پاس حاضر ہونا

ہے“

یہی دلائل دیا جاتا ہے کہ اگر تم اللہ سے ڈاؤ گے تو وہ حقیقت مردہ ہاؤ گے بلکہ ہمیشہ کی زندگی ہاؤ گے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہے :

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُعَذِّبُكُم بِالْعَذَابِ إِنَّهُم بِالْعَذَابِ

بَنَ آخِیَاتٍ ۚ وَ لَکِن لَّا تَشْعُرُونَ۔ (البقرہ - ۱۷)

”اور نہ کہو ان لوگوں کو جس سے تم کو عذاب ہے کہ وہ تم کو عذاب میں مبتلا کرنے کے لئے عذاب دیتے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور تم ان سے نہیں سمجھتے“

مسائب پر صبر کی تلقین کی جاتی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ صابرین کے لئے خدا کی طرف سے حمایت اور رحمت ہے۔ اس حقیقت کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے :

أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ

وَمِنْ خَسَفَ (البقرہ-۱۱)

”وہ لوگ اُپر ان کے حضور ہی پروردگار ان کی طرف سے

اور رحمت“

بے غوثی اور بے مادی کا جذبہ اس طرح پیدا کیا جاتا ہے کہ

قَالَ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ أَتُخَفُّونَ أَتُخَفُّونَ أَتُخَفُّونَ أَتُخَفُّونَ أَتُخَفُّونَ أَتُخَفُّونَ

وَمِنْ فَتَنَ قَوْلِيْلَهُ خَلَفَتْ وَفَتْةً كَثِيرَةً بِأَذَانِ

الْبَلْوَى (البقرہ-۲۲)

”جو لوگ کفر کرتے تھے کہ انہیں اللہ کے پاس ماضی ہوئے ہے

انہوں نے کہا کہ اللہ کے حکم سے جھوٹی حمایت ٹھری حمایت پر

قاب آجاتی ہے“

سخت سے سخت مشکلات کے مقابل میں ڈٹ ہلنے کی قوت

یہ کہہ کر پیدا کی جاتی ہے کہ

ثُمَّ جَاءَهُمْ أَشَدُّ خُفْرًا (البقرہ-۱۱)

”جہنم کی آگ دنیا کی گریبوں سے زیادہ سخت ہے“

نیک کاموں میں مل خرچ کرنے کے لئے یہ کہہ کر ابھارا جاتا

ہے کہ

وَمَا تَنْتَفِعُوا مِنْ خَيْرِ ثَمَرٍ إِلَّا تَنْتَفِعُوا مِنْهُ

لَا تَنْتَفِعُونَ (البقرہ-۲۵)

”جو کچھ خیرات تم کو ملے اس کا پھل اگر تم کو ملے گا اور

تمہارے ساتھ ظلم ہوگا“

بخل سے روکنے کے لئے فرمایا جاتا ہے کہ

وَلَا يَخْسِرُونَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ

مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَكْسِبُونَ

سَوْطُونَ مَأْتَجَلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

(آل عمران ۷۸)

”جی لوگوں کو اس نے اپنے فضل سے مالدار کیا ہے اور
پھر وہ اس میں نکل کر رہے ہیں وہی وہ ہیں جو ان کے
اجل ہے، بلکہ درحقیقت یہ ان کے حق میں ایسا ہے جس مال میں
وہ نکل کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے میں طوق بننا
کو ڈال دیا جائے گا۔“

سود خواری کے قانڈوں سے دست بردار ہونے کیلئے یہ
کہہ کر آمادہ کیا جاتا ہے کہ

وَالْعَوَا يَوْمًا كَرِهُوا حَيْثُ هَانُوا اللَّهُ۔

(البقرہ ۲۸)

”اس دن سے ٹھہر جس میں تم اس کے پاس ٹوٹے ہو“

گے۔

مشارع دنیا سے بے نیازی اور بدکاروں کی خوشامی پر رشک
حکمرانی کی تعلیم اس طرح دی جاتی ہے کہ

لَا يَخْشَى ذَلِكَ تَغْلِبُ الْيَوْمَ كَفَرُوا فِي الْبَلَاءِ
مَتَاعًا قَلِيلًا كَفَرُوا مَا وَدَّعُوا جَهَنَّمَ وَبِئْسَ
الْبِهَادُ لَكِنَّ الْيَوْمَ اتَّقُوا لِقَوْمٍ لَّهُمْ جَهَنَّمُ
تَجَرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَئِكَ
يَقْنُ عَذَابُ اللَّهِ وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ إِلَّا لِمَنْ يَرِ

(آل عمران ۸۰)

”اے نبی! دنیا کے کھوں میں خدا کے پیروں کو لوگوں کے
پہلے پھرت نہیں کہیں دھوکے میں نہ ڈال دے یہ محض چند روزہ

زندگی کا طعنہ ہے، پر سب چیزیں جانی گئے جو بدتر ہیں مگر
 قرار ہے کہ کس اس کے جو لوگ اپنے سب سے ڈرتے ہیں
 زندگی بسر کرتے ہیں، ان کے لئے ایسے بدتر ہیں جن کے بچے
 خیر سے بدتر ہیں، ان باتوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان کا طرف
 سے یہ ساری حالتیں ان کے لئے، ان کو کچھ اٹھانے کے پاس
 ہے یا نہ ہو ان کے لئے وہی سب سے بدتر ہے

اسلامی تہذیب میں ایمان کی اہمیت

ایمانیات پر مجبوری نظر

ایمان کے پانچوں شعبوں پر تفصیل کے ساتھ کلام کیا جا چکا ہے ان میں سے ہر ایک کے متعلق اسلام کا تفصیلی عقیدہ، فقہ مسیح کے لحاظ سے اس کا عقلی مرتبہ، انسانی ہیئت پر اس کے اثرات، اور تہذیب کی تاسیس و تشکیل میں اس کا حصہ آپ معلوم کر چکے ہیں۔ اب ایک مرتبہ مجبوری حیثیت سے ان سب پر نظر ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ یہ ایمانیاں بل بال کر کس قسم کی تہذیب پیدا کرتے ہیں۔

اس مضمون کے ابتدائی ابواب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلامی تہذیب کا سنگ بنیاد حیات دنیا کا یہ تصور ہے کہ انسان کی حیثیت اس کائنات میں عام موجودات کی سی نہیں ہے، بلکہ وہ خداوند عالم کی طرف سے یہاں خلیفہ بنا کر آگیا گیا ہے۔ اس تصور سے بطور ایک عقلی نتیجہ کے انسان کی زندگی کا یہ نصب العین قرار پایا کہ وہ اپنے خالق اور اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرے، اور اس نصب العین کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہو گیا کہ۔

اولاً، وہ خدا کی صحیح معرفت حاصل کرے،

ثانیاً، وہ جبروت خدا کو انحر اور نائی، حاکم اور مطلق سمجھے اور

اپنے اقتدار کو احکام خداوندی کے تابع کرے،

ثالثاً، وہ ان طریقوں کو معلوم کرے جن سے خدا کی خوشنودی

حاصل ہو سکتی ہے، اور جب وہ طریقے معلوم ہو جائیں تو انہی کے مطابق زندگی بسر کرے،

راجا، وہ خدا کی خوشنودی کے ثمرات اور اس کی ناخوشی کے نتائج سے واقف ہو، تاکہ حیاتِ دنیا کے مشکل نتائج سے دھوکہ نہ کھائے۔

وہ پانچ حقیقے جن کی تفصیل آپ کو اوپر معلوم ہو چکی ہے، اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔

خدا کی ذات و صفات کے متعلق جو کچھ قرآن میں بیان کیا گیا ہے وہ سب اس لیے ہے کہ انسان کو اس حقیقت کی صحیح معرفت حاصل ہو جس کی طرف سے وہ غلط فہمیوں میں مبتلا ہے اور جس کی خوشنودی حاصل کرنا اس کی زندگی کا نصب العین ہے۔ تاکہ کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس لیے ہے کہ انسان، کائنات کی کارکن طاقتوں میں سے کسی کو کار فرما نہ سمجھ بیٹھے، اور کار فرماؤں میں خدا کے سوا کسی کو شریک نہ قرار دے۔ اس علم صحیح کے بعد خدا پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح تمام کائنات پر، اور خود انسان کی زندگی کے غیر اختیاری شعبے پر خدا کی حکومت ہے، اسی طرح انسان اپنی زندگی کے اختیاری شعبے میں بھی خدا کی حکومت تسلیم کرے، ہر معاملہ میں خدا کو واضح قانون اور اپنے آپ کو صرف متبع قانون کہے، اور اپنے اختیارات کو ان حدود کے اندر محدود کر دے جو خدا نے مقرر کیے ہیں۔ یہی ایمان اپنے اندر وہ قوت رکھتا ہے جو انسان کو خدا کی فرمائشوں کے آگے بطورِ درجست تسلیمِ غم کر دینے کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ اس سے مردِ مومن کے اندر ایک خاص نوعیت کا خمیر پیدا ہوتا ہے اور ایک خاص قسم کی سیرت بنتی ہے جو قانون اور حدود کا

مجبوراً نہیں بلکہ رضا کارانہ اتباع کرنے کے لئے ضروری ہے۔

رسالت اور کتاب کا عقیدہ تیسری ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

انہی دونوں کے ذریعہ سے انسان کو ان قوانین اور ان طریقوں کا تفصیلی علم ہوتا ہے جن کو خدا نے انسان کے لئے مقرر کیا ہے۔ اور ان حدود کی شناخت میسر ہوتی ہے جن سے خدا نے انسان کے اختیار کو محدود فرمایا ہے۔ رسول کی تعلیم کو خدا کی تعلیم، اور اس کی ہدایت کی ہوتی کتاب کو خدا کی کتاب سمجھنا ہی ایمان بالرسالت اور ایمان بالکتاب ہے، اور اس ایمان ہی سے انسان میں یہ قابلیت پیدا ہوتی ہے کہ یقین و اذعان کے ساتھ ان قوانین اور طریقوں اور حدود کی پابندی کرے جو خدا نے اپنے رسول اور اپنی کتاب کے واسطے سے اس کو بتائے ہیں۔

آخری ضرورت کو پورا کرنے کے لئے معاد کا علم ہے۔ اس سے انسان کی نظر اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ وہ ظاہر حیات دنیا کے بچے ایک دوسرے عالم کو دیکھنے لگتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کی خوش حالی و بد حالی، اور محنت و مسرت، خدا کی خوشنودی و ناخوشی کا معیار نہیں ہے، اور خدا کی جانب سے اعمال کی جزا و سزا اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ آخری فیصلہ ایک دوسرے عالم میں ہونے والا ہے۔ وہی فیصلہ معجز ہے اور اس فیصلے میں کامرانی کا واحد ذریعہ ہے کہ اس دنیا میں خدا کے قانون کی رگ پروری اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پوری پابندی کی جائے۔ اسی عقیدے پر حرم و یقین کا نام ایمان بالیوم الآخر ہے اور ایمان بالشد کے بعد یہ دوسری زبردست قوت ہے جو انسان کو قوانین اسلامی کے اتباع پر ابھارتی ہے۔ تہذیب اسلامی کے لئے انسان

کو ذہنی اعتبار سے مستعد کرنے میں اس اختلاف کا بڑا حصہ ہے۔
 اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ اساسی اختلافات انھیں
 خطوط پر تہذیب کی تاسیس و تشکیل کہتے ہیں جو حیات دُنیا کے
 اس مخصوص تصور اور خاص نصب العین نے کھینچ دیئے تھے۔ اسی
 تہذیب کے لئے عقلاً جس اساسی عقیدہ کی ضرورت ہے وہ انہی پانچ
 امور پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ ان کے سوا کسی دوسرے اعتقاد میں یہ
 صلاحیت نہیں کہ وہ اس مخصوص طرز کی تہذیب کے لئے اساسی
 کے کوئی دوسرا عقیدہ اس خاص تصور حیات اور نصب العین کیساتھ
 مناسبت نہیں رکھتا۔

تہذیب اسلامی کا خاکہ

ایمانیات کی جو تفصیلات اوپر بیان ہوئی ہیں ان پر نظر ڈالنے
 سے اس تہذیب کا پتہ ناخاکہ ہمارے سامنے آتا ہے جسکی تاسیس
 ان کے ذریعے کی گئی ہے۔ اس خاکہ کی نمایاں خصوصیات یہ
 ہیں۔

۱۔ اس تہذیب کا نظام ایک سلطنت کا سا نظام ہے۔ اس میں
 خدا کی حیثیت عام مذہبی تصور کے لحاظ سے محض ایک "معبود" کی
 سی نہیں ہے، بلکہ دُنوی تصور کے لحاظ سے وہی عالم مطلق بھی
 ہے۔ وہ دراصل اس سلطنت کا شہنشاہ ہے، رسول اس کا نمائندہ
 ہے، قرآن اس کی کتاب آئین ہے، اور ہر وہ شخص جو اسکی شہنشاہی
 کو تسلیم کرے اس کے نمائندے کی اطاعت اور اس کی کتاب
 آئین کا اہتمام کرنا قبول کرے، اس سلطنت کی رعیت ہے۔ مسلمان
 ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس شہنشاہ نے اپنے نمائندے اور اپنی
 کتاب آئین کے ذریعے جو قوانین مقرر کر دیئے ہیں انکو بے چون و

پراسلیم کیا جائے خواہ اُن کی طلب و مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے جو شخص خدا کا یہ اختیار مطلق اور اس کے قانون کا شخصی و اجتماعی گمراہ سے بالاتر ہونا تسلیم نہیں کرتا، اور اس کے فرمان کو ماننے یا نہ ماننے کا حق اپنے لئے محفوظ رکھتا ہے، اس کے لئے اس سلطنت میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۴۔ بچوں کو اس تہذیب کا اصل مقصد انسان کو آخری کامیابی (یعنی آخرت کے فیصلہ میں خداوند عالم کی خوشنودی سے سرفراز ہونے) کے لئے تیار کرنا ہے، اور اس کامیابی کا حصول اس کے نزدیک موجودہ زندگی میں انسان کے صحیح عمل پر موقوف ہے، اور یہ جاننا کہ آخری تجربے کے اعتبار سے کون سا عمل مفید ہے اور کون سا مضر انسان کے بس کا کام نہیں ہے، بلکہ وہی خدا اس کو ہر زمانہ ہے جو آخرت میں فیصلہ کرنے والا ہے، اس لئے یہ تہذیب انسان سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی زندگی کے تمام معاملات میں خدا کے بتائے ہوئے طریقوں کی پیروی کرے اور اپنی آکاؤں اور عمل کو شریعتِ الہی کی قیود سے متحرک نہ کرے۔ اس طرح یہ تہذیب دین اور دنیا دونوں کی جامع ہے۔ اس کو عام محدود معنوں میں ”مذہب“ کے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک ایسا وسیع نظام ہے جو انسان کے اخلاق و خیالات، اس کے شخصی کردار و اخلاق، اس کے انفرادی عمل، اس کے خانگی معاملات، اس کی معاشرت، اس کے تمدن، اس کی سیاست، سب پر حاوی ہے، اور ان تمام معاملات میں جو طریقے اور قوانین خدا نے مقرر کیے ہیں ان کے مجروح ہونے کا نام ”دین اسلام“ یا ”تہذیب اسلامی“ ہے۔

۵۔ یہ تہذیب کوئی قوی یا ننگی یا نسلی تہذیب نہیں ہے، بلکہ صحیح

سمنوں میں انسانی تہذیب ہے۔ یہ انسان کو بحیثیت انسان کے غلط کرتی ہے، اور اس شخص کو اپنے دائرے میں لیتی ہے جو توحید، رسالت، کتاب، اور یوم آخر پر ایمان لائے۔ اس طرح اس تہذیب نے ایک ایسی قومیت بنائی ہے جس میں بڑا امتیاز رنگ و نسل و زبان ہر انسان داخل ہو سکتا ہے، جس کے اندر تمام نونے زمین پر پھیل جانے کی استعداد موجود ہے، اور جو تمام نئی کلام کو ایک نظم و نیت میں پیوستہ کر دینے، اور ان سب کو ایک تہذیب کا جتن بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن یہ عالمگیر انسانی برادری قائم کرنے سے اس کا اصل مقصد اپنے متبعین کی مردم شماری بڑھانا نہیں ہے، بلکہ تمام انسانوں کو اس علم صحیح اور عمل صحیح کے فیض میں شریک کرنا ہے جو ان سب کے خدا نے ان سب کی بھلائی کے لئے عطا فرمایا ہے اس لئے وہ اس برادری میں شامل ہونے کے لئے ایمان کی قید لگا کر صرف ان لوگوں کی حق لینا چاہتی ہے جو خدا کی حکومت مطلقہ کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے لئے آمادہ ہوں، اور ان حدود اور قوانین کی پابندی قبول کریں جو خدا نے اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعے سے مقرر کیے ہیں۔ کیونکہ صرف ایسے ہی لوگ (خواہ وہ کتنے ہی کم ہوں) اس تہذیب کے نظام میں کھپ سکتے ہیں اور انہی سے ایک صحیح اور مضبوط نظام قائم ہو سکتا ہے۔ منکرین یا کفار حقین یا ضعیف الایمان لوگوں کا گھس آنا اس نظام کے لئے سبب قوت نہیں بلکہ موجب ضعف ہے۔

۲۔ ہمہ گیری اور اقامت کے ساتھ اس تہذیب کی نمایاں خصوصیت اس کا زبردست ڈھیلن اور اس کی ماقہہ گرفت ہے جس سے وہ اپنے متبعین کو شخصی و اجتماعی حیثیت سے اپنے آئین کا پابند بناتی ہے

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قوانین بنانے اور محدود مقرر کرنے سے پہلے قوانین کا اجماع اور محدود کی پابندی کرانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ حکم دینے سے پہلے وہ اس کا انتظام کرتے ہیں کہ اس کا حکم نافذ ہو۔ سب سے پہلے وہ انسان سے خدا کی فرماں روائی تسلیم کراتے ہیں۔ پھر اس کو یقین دلاتے ہیں کہ رسول اور کتاب کے ذریعہ سے جو احکام دینے گئے ہیں وہ خدا کے احکام ہیں، اور ان کو اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے۔ پھر وہ اس کے نفس میں ایک ایسی پولیس مقرر کرتے ہیں جو ہر وقت اور ہر حال میں اس کو احکام کی اطاعت پر ابھارتی ہے، خلاف و ہذا پر سرزنش کرتی ہے، اور عذابِ یومِ ظہیم کا خوف دلاتی رہتی ہے۔ اس طرح جب وہ اس قوتِ نافذہ کو ہر شخص کے نفس و ضمیر میں منظم کرنے کے اپنے بیوقوفان میں یہ صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ خود اپنی دلی رغبت سے قوانین کے اجماع اور محدود کی پابندی اور اخلاقِ حسنہ سے متعلق ہونے کے لئے آمادہ ہوں، تب وہ ان کے سامنے اپنے قوانین پیش کرتے ہیں، ان کو احکام دیتی ہیں، ان کے لئے محدود مقرر کرتے ہیں، ان کے لئے زندگی بسر کرنے کے طریقے وضع کرتے ہیں، اور اپنے مصالح کے لئے ان سے سخت سے سخت قربانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ ایسا طریقہ ہے جس سے زیادہ یکمانہ طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس طریقہ سے اسلامی تہذیب کو جو زبردست نفوذ و اثر حاصل ہوا ہے وہ کسی دوسری تہذیب کو نصیب نہیں ہوا۔

۵۔ دنیوی نقطہ نظر سے یہ تہذیب ایک صحیح اجتماعی نظام قائم کرنا اور ایک صالح اور پاکیزہ سوسائٹی وجود لانا چاہتی ہے۔ مگر

ایسی سوسائٹی کا وجود میں آنا ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس کے افراد اخلاقی فاضلہ و صفاتِ حسنہ سے محنت نہ ہوں۔ اس غرض کے لئے ضروری ہے کہ افراد کے نفوس کا تزکیہ کیا جائے تاکہ وہ رذی اور منتشر افکار کی آماجگاہ نہ رہیں۔ صحیح اور پاکیزہ ذہنیت ان کے اندر راسخ کی جائے تاکہ ان میں ایک ایسی مضبوط سیرت پیدا ہو سکے جس سے اعمالِ صالحہ کا صدور بالطبع ہونے لگے اسلام نے اپنی تہذیب میں اس قاعدہ کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ افراد کی تربیت کے لئے وہ سب سے پہلے ان میں ایمان کو راسخ کرتا ہے جو ایک اعلیٰ درجے کی مضبوط سیرت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ یہی ایمان ہے جس کے ذریعے وہ افراد میں صداقت، امانت، نیک نفسی، احتساب، حق پسندی، ضبط نفس، تنظیم، فیاضی، وسعت نظر، خود داری، انکسار و فروتنی، فراخ حوصلگی، بلند ہمتی، انکار و قربانی، فرض شناسی، صبر و استقامت، شجاعت و بہادری، قناعت و استغناء، اطاعتِ امر اور اتباعِ قانون کے عمدہ اوصاف پیدا کرتا ہے، اور ان کو اسے قابل بناتا ہے کہ ان کے اجتماع سے ایک بہترین سوسائٹی وجود میں آئے۔

۴۔ اس تہذیب کے ایمانیات میں ایک طرف وہ تمام قوتیں موجود ہیں جو انسان کے اندر اخلاقی حسنہ و ملکاتِ فاضلہ پیدا کرنے والی اور ان کی پرورش اور حفاظت کرنے والی ہیں۔ دوسری طرف انہی ایمانیات میں یہ قوت بھی ہے کہ وہ انسان کو دنیوی ترقی کے لئے آمادہ کرتے ہیں اور اس کو اس قابل بناتے ہیں کہ دنیا کے اسباب و وسائل کو بہترین طریقہ پر بندھے اور ان تمام قوتوں کو اقتدار کے ساتھ استعمال کرے جو خدا نے اسے عطا کی ہیں۔ یہی ایمانیات

اس میں وہ تمام عمدہ اوصاف بھی پیدا کرتے ہیں جو دنیا میں حقیقی ترقی کے لئے ضروری ہیں۔ ان میں انسان کی عملی قوتوں کو منظم کرنے اور تعلیم کے ساتھ حرکت دینے کی زبردست طاقت موجود ہے، اور اس کے ساتھ ان میں یہ طاقت بھی ہے کہ اس حرکت کو حد سے تجاوز نہ کرنے دیں، اور ان راستوں سے غفلت نہ ہونے دیں جن سے ہٹ جانا تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ایمانیات اپنے اندر وہ تمام خوبیاں مع شیءِ عالم رکھتے ہیں جو دوسرے مذہبی اور دنیوی ایمانیات میں نہ پایا جاتی ہیں، اور ان تمام خرابیوں سے پاک ہیں جو مختلف مذہبی اور دنیوی ایمانیات میں موجود ہیں۔

تہذیبِ اسلامی میں ایمان کی اہمیت

یہ اس تہذیب کا ایک نخلِ خلد ہے جس کو اسلام نے قائم کیا ہے۔ اگر ہم قبیل کے پیرایہ میں اس کو ایک عمارت فرض کر لیں، تو یہ ایک ایسی عمارت ہے جس کو مستحکم کرنے کے لئے نہایت گہری بنیاد رکھنی ہوگی، پھر چھانٹ چھانٹ کر پتھر اٹھائیں مہیا کی گئیں اور ان کو بہترین چھونے سے پوستہ کر دیا گیا، پھر عمارت اس شان کے ساتھ بنائی جائے کہ بلندی میں آسمان تک اٹھتی چلی جائے اور وسعت میں آفاق پر پھیلتی جائے، مگر اس وسعت و رفعت کے باوجود اسکے انکان میں خفا و تواضع واقع نہ رہے اور اس کی دیواریں اور اس کے ستون چٹان کی سی مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں۔ اس عمارت کے دروازے اور روشن دان اس طرز پر بنائے گئے ہیں کہ باہر کی روشنی اور صاف ہوا کو بخوبی داخل ہونے دیتے ہیں، مگر گھوٹا اور خس و خاشاک اور بارش کو داخل ہونے سے روک دیتے ہیں۔ یہ تمام خوبیاں جو اس عمارت میں پیدا ہوئی ہیں ایک ہی چیز

بدولت ہیں، اور وہ ایمان ہے۔ وہی اس کی بنیادی استوار کتاب ہے۔ وہی رزقی اور ناکارہ مواد کو پچانٹ کر عمدہ مواد اخذ کرتا ہے۔ وہی مواد خام کو پکا کر پختہ دہشتیں تیار کرتا ہے۔ وہی ان لاشوں کو پوسہ کر کے ایک بنیاد مرموص بناتا ہے۔ اسی پر عمارت کی وسعت و رفعت اور استحکام کا انحصار ہے۔ وہی اس کو پھیلاتا بھی ہے، بلند بھی کرتا ہے، مضبوط بھی کرتا ہے، بیرونی مقصدات سے اس کی حفاظت بھی کرتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو اس میں داخل ہونے کا موقع بھی دیتا ہے۔ پس ایمان اس عمارت کی بنیاد ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس کا قائم رہنا کیسا، وجود میں آنا ہی محال ہے۔ اور اگر یہ ضعیف ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عمارت کی بنیادیں کمزور، اس کی اہلیں بھڑی، اس کا چونا خراب، اس کے ارکان متزلزل ہیں، اس کے اجزاء میں بیروہنگی نہیں، اس میں پھیلنے اور بلند ہونے کی صلاحیت نہیں، اس میں بیرونی مقصدات کو روکنے اور اپنی پاکیزگی و حفاظت کو محفوظ رکھنے کی قوت نہیں۔

غرض ایمان کا عدم اسلام کا عدم ہے، ایمان کا ضعف اس کا ضعف ہے، اور ایمان کی قوت اس کی قوت۔ پھر چونکہ اسلام معنی ایک مذہب ہی نہیں بلکہ اخلاق، تہذیب، معاشرت، تمدن سیاست سب یکجہ ہے، اس لیے ایمان کی حیثیت اس نظام میں صرف مذہبی عقیدہ ہی کی نہیں ہے، بلکہ اسی پر افراد کے اخلاق اور ان کی سیرت کا بھی انحصار ہے۔ وہی ان کے معاشرت کی حد تک کا بھی فائدہ دار ہے۔ وہی ان کو جوڑ کر ایک قوم بھی بناتا ہے۔ وہی ان کی قومیت اور ان کی تہذیب کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ وہی ان کے تمدن ان کی معاشرت، اور ان کی سیاست کا مائے خمیر بھی ہے۔ اس کے بغیر

اسلام دجہوت ایک "مذہب" کی حیثیت سے قائم نہیں ہو سکتا بلکہ بحیثیت ایک تہذیب و تمدن اور نظام سیاسی کے ہی قائم نہیں ہو سکتا۔ ایمان ضیعت ہو تو یہ نفس مذہبی عقیدہ کا ضعف نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے اخلاق خراب ہو جائیں، ان کی سیرتیں کمزور ہو جائیں، ان کے معاملات بگڑ جائیں، ان کے معاشرت اور ان کے تمدن کا نظام درہم برہم ہو جائے، ان کے درمیان قومیت کا رشتہ ٹوٹ جائے، اور وہ ایک آزاد اور نا عزت اور طاقتور قوم کی حیثیت سے زندہ نہ رہ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ایمان ہی پر اسلام و کفر کا مدار رکھا گیا ہے اور ہی نظام اسلامی میں داخل ہونے کی شرط اتو لین ہے۔ سب سے پہلے انسان کے سامنے ایمان ہی پیش کیا جاتا ہے اگر اس نے ایمان کو قبول کر لیا تو اُسے مسلمہ میں داخل ہو گیا، مسلمانوں کی معاشرت، تسبیح، سیاست، سب میں برابر کا شریک ہو گیا اور تمام احکام، حدود اور قوانین اس سے متعلق ہو گئے، لیکن اگر اس نے ایمان کو قبول نہیں کیا تو وہ دائرۃ اسلامی میں کسی حیثیت سے داخل نہیں ہو سکتا، اسلام کا کوئی حکم اور کوئی قانون اس پر نافذ نہ ہوگا، اور مسلمانوں کی جماعت میں وہ کسی طرح شریک نہ ہو سکے گا، کیونکہ اس نظام میں اس کی کسبت قطعاً محال ہے، اور اس کے قوانین و حدود کو کبھی پابندی وہ کبھی نہیں سکتا۔

تفاق کا خطرہ

جو لوگ دجہوت ایمان کو خارجہ مذکر دیں ان کا معاملہ تو صاف ہے ان کے اور مسلمانوں کے درمیان کفر و ایمان کی سرحد اتنی واضح اور نمایاں ہے کہ وہ دائرۃ اسلامی میں داخل ہو کر کوئی خلل برپا نہیں کر

کر سکتے مگر وہ لوگ جو مومن نہیں، اور ایمان کا اظہار کر کے مسلمانوں کی جماعت میں گھس جاتے ہیں، اور وہ جن کے دلوں میں شک کی بیماری ہے اور وہ جو ضعیف الایمان ہیں، ان کا وجود نظام اسلامی کے لئے نہایت خطرناک ہے۔ کیونکہ وہ اسلام کے دائرے میں تو داخل ہو جاتے ہیں، مگر اسلامی اخلاق اور اسلامی سیرت اختیار نہیں کرتے، اسلامی قوانین کا امتثال اور حدودِ الہی کی پابندی نہیں کرتے، اپنے خراب اخلاق و اعمال سے مسلمانوں کے تقدس و تہذیب کو خراب کر دیتے ہیں، اپنے دلوں کے کھوٹ سے مسلمانوں کی قومیت اور سیاسی حرمت کی چیزیں کھوکھلی کر دیتے ہیں، اور ہر اس قسم کے اٹھانے اور بھڑکانے میں حصہ لیتے ہیں جو اسلام کے خلاف اندر یا باہر سے برپا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ایسے لوگوں کو منافق کہا گیا ہے، اور وہ تمام خطرات ایک ایک کر کے بیان کیئے گئے ہیں جو اسلامی جماعت میں ان کے داخل ہو جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔

ان کی صفت یہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر حقیقت میں مومن نہیں ہوتے۔

مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَهِيَ الْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا
هُمْ بِمُؤْمِنِينَ۔ (البقرہ۔ ۲)

جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور یومِ آخر پر ایمان لائے ہیں مگر
وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

وہ مسلمانوں سے مسلمانوں کی سی باتیں کرتے ہیں اور کافروں
سے کفار کی سی۔

وَإِذَا النُّوَّالِذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا

خَلُّوْا اِلٰی شَيْطٰنِيْهِمْ قَالُوْٓا اِذَا مَعَكُمْ

(البقرہ۔ ۲)

”جب وہ ایمان لائے والوں سے ملے تو کہا کہ ہم ایمان

لے آئے، اور جب اپنے شیاطین کے پاس گئے تو کہے
کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں“

وہ آیات الہی کا مذاق اڑاتے اور ان میں شکوک کا اظہار
کرتے ہیں۔

اِذَا مَعَكُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ يَكْفُرُ بِنٰهَا وَيَسْتَهْزِءُ
بِنٰهَا لَمَّا تَقَعَتْ وَاَمَعَكُمْ

(النساء۔ ۲)

”جب تم ملو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان

کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو ان کے ساتھ نہ بیٹھو“

وہ مذاہبی فرائض سے جی پڑاتے ہیں، اور اگر ادا کرتے بھی

ہیں تو مجبوراً محض مسلمانوں کو دکھانے کے لیے، ورنہ حقیقتاً ان
کے دل احکام الہی کی اطاعت سے منحرف ہوتے ہیں۔

وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُفٰلًا
یُّرَآوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا
مُّذَبِّدًا بَیْنَ یَیْنٍ ذٰلِكَ اِلَآ اِلٰی هٰؤُلَآءِ وَلَا اِلَآ
هٰؤُلَآءِ۔ (النساء۔ ۳)

”اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو باہل

نواستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ محض لوگوں کو دکھاتے ہیں۔ خدا

کو یاد نہیں کرتے، اور اگر کرتے بھی ہیں تو کم۔ وہ بے رحم

مذہب ہیں، نہ ٹھہرے اور نہ ہی نہ ٹھہرے اور نہ

وَلَا یَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهْمًا كُفٰلًا وَلَا

يَتَوَقَّعُونَ إِلَّا وَهْوَ كَمَا يَهُتُونَ۔ (التوبہ۔ ۷)

”وہ نواز کے لئے نہیں آتے مگر بدل کی خواہش اور داناؤ تھا
میں طرح نہیں کرتے مگر کراہت کے ساتھ“

وَمِنَ الْأَعْدَابِ مَنْ يَشْجِدُ مَا يُغْفِقُ غَفْرًا مَلًا
(التوبہ۔ ۱۲)

”اور بدعنوانوں میں سے بعض ایسے ہیں جو کچھ مانگو خدا میں

طرح کرتے ہیں اس کو زبردستی کا بُرا مانہ کہتے ہیں۔
وہ اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اسلامی قوانین کا اتباع نہیں
کرتے بلکہ اپنے معاملات میں کھد کے قوانین کی پیروی کرتے
ہیں۔“

الْمُتَكِبِّرِينَ الَّذِينَ يَنْزِعُونَ عَنْهُمَا مَنَافِعَ
أَنْفُسِهِمْ وَمَا أَنْفُسُهُمْ مِنْ ثَمَرٍ إِلَّا
أَنْ يَنْتَحُوا إِلَيْهَا فَبِئْسَ الْفِرْقَانِ
يَكْفُرُوا بِهِمَا۔ (النساء۔ ۹)

”کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ
وہ ایمان لائے اس کتاب پر جو تیرے اوپر اتاری گئی ہے اور ان
پر جو تجھ سے پہلے اتاری گئی تھی مگر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات
شیطانِ مالم کے پاس لے جائیں۔ حالانکہ ان کو حکم دیا جا چکا ہے
کہ اس حکم نہ مانیں۔“

ان کے اعمال خود خراب ہوتے ہیں اور وہ مسلمانوں کے
عقائد اور اعمال بھی خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

يَا مَرْوُونَ يَا مُنْكَرُ وَيَا نُفُوسَ الْعَالَمِينَ
وَيَا حَسْرَتُونَ أَلَمْ تَكُنْ لَكُمْ تَسْوَاةً فَلْتَذِيقُوا تَذَاتُ۔ (التوبہ۔ ۹)

”وہ بُرائی کا حکم دیتے اور بھلائی سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھ نیک کاموں سے کھینچے رہتے ہیں۔ وہ خدا کو بھول گئے اس لیے خدا نے بھی ان کو بھلا دیا“

وَقَدْ ذَاكَ لَوْ تَذَكَّرُونَ كَمَا أَكْفَرْتُمَا فَتُكْفَرُونَ
سُورَةُ (النمل - ۱۲)

”وہ چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی کفر کرو جیسا انہوں نے کفر کیا مگر تم اور وہ برابر ہو جائیں“

وہ مسلمانوں کے ساتھ اسی وقت تک ہیں جب تک ان کا فائدہ ہے۔ جہاں فائدہ کم ہوا اور انہوں نے قوم کا ساتھ چھوڑا۔

وَمَثَلُ قَوْمٍ يَمْلِكُ فِي الْقِدَاطِ فَيَمْنُ
أَعْطُوا مِنْهَا مَاشُوا وَإِنْ لَمْ يَعْطُوا مِنْهَا إِذَا
هُمْ يَسْخَطُونَ۔ (التوبہ - ۷)

”ان میں سے بعض صدقات کی تقسیم میں لالچ پر طعن کر دیتے ہیں۔ مگر ان کو صدقات میں سے دیا گیا تو خوش ہو گئے اور نہ دیا گیا تو برا ہو گئے“

جب اسلام اور مسلمانوں پر مصیبت کا وقت آتا ہے۔ تو وہ جنگ سے انکار کر دیتے ہیں، کیونکہ حقیقت میں نہ تو ان کو اسلام کے جہت ہوئی ہے کہ اس کے لئے کوئی قربانی کریں، نہ وہ اس قربانی پر کسی اجر کے قائل ہوتے ہیں، نہ ان کو اسلام کی حقانیت کا یقین ہوتا ہے کہ اس کی تائید میں جانیں لڑانے پر آمادہ ہوں۔ وہ طرز طرز سے اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اگر جنگ میں شریک بھی ہوتے ہیں تو بادلِ تجھ سے رہ کر ان کی شرکتِ مسلمانوں کے لئے قوت کے بھانے ضعف کا سبب بن جاتی ہے۔ ان کی

اس کیفیت کو سورۃ آل عمران (دکوح ۱۲-۱۷) سورۃ نساء (دکوح ۱۱-۱۷) سورۃ توبہ (دکوح ۷-۱۲) اور سورۃ احزاب (دکوح ۲) میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

ابھی کہے سب سے زیادہ خطرناک صفت یہ ہے کہ جب مسلمانوں پر مصیبت آتی ہے تو کفار سے مل جاتے ہیں۔ ان کو شریک پہنچاتے ہیں، ان سے مدد بھی کرتے ہیں، مسلمانوں کی شخصیت پر غرضی ہوتے ہیں، اپنی قوم سے غداری کر کے کفار سے احوال و مذاہب حاصل کرتے ہیں، ہر فرقہ جو اسلام کے خلاف اٹھتا ہے اس میں سب سے آگے بڑھ کر مصیبت دیتے ہیں، اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ ڈالنے کے لئے سازشیں کرتے رہتے ہیں ان صفات کو بھی آل عمران، نساء، توبہ، احزاب، اور منافقوں میں مفصلاً بیان کیا گیا ہے۔

اس سے اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نظام اسلامی کے قیام و بقا و استحکام کے لئے صحیح اور خالص ایمان ناگزیر ہے ایمان کی کمزوری اس نظام کو جڑ سے لے کر آخری شاخ تک کھوکھلا کر دیتی ہے اور اس کے خطرناک اثرات سے اخلاق، معاشرت، تمدن، تہذیب، سیاست کوئی چیز نہیں بچ سکتی۔

زندگی بعد موت

موت کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے یا نہیں ؟ اور ہے تو کیسی ہے ؟ یہ سوال حقیقت میں ہمارے علم کی رسائی سے دور ہے کہ ہمارے پاس وہ آنکھیں نہیں، جن سے ہم موت کی سرحد کے اس پار بھاٹک کر دیکھ سکیں، کہ وہاں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ ہمارے پاس وہ کان نہیں، جن سے ہم ادھر کی کوئی آواز سن سکیں۔ ہم کوئی ایسا اگر بھی نہیں رکھتے، جس کے ذریعے سے تحقیق کے ساتھ معلوم کیا جاسکے کہ ادھر کھڑے کیا کھڑے نہیں ہے۔ لہذا جہاں تک سائنس کا تعلق ہے، یہ سوال اس کے دائرے سے قطعی خارج ہے۔ جو شخص سائنس کا نام لے کر کہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے وہ بالکل ایک غیر سائنٹیفک بات کہتا ہے۔ سائنس کی حدود نہ تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ کوئی زندگی ہے اور نہ یہ کہ کوئی زندگی نہیں ہے۔ جب تک ہم کوئی یقینی طریقہ علم نہیں پاس، کم از کم اس وقت تک تو صحیح سائنٹیفک رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم زندگی کے بعد موت کا نہ انکار کریں نہ اقرار۔

مگر کیا حتمی زندگی میں ہم اس سائنٹیفک رویے کو نبھا سکتے ہیں ؟ شاید نہیں، بلکہ یقیناً نہیں۔ عقل حیثیت سے تو یہ ممکن ہے کہ جب ایک چیز کو جاننے کے خواجے ہمارے پاس نہ ہوں، تو اس کے متعلق ہم نفی، اور اثبات دونوں سے پرہیز کریں، لیکن جب اسی چیز کا تعلق ہماری حتمی زندگی سے ہو، تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ

نہیں رہتا کرنا تو انکار پر اپنا طرز عمل قائم کریں، یا اقرار پر۔ مثلاً ایک شخص سے جس سے آپ واقف نہیں ہیں، اگر اس کے ساتھ آپ کا کوئی معاملہ درپیش نہ ہو، تو آپ کے لئے یہ ممکن ہے کہ اس کے ایماندار ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کوئی حکم نہ لگائیں، لیکن جب آپ کو اس سے معاملہ کرنا ہو، تو آپ مجبور ہیں کہ یا تو اسے ایماندار سمجھ کر معاملہ کریں، یا بے ایمان سمجھ کر۔ اپنے ذہن میں آپ ضرور یہ خیال کر سکتے ہیں کہ جب تک اس کا ایماندار ہونا یا نہ ہونا ثابت نہ ہو جائے، اس وقت تک ہم شک کے ساتھ معاملہ کریں گے، مگر اس کی ایمانداری کو مشکوک سمجھتے ہوئے، جو معاملہ آپ کریں گے، حلفاً اس کی صحت ہی تو ہوگی جو اس کی ایمانداری کا انکار کرنے کی صحت میں ہو سکتی تھی۔ لہذا فی الواقع انکار اور اقرار کے درمیان شک کی حالت صرف ذہن ہی میں ہو سکتی ہے۔ عمل دوتے کسی شک پر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے تو اقرار یا انکار بہر حال پگری ہے۔

یہ بات تھوڑے ہی غور و فکر سے آپ کی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ زندگی بعد موت کا سوال محض ایک فلسفیانہ سوال نہیں ہے، بلکہ ہماری عملی زندگی سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔ واسطی ہماری اخلاقی رویے کا سارا انحصار ہی اس سوال پر ہے۔ اگر میرا یہ خیال ہو کہ زندگی جو کچھ ہے میں بھی دُنیوی زندگی ہے، اور اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے، تو میرا اخلاق دوتے ایک طرح کا ہوگا۔ اگر میں یہ خیال رکھتا ہوں کہ اس کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے جس میں مجھے اپنی موجودہ زندگی کا حساب دینا ہوگا، اور وہاں میرا اچھا یا بُرا انجام میرے یہاں کے اعمال پر منحصر ہوگا، تو یقیناً میرا

اخلاق طرز عمل بالکل ایک دوسری ہی طرح کا ہوگا۔ اس کی مثال یوں
 سمجھئے، جیسے ایک شخص یہ سمجھتے ہوئے سفر کر رہا ہے کہ اُسے بس
 یہاں سے کراچی تک جانا ہے، اور کراچی پہنچ کر نہ صرف یہ کہ اس کا
 سفر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا، بلکہ وہ وہاں پولیس اور عدالت
 اور ہر اُس طاقت کی دسترس سے باہر ہوگا، جو اس سے کسی قسم کی
 باز پرس کر سکتی ہو۔ برعکس اس کے ایک دوسرا شخص یہ سمجھتا ہے کہ
 یہاں سے کراچی تک تو اس کے سفر کی صرف ایک ہی منزل ہے۔
 اس کے بعد اُسے سمند پار ایک ایسے ملک میں جانا ہوگا، جہاں کا
 بادشاہ وہی ہے جو پاکستان کا بادشاہ ہے، اور اس بادشاہ کے دفتر
 میں میرے اس پٹوے کارنامے کا غنیہ ریکارڈ محفوظ ہے جو میں نے
 پاکستان میں انجام دیا ہے، اور وہاں میرے ریکارڈ کو ہارچ کر فیصلہ
 کیا جائے گا کہ میں اپنے کام کے لحاظ سے کہیں حبس کا مستحق ہوں۔
 آپ آسمانی اعزازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں شخصوں کا طرز عمل کس
 قدر ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ پہلا شخص یہاں سے کراچی تک
 کے سفر کی تیاری کرے گا، اور دوسرے کی تیاری بعد کی طویل منزلوں
 کے لئے بھی ہوگی۔ پہلا شخص یہ سمجھے گا کہ قلع یا نقصان جو کچھ بھی
 ہے کراچی پہنچنے تک ہے، اُس کے کچھ نہیں، اور دوسرا یہ خیال کرے
 گا کہ اصل قلع و نقصان سفر کے پہلے مرحلے میں نہیں ہے، بلکہ آخری
 مرحلے میں ہے۔ پہلا شخص اپنے احوال کے صرف انہی نتائج پر نظر
 رکھے گا جو کراچی تک کے سفر میں نکل سکتے ہیں۔ لیکن دوسرے شخص
 کی نگاہ ان نتائج پر ہوگی، جو سمند پار دوسرے ملک میں پہنچ کر
 نکلیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں شخصوں کے طرز عمل کا یہ فرق براۓ
 راست نتیجہ ہے ان کی اس رائے کا جو وہ اپنے سفر کی نوعیت کے

منطق رکھتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہماری اخلاقی زندگی میں بھی وہ عقیدہ فیصلہ کن اثر رکھتا ہے جو ہم زندگی بعد موت کے بارے میں رکھتے ہیں۔ عمل کے میدان میں جو قدم بھی ہم اٹھائیں گے، اسکی سمت کا تعین اس بات پر منحصر ہوگا کہ آیا ہم اسی زندگی کو پہلی اور آخری زندگی سمجھ کر کام کر رہے ہیں، یا کسی بعد کی زندگی اور اس کے نتائج کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ پہلی صورت میں ہمارا قدم ایک سمت اٹھنے کا اور دوسری صورت میں اس کی سمت بالکل مختلف ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ زندگی بعد موت کا سوال محض ایک عقل اور فلسفیانہ سوال نہیں ہے، بلکہ عملی زندگی کا سوال ہے، اور جب بات یہ ہے تو ہمارے لئے اس لحاظ میں شک اور تردد کے مقام پر ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں۔ شک کے ساتھ جو رویہ ہم زندگی میں اختیار کریں گے، وہ بھی لا محالہ انکار کی کے رویے جیسا ہوگا۔ لہذا بہر حال ہم اس امر کا تعین کرنے پر مجبور ہیں کہ آیا موت کے بعد کوئی اور زندگی ہے یا نہیں، اگر سائنس اس کے تعین میں ہماری مدد نہیں کرتا، تو ہمیں عقلی استدلال سے مدد لینی چاہیئے۔

اچھا عقلی استدلال کے لئے ہمارے پاس کیا مواد ہے ؟
ہمارے سامنے ایک تو خود انسان ہے، اور دوسرے یہ نظام کائنات ہم انسان کو اس نظام کائنات کے اندر رکھ کر دکھائیں گے کہ جو کچھ انسان میں ہے، آیا اس کے سارے مقتضیات اس نظام میں پورے ہو جاتے ہیں، یا کوئی چیز بچی رہ جاتی ہے، جس کے لئے کسی دوسری نوعیت کے نظام کی ضرورت ہو۔

دیکھئے، انسان ایک تو جسم رکھتا ہے، جو بہت سے معدنیات، نمکیات، پانی اور گیسوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے جواب کائنات کے

اندر بھی مٹی، پتھر، دعائیں، نمک، گیسیں، دریا اور اسی کی جنس کی دوسری چیزیں موجود ہیں۔ ان چیزوں کو کام کرنے کے لئے قوانین کی ضرورت ہے، وہ سب کائنات کے اندر کار فرما ہیں، اور جس طرح برت وہ باہر کی فضا میں پہاڑوں، دریاؤں اور ہواؤں کو اپنے حصے کا کام ادا کرنے کا موقع دے رہے ہیں، اسی طرح انسانی جسم کو بھی ان قوانین کے تحت کام کرنے کا موقع حاصل ہے۔

پھر انسان ایک ایسا وجود ہے، جو گرد و پیش کی چیزوں سے فضا کے بڑھتا اور نشوونما حاصل کرتا ہے۔ اسی جنس کے درخت، پودے، اور گھاس پھوس کائنات میں بھی موجود ہیں، اور وہ قوانین بھی یہاں پائے جاتے ہیں، جو نشوونما پانے والے اجسام کے لئے کار ہیں۔

پھر انسان ایک زندہ وجود ہے، جو اپنے ارادے سے حرکت کرتا ہے، اپنی فضا خود اپنی کوشش سے فراہم کرتا ہے، اپنے نفس کی آپ حفاظت کرتا ہے، اور اپنی نوع کو باقی رکھنے کا انتظام کرتا ہے۔ کائنات میں اس جنس کی بھی دوسری بہت سی قسمیں موجود ہیں۔ خشکی، تری اور ہوا میں بے شمار حیوانات پائے جاتے ہیں اور وہ قوانین بھی تمام و کمال یہاں کار فرما ہیں، جو ان زندگیوں کے پورے دائرہ عمل پر حاوی ہونے کے لئے کافی ہیں۔

ان سب سے اوپر انسان ایک اور نوعیت کا وجود بھی رکھتا ہے، جس کو ہم اخلاقی وجود کہتے ہیں، اس کے اندر نیکی اور بدی کرنے کا شعور ہے، نیکی اور بدی کا شعور ہے، نیکی اور بدی کی قوت ہے، اور اس کی فطرت یہ مطالبہ کرتی ہے کہ نیکی کا اچھا اور بُرا نتیجہ ظاہر ہو اور وہ ظلم اور انصاف، سچائی اور جھوٹ، سچائی اور ناحق،

رحم اور سبے رحمی، احسان اور احسان فراموشی، فیاضی اور بخل، امانت اور خیانت اور ایسی ہی مختلف اخلاقی صفات کے درمیان فرقہ کرتا ہے۔ یہ صفات عملاً اس کی زندگی میں پائی جاتی ہیں، اور یہ نفس غیبی پر عزتیں نہیں ہیں، بلکہ بالفعل ان کے اثرات انسانی تمدن پر مرتب ہوتے ہیں۔ لہذا انسان جس فطرت پر پیدا ہوا ہے، اسکا شدت کے ساتھ یہ تقاضا ہے کہ جس طرح اس کے افعال کے طبعی نتائج رونما ہوتے ہیں، اسی طرح اخلاقی نتائج بھی رونما ہوں۔

مگر نظام کائنات پر گہری نگاہ ڈال کر دیکھئے، کیا اس نظام میں انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح رونما ہو سکتے ہیں؟ یہ آپ کو یقین دلانا ہوں کہ یہاں اس کا امکان نہیں ہے، اس لیے کہ یہاں کم از کم ہمارے علم کی حد تک کوئی دوسری ایسی مخلوق نہیں پائی جاتی جو اخلاقی وجود رکھتی ہو۔ سارا نظام کائنات طبعی قوانین کے ماتحت چل رہا ہے۔ اخلاقی قوانین کسی طرف کارفرما نظر نہیں آتے، یہاں روپے میں وزن اور قیمت ہے مگر سہائی میں نہ وزن ہے نہ قیمت۔ یہاں اکم کی گشلی سے ہمیشہ آم پیدا ہوتا ہے مگر حق پرستی کا بیج بونے والے پر کبھی پھولوں کی بارش ہوتی ہے، اور کبھی بلکہ اکثر جوتیوں کی۔ یہاں مادی عناصر کے لیے مقرر قوانین ہیں جن کے مطابق ہمیشہ مقرر نتائج نکلتے ہیں۔ مگر اخلاقی عناصر کے لیے کوئی مقرر قانون نہیں ہے کہ ان کی فعلیت سے ہمیشہ مقرر نتیجہ نکل سکے۔ طبعی قوانین کی فرماں روائی کے سبب سے اخلاقی نتائج کبھی تو نکل ہی نہیں سکتے، کبھی نکلتے ہیں تو صرف اس حد تک جس کی اجازت طبعی قوانین دے دیں، اور بار بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ اخلاقی ایک فعل سے ایک خاص نتیجہ نکلتے کا تقاضا کرتا ہے، مگر طبعی قوانین کی

مداخلت سے تجربہ بالکل برعکس نکل آتا ہے۔ انسان نے خود اپنے قتل و سیاسی نظام کے ذریعے سے تھوڑی سی کوشش اس امر کی ہے کہ انسانی اعمال کے اخلاقی نتائج ایک مقررہ ضابطے کے مطابق برآمد ہو سکیں۔ مگر یہ کوشش بہت ہی محدود پیمانے پر ہے اور بخند ناقص ہے۔ ایک طرف طبعی قوانین اس کو محدود اور ناقص بناتے ہیں، اور دوسری طرف انسان کی اپنی بہت سی کمزوریوں اس نظام کے تقاضوں میں اور زیادہ اضافہ کرتی ہیں۔

میں اپنے مدعا کی توضیح چند مثالوں سے کروں گا۔ دیکھئے، ایک شخص اگر کسی دوسرے شخص کا دشمن ہو، اور اس کے گھر میں آگ لگا دے تو اس کا گھر جل جائے گا۔ یہ اس کے افعال کا طبعی نتیجہ ہے، اس کا اخلاقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ اس شخص کو اتنی ہی سزا ملے جتنا اُس نے ایک عائدان کو نقصان پہنچایا ہے، مگر اس نتیجے کا ظاہر ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ آگ لگنے والے کا سراغ ملے، وہ پولیس کے ہاتھ آ سکے، اس پر مجرم ثابت ہو، عدالت پوری طرح امداد کر سکے کہ آگ لگنے سے اس عائدان کو اور اُسکی آئندہ نسلوں کو ٹھیک ٹھیک کتنا نقصان پہنچا ہے، اور پھر انصاف کے ساتھ اس مجرم کو اتنی ہی سزا دے۔ اگر ان شرطوں میں سے کوئی شرط بھی پوری نہ ہو، تو اخلاقی نتیجہ یا تو بالکل ہی ظاہر نہ ہوگا یا اس کا صرف ایک تھوڑا سا جستہ ظاہر ہو کر رہ جائے گا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے حریت کو برباد کر کے وہ شخص دُنیا میں مزے سے پھونٹتا پھلتا رہے۔

اس سے بڑے پیمانے پر ایک اور مثال لیجئے۔ چند اشتہار میں اپنی قوم میں اثر پیدا کیے جاتے ہیں، اور ساری قوم ان کے پرہٹے

ملتی ہے۔ اس پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر وہ لوگوں میں قوم پرستی کا اشتعال اور ملک گیر کامیابی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں، گھوٹیلوں کی قوموں سے جنگ چھیڑ دیتے ہیں، لکھو کھاؤ میوں کو ہلاک کرتے ہیں، ملک کے ملک تباہ کر ڈالتے ہیں، کھٹوں انسانوں کو ذلیل اور پست زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتے ہیں، اور انسانی تاریخ پر افسوس کھے کاروائیوں کا ایسا زبردست اثر پڑتا ہے جس کا سلسلہ آئندہ سچکڑوں برس تک پشت در پشت اور نسل در نسل پھیلتا جائے گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ چند اشخاص، جن میں جرم عظیم کے مرتکب ہوئے ہیں، اس کی مناسب اور منصفانہ سزا ان کو کبھی اس دنیوی زندگی میں مل سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر ان کی بوٹیاں بھی نوبہ ڈالی جائیں، اگر ان کو زندہ جلا ڈالا جائے یا کوئی اور ایسی سزا دی جائے جو انسان کے بس میں ہے، تب بھی کسی طرح وہ اس نقصان کے برابر سزا نہیں پاسکتے جو انہوں نے کر ڈیا۔ انسانوں کو اور ان کی آئندہ بے شمار نسلوں کو یہ پتہ چاہیے۔ موجودہ نظام کائنات میں طبیعی قوانین پر عمل رہا ہے، ان کے تحت کسی طرح یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے جرم کے برابر سزا پاسکیں۔

اسی طرح ان نیک انسانوں کو بھی جنہوں نے نوبہ انسانی کو حق اور راستی کی تعلیم دی، اور ہدایت کی روشنی دکھائی، جن کے فیض سے بے شمار انسانی نسلیں صدیوں سے فائدہ اٹھاتی ہیں، اور نہ معلوم آئندہ کتنی صدیوں تک انسانی نسل جانیگی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کی خدمات کا پورا صلہ ان کو اس دنیا میں مل سکے؟ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ موجودہ طبیعی قوانین کی حدود کے اندر ایک شخص اپنے کام کی پوری جملہ حاصل کر سکتا ہے، جس کا مدخل اس کے

مرنے کے بعد ہزاروں برس تک اور بے شمار انسانوں تک پھیل گیا ہو۔

جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں، اول تو موجودہ نظام کائنات جن قوانین پر چل رہا ہے ان کے اندر اتنی گنجائش ہی نہیں ہے کہ انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مرتب ہو سکیں، دوسرے یہاں چند سال کی زندگی میں انسان جو عمل کرتا ہے، اسکے نتائج کا سلسلہ اتنا وسیع ہوتا ہے، اور اتنی مدت تک جاری رہتا ہے کہ صرف اسی کے پورے نتائج وصول کرنے کے لئے ہزاروں بلکہ لاکھوں برس کی زندگی درکار ہے، اور موجودہ قوانین قدرت کے ماتحت انسان کو اتنی زندگی ملنی ناممکن ہے۔ اس سے معلوم ہوتا کہ انسانی، حتیٰ کے غامی، عضوی اور حیوانی عناصر کے لئے تو موجودہ طبعی دنیا (Physical World) اور اس کے طبعی قوانین کافی ہیں، مگر اس کے اخلاقی عنصر کے لئے یہ دنیا بالکل ناکافی ہے۔ اس کے لئے ایک دوسرا نظام عالم درکار ہے جس میں حکمراں قانون (Governing Law) اخلاق کا قانون ہو، اور طبعی قوانین اس کے ماتحت عمل مددگار کی حیثیت سے کام کریں، جیسی زندگی محدود نہ ہو، بلکہ غیر محدود ہو، جس میں وہ تمام اخلاقی نتائج جو یہاں مرتب ہونے سے روکے گئے ہیں، یا اُسے مرتب ہوئے ہیں، اپنی صحیح صورت میں پوری طرح مرتب ہو سکیں، جہاں سونے اور چاندی کے بھانے لگی اور صداقت میں فرق اور قیمت ہو۔ جہاں آگ صرف اُس چیز کو جلائے جو اخلاقی بننے کی مستحق ہو، جہاں عیش اس کو بٹے جو نیک ہو، اور مصیبت اس کے حصے میں آئے جو بد ہو۔ عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے کہ ایسا نظام عالم ضرور

ہونا چاہیئے۔

جہاں تک عقل استدلال کا تعلق ہے وہ ہم کو صرف ”ہونا چاہیئے“ کی حد تک لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ اس بڑا سوال یہ کہ آیا واقعی کوئی ایسا عالم ہے جی، تو ہماری عقل اور ہمارا علم، دونوں اس کا حکم نکلانے سے عاجز ہیں۔ یہاں قرآن ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل اور تمہاری فطرت جس چیز کا مطالبہ کرتی ہے اُسے الواقع وہ جوئے دہی ہے، موجودہ نظام عالم جو طبی قوانین پر مبنی ہے، ایک وقت میں توڑ ڈالا جائے گا، اس کے بعد ایک دوسرا نظام بنے گا، جس میں زمین و آسمان اور ساری چیزیں ایک دوسرے ڈھنگ پر ہوں گی، پھر اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے تھے، دوبارہ پیدا کر دے گا، اور ایک وقت ان سب کو اپنے سامنے جمع کر دے گا، وہاں ایک ایک شخص کا، ایک ایک قوم کا اور پوری انسانیت کا ریکارڈ، ہر غلطی اور ہر فروگزاشت کے بغیر محفوظ ہوگا۔ ہر شخص کے ایک ایک عمل کا جتنا رزق عمل دُنیا میں ہوا ہے، اس کی پوری روداد موجود ہوگی۔ وہ تمام نسلیں گواہوں کے کھڑے ہیں حاضر ہوں گی جو اس رزق عمل سے متاثر ہوئیں۔ ایک ایک فرد جس پر انسان کے اقوال و افعال کے نقوش ثبت ہوئے اپنی داستان سنانے گا۔ خود انسان کے ہاتھ اور پاؤں اور آنکھ اور زبان اور تمام اعضاء شہادت دیں گے کہ ان سے اس نے کس طرح کام لیا، پھر اس روداد پر وہ سب سے بڑا حاکم چورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا کہ کون کتنے انعام کا مستحق ہے، اور کون کتنی سزا کا۔ یہ انعام اور یہ سزا دونوں چیزیں یہی استخراۃ پیمانے پر ہوں گی جس کا کوئی اندازہ موجودہ نظام عالم

کی محدود مقداروں کے لحاظ سے نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں وقت اور جگہ کے معیار کچھ اور ہوں گے۔ وہاں کی مقداریں کچھ اور ہوں گی۔ وہاں کے قوانین قدرت کسی اور قسم کے ہوں گے۔ انسان کی جینیکوٹا کے اثرات دنیا میں ہزاروں برس پہلے سے ہیں، وہاں وہ اُنھیں کا ہمز نور جملہ وصول کر سکے گا، بغیر اس کے کہ موت اور بیماری اور بڑھاپا اس کے پیش کا سلسلہ توڑ سکیں، اور اسی انسان کی جن برائیوں کے اثرات دنیا میں ہزار ہا برس تک اور بے شمار سالوں تک پھیلتے رہے ہیں، وہ ان کی پوری سزا اُٹھائے گا، بغیر اس کے کہ موت اور بے ہوشی اگر اسے تکلیف سے بچا سکے۔

ایسی ایک زندگی اور ایسے ایک عالم کو جو لوگ ناممکن سمجھتے ہیں مجھے ان کے ذہن کی تنگی پر حیرت آتا ہے، اگر ہمارے موجودہ نظام عالم کا موجودہ قوانین قدرت کے ساتھ موجود ہونا ناممکن ہے، تو اگر ایک نئے نظام عالم کا دوسرے قوانین کے ساتھ وجود میں آنا کیوں ناممکن ہوگا البتہ یہ بات کہ واقع میں ایسا ضرور ہوگا تو اس کا تعلق نہ دلیل سے ہو سکتا ہے اور نہ علمی ثبوت سے، اس کے لئے ایمان بالغیب کی ضرورت ہے۔